مضامینِ رشید

رشید احمد صدیقی

مضامینِ رشید

مضامینِ رشید

رشید احمد صدّیقی

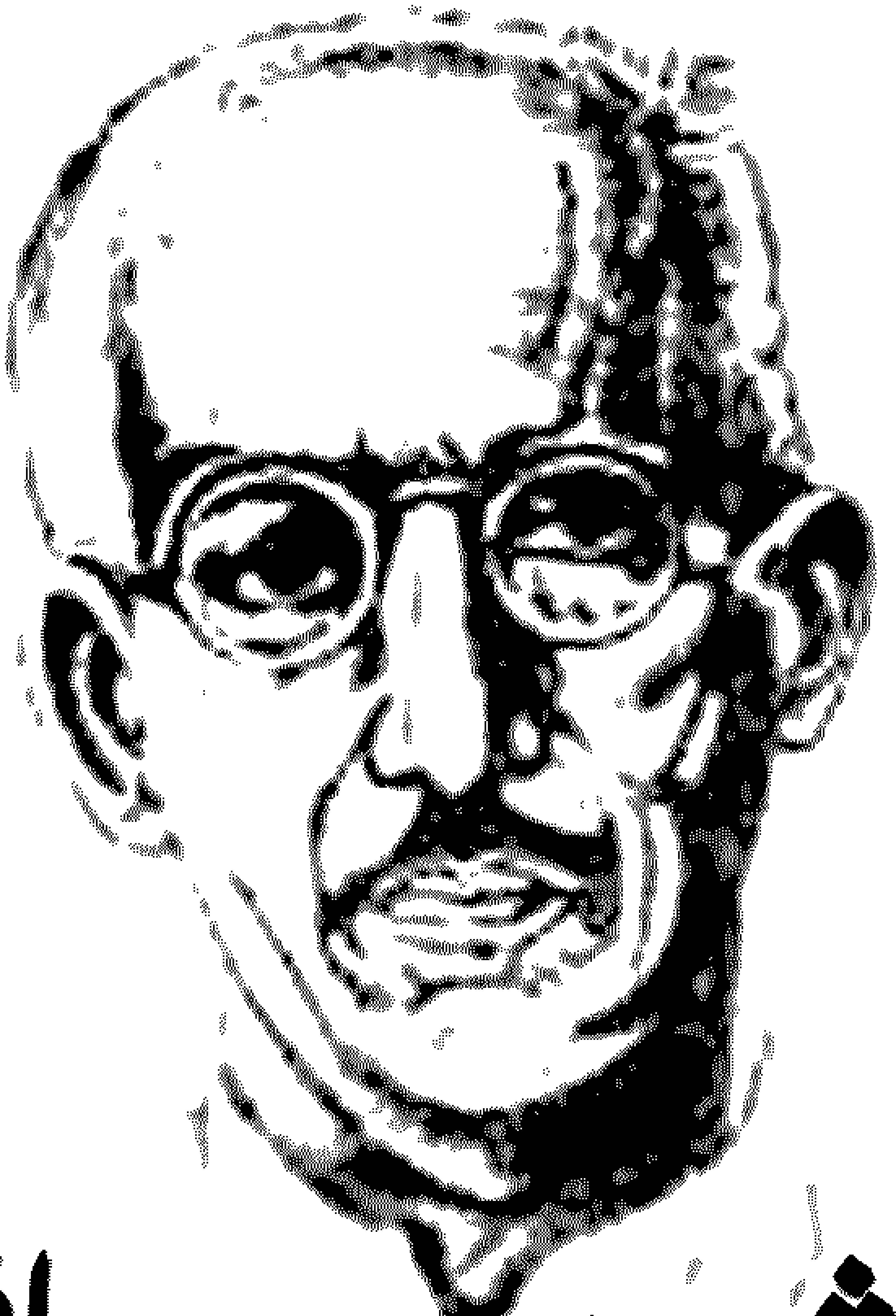
انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعاتِ انجمن ترقی اردو (ہند) ۵۱۳

سنہ اشاعت: ۱۹۸۶ء
قیمت: ۳۲ روپے
بہ اہتمام: شمیم جہاں
طباعت: سمر آفسٹ پریس، دہلی

مضامینِ رشید

(مضامینِ طنز و مزاح)



رشید احمد صدیقی

فہرستِ مضامین

کچھ اپنے کچھ ان مضامین کے بارے میں

ان مضامین کو لکھے چھپے ۲۵ - ۳۰ سال ہوئے ہوں گے، اگر زیادہ نہیں۔ مختلف رسالوں کے لیے مخصوص حالات میں کبھی اپنی مرضی سے کبھی دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر لکھے۔ جو بات جس طرح ذہن میں آئی لکھ ڈالی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن کیا کرتا۔ عقل سے شرمساری کے وہ دن ایسے ہی تھے۔ اب تو بہت سے وہ مواقع اور واقعات بھی اچھی طرح یاد نہیں رہے جن کی طرف ان مضامین میں اشارے ملتے ہیں۔ گو اس زمانے میں ان کا بڑا چرچا تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ میرے اس "صحیفۂ اعمال" میں درج کیسے ہو جاتے۔ مکتبہ جامعہ دہلی نے جوں کا توں ان کا مجموعہ بھی "مضامین رشید" کے نام سے شائع کر دیا۔

اس سے بے خبر نہیں تھا کہ یہ کام جس روا روی یا غفلت میں انجام پایا ہے اس سے اس میں طرح طرح کی خامیاں راہ پا گئی ہوں گی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کیا وہی جو سہل انگار، بزرخود غلط یا ناعاقبت اندیش ہمیشہ سے کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ یعنی نفس کو دھوکے دیتا رہا کہ ایسی بھی کیا جلدی ہے، فرصت سے ان کی طرف توجہ کروں گا۔ یہ بھی ممکن ہے لوگ ان فروگزاشتوں پر درگزر سے کام لیں یا ان کے پاس اس سے بہتر کام کرنے کو ہوں یا اتنا بڑا

بن جاؤں کہ میری خامیاں بھی خوبیوں میں شمار ہونے لگیں۔ گو اس اندیشے سے بھی خالی نہ تھا کہ اگر اتنا ہی چھوٹا اور معمولی رہا جتنا کہ دراصل ہوں تو خوبیاں بھی خامیوں میں گنی جانے لگیں گی۔ دوسرے کو دھوکا دینے کی قابلیت یا ہمت نہ ہو تو اپنے ہی کو دے لینے سے نفس کو تشفی ہو جاتی ہے۔

ان اجزا کو انجمن ترقی اردو (ہند) نے اپنے اہتمام میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو حسبِ عادت اس کو بھی آج کل پر ٹالتا رہا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ انجمن اس ارادے سے باز آجائے تو میں نظرِ ثانی کرنے کی زحمت سے بچ جاؤں۔ لیکن اربابِ انجمن کا مسلسل و مخلصانہ اصرار موجبِ آزار ہونے کے بجائے باعثِ غیرت اور وجہِ افتخار دونوں محسوس ہونے لگا تو آمادہ ہو گیا۔ لکھنے کے بعد ان کو آج تک پڑھا نہیں تھا نہ چھپنے کے دوران میں نہ اس کے بعد اب جو دیکھتا ہوں تو بڑا کام رفو کا نکلا، جس پر شرمندگی ہوئی اس سے زیادہ پچھتاوا، تھوڑی سی ہنسی بھی آئی۔

جہاں تک ہو سکا زیادہ سے زیادہ کاٹ چھانٹ سے کام لیا۔ بعض مضامین حذف کر کے ان کے بجائے دوسرے رکھ دیے۔ بڑے نامساعد حالات میں یہ تکلیف دہ کام انجام دینا پڑا۔ پھر بھی جانتا ہوں کہ جو فرو گزاشت ہو چکی تھی، اس کا مداوا نہ ہو سکا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ آدمی فرشتوں ہی کے لکھے پر نہیں پکڑا جاتا اپنے لکھے پر اور زیادہ پکڑا جاتا ہے۔ فرشتوں کی تحریر پر تو ممکن ہے آخرت میں بخشائش کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اپنی تحریر پر دنیا میں کوئی نہیں بخشا جاتا۔ اور کیا معلوم فرشتوں کا نام کس مصلحت سے لیا جاتا ہے ورنہ دراصل ہمارا نامۂ اعمال ہمارے سوا کوئی دوسرا لکھ ہی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ صرف فرشتہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ وہ دستاویز پہلے ہی سے تصنیف شدہ موجود ہو جس کو بقولِ غالب ہم اپنے نامۂ اعمال میں 'نقل مطابقِ اصل' کرتے رہتے ہوں۔ اگر یہ ہے تو میں نے اپنے اس نامۂ اعمال میں جی کھول کر تحریف کی ہے۔

بعض احباب نے اس طرح کی ترمیم و تنسیخ سے اختلاف کیا ان کے دلائل جتنے قوی تھے اتنے قوی وہ خود نہ تھے اس لیے دونوں میں سے کسی کو خاطر میں نہ لایا۔ میری طبیعت کی افتاد کچھ اس طرح کی ہے کہ چھپنے کے بعد اپنے مضامین کی وقعت اپنی ہی نظروں سے بالکل نہیں

گرجاتی تو بہت کم ہو جاتی ہے۔ زیرِ نظر مضامین جب لکھے گئے تھے اس وقت میں کچھ اور تھا۔ ساتھی اور تھے، باتیں اور تھیں۔ گردشِ لیل و نہار یا تقدیرِ الٰہی کچھ اور تھی، اب اور ہے۔ بدلے ہوئے حالات کا مناسب حد تک لحاظ رکھنا ضروری تھا۔ لکھنے والا کوئی ہو اس کو اپنا ہی نہیں، اپنے ناظرین اور اپنے معاشرے کا بھی جلد یا بدیر جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ مسخرے کو معلّم بنا نا ستم ظریفی ہے لیکن معلّم کا مسخرہ بھی رہ جانا بدتوفیقی ہے۔

کچھ عزیزوں نے اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ ان مضامین کی روشنی میں زندگی۔ زمانہ۔ ادب۔ آرٹ۔ عورت وغیرہ کے بارے میں بھی کچھ عرض کروں۔ ان موضوعات پر کسی کے کہے بغیر کبھی کبھی اپنے جانے بغیر بھی تمام عمر کچھ نہ کچھ کہتا سنتا رہا ہوں اور شاید کوئی لکھنے والا ایسا نہ ہو جو ان سے باہر ہو کر لکھتا ہو تو پھر کیا ضرور کہ آج خاص طور پر ایسا کیا جائے۔ یہاں ان کا ذکر "در حدیثِ دیگراں" ہی تک رہے تو بہتر ہے ضمناً اس امر کا بھی اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ میرے کرم فرما جتنا مجھے یا میری تحریر کو پسند فرماتے ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ میں اپنے کو پسند کرتا ہوں نہ اپنے ان مضامین کو۔

دوسری بات "باقرارِ صالح" یہ عرض کروں گا کہ سطورِ بالا میں کوئی بات بہ طورِ انکسار نہیں، سب از روئے اعتراف کہی گئی ہے۔

آخر میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مکتبہ جامعہ دہلی سے محولہ بالا "مضامینِ رشید" کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے، اس کے تمام مضامین کا حقِ اشاعت بدستور بحقِ مصنّف اب بھی محفوظ ہے خواہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا وہ حذف کر دیے گئے ہوں یا ان میں ترمیم و تنسیخ کی گئی ہو جس کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) کا یہ ایڈیشن ہدیۂ ناظرین ہو رہا ہے۔ انجمن کے اس ایڈیشن کا حقِ اشاعت بھی بحقِ مصنّف محفوظ ہے۔

رشید احمد صدیقی

نوٹ:- چند نامُوں۔ مضمون اور لُر نکال دیے۔ ان کے بجائے "دھوبی" اور "سرگذشتِ عہدِ گل" شامل کر دیے۔

"سرگزشتِ عہدِ گل"

یونین کے پریسیڈنٹ صاحب نے دعوت دی ہے کہ اس مذاکرے میں شریک ہوں جس میں علی گڑھ کے گنہ گار علی گڑھ کے بارے میں اپنے اپنے اعترافات پیش کریں گے موصوف نے مجھے اصالتاً حاضر ہونے سے معاف کر دیا ہے اور اجازت دی ہے کہ بیانِ تحریری داخل کروں۔ سنتا ہوں عدالت کسی شخص کو ایسا بیان دینے پر مجبور نہیں کر سکتی جس سے اس شخص کے مجرم قرار دیے جانے کا امکان پیدا ہوتا ہو۔ یہ بات ذرا دیر میں معلوم ہوئی اب سے بہت پہلے علی گڑھ اور اپنے بارے میں ایسے بیانات دیتا رہا ہوں جن سے ایک سے زیادہ جرائم میں ماخوذ ہو سکتا ہوں۔ مگر کیا کروں جناب صدر کے اصرار پر۔

"دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے بغیر"

لیکن تنقید نگار برہم ہیں کہ میرے "ذکر و فکر" میں علی گڑھ اس درجہ کیوں دخیل ہے۔ یہ شکایت ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ایک عرصے سے لاحق ہے۔ "آشفتہ بیانی" کے شائع ہو جانے کے بعد خیال تھا کہ زائل نہیں تو بہت کم ہو جائے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ سرگرانی اور بڑھ گئی۔

لکھنے پڑھنے کا کام کرتے مدت ہو گئی۔ مخالف اور موافق دونوں طرح کی تنقیدوں سے واسطہ ہوا کسی نے تعریف کی تو جی یقیناً خوش ہوا کسی نے تنقیص کی تو دل برداشتہ نہیں ہوا یہ تعلّی نہیں اقرارِ صالح ہے اس لیے کہ میری جن باتوں کو قابلِ گرفت قرار دیا گیا وہی تو میرا سرمایۂ افتخار وانبساط ہے۔ ان سے اپنے کو کسی حال میں باز نہیں رکھ سکتا۔ مثلاً یہی میری تحریروں میں علی گڑھ کا عمل دخل۔ میں ان کا سہارا لیے یا ان کا اشارہ پائے بغیر نہ اپنی شخصیت کا اظہار کر سکتا ہوں نہ اسلوب یا فن کا۔ آپ ہی بتائیں جو شخص اظہار وابلاغ کے وسائل سے محروم کر دیا جائے وہ کس کام کا رہ جائے گا تا وقتیکہ وہ شخص فن کار نہیں کسی کا آلۂ کار ہو۔ تو حضرت دمڑی کی ہنڈیا اپنی خیر منائے میں تو اپنی ذات پہچنوائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تصنیف وتالیف کا شوق ہو تو اعتراض سننے اور سہنے کا خوگر ہونا چاہیے۔ مصنف اور پبلک دونوں ایک دوسرے کے امانت دار ہوتے ہیں اس لیے دونوں کو دوسرے پر احتساب کا بھی اختیار حاصل ہے اور ایک دوسرے کا احترام بھی لازم آتا ہے۔ اگر مصنف اس احتساب کی تاب نہیں لا سکتا تو اسے غالبؔ کے مشہور فارمولے پر عمل کرنا چاہیے یعنی

"جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں"

میں تنقید نگار کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لیے کہ اسے شعروادب کا ضمیر سمجھتا ہوں وہ ہماری عزت افزائی یا چشم نمائی نہ کرے تو ہم شعروادب کی ذمہ داری کو نہ سمجھ سکیں نہ اس سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ لیکن اگر تنقید نگار اپنے آپ کو شعروادب کا ضمیر سمجھنے کے بجائے کچھ اور سمجھے تو وہ یقیناً ہمارے احترام وحمایت کا سزاوار نہیں ہے۔ البتہ اپنے جن تنقید نگاروں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ وہ مجھ سے برہم ہیں یا علی گڑھ سے آزردہ۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ دونوں سے بیزار ہیں۔ اس لیے کہ اگر وہ ہم میں سے کسی ایک سے خوش ہوتے تو دوسرے کا گناہ ضرور بخش دیتے جیسا کہ کہا جاتا ہے "بداں را بہ نیکاں ببخشد کریم"

اچھا اس قصہ کو چھوڑیے، آپ کو ایک حادثہ سناؤں جواب اتنا حادثہ نہیں رہا جتنا

قصہ۔ ایم۔ اے۔ او کالج نان کو آپریشن تحریک کی زد میں آیا۔ موافق اور مخالف طاقتیں صف آرا ہو گئیں۔ طالب علموں کو راہِ راست پر رکھنے یا لانے کے لیے "والدین" کثرت سے آئے بھی اور لائے بھی گئے۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے طلبا سے زیادہ والدین آگئے۔ لیکن واقعہ صرف اتنا تھا کہ اس زمانے میں ایسے طلبا بھی ہوتے تھے جن پر والدین کا دھوکا ہوتا تھا جہاں دونوں گڈمڈ ہوئے وہاں ظاہر ہے والدین یا والدین نما زیادہ نمایاں ہوتے۔ کمروں میں، میدانوں میں، مسجد کے آس پاس، یونین کے نزدیک، سڑکوں پر درختوں تلے جہاں دیکھیے مختلف ٹولیاں بحث میں مصروف ہیں۔ کہیں:

"ملک الموت کو ضد ہے کہ میں دم لے کے ٹلوں"

تو کہیں "سربسجدہ ہے مسیحا کہ مری بات رہے"

اسٹریچی ہال کی پشت پر ٹینس کے کچے کورٹ تھے۔ کھیل ہو رہا تھا کہ ایک طرف سے نان کو آپریشن کی تبلیغ کرنے والے کچھ طالب علم لیڈر آگئے۔ کھیل بند کر دیا گیا۔ سب یک جا ہو گئے۔ کھیلنے والوں میں اسٹاف کے ایک ممبر تھے جو اپنے زمانے میں بڑے ممتاز طالب علم تھے اور کھلاڑی بھی اور نان کو آپریشن کے سخت مخالف۔ دوسری طرف تحریک کی حمایت کرنے والوں میں اس زمانے کے سب سے مشہور طالب علم تھے۔ نام کسی کا نہیں لیتا۔ فرض کر لیجیے ایک کا نام زید دوسرے کا عمر تھا۔ بحث رفتہ رفتہ تیز ہونے لگی نوبت یہاں تک پہنچی کہ زید نے کہا برطانیہ کی فوجیں کعبہ شریف اور ایم اے او کالج پر گولے برسانے لگیں تو آپ کس کی حفاظت کریں گے۔ عمر نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا، کالج کی! سب سناٹے میں آگئے اور مجمع منتشر ہو گیا۔

یہ قصہ اس لیے نہیں سنا رہا ہوں کہ مباحثے کی جہاں تان ٹوٹی ہے میں یا آپ اس پر غور کریں۔ بتانا یہ ہے کہ علی گڑھ سے مجھے جو الفت ہے، اور میرے دل میں اس کا جو احترام ہے اس میں میرے شریک اور بھی ہیں۔ ایم اے او کالج کے عہد میں جہاں اس طرح کے طلبا تھے اس رنگ کے بھی تھے مجھے تو یقین ہے آج بھی اس نمونے کے طلبا زیادہ نہیں تو چند ضرور موجود ہوں گے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ سمجھ دار اور کم

بلند بانگ ہوں۔

تو صاحبو! اگر میں ایم اے او کالج کا "جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار" ہوں تو اس میں کسی "محمل نشیں" کے شاد یا ناشاد ہونے کی کیا بات ہے، "غبارِ قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے"۔ ہر شخص اپنا محبوب اور اپنا عقیدہ منتخب کرنے میں آزاد ہے۔ میرے عہد میں تو اس کی آزادی تھی، ممکن ہے آپ کے عہد میں نہ ہو اور آپ اس پر مجبور ہوں کہ دوسرے آپ کے لیے محبوب اور معتقدات متعین اور منتخب کریں۔

ان باتوں سے قطع نظر یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ میرا علی گڑھ سر سید کے عہد سے بہت قریب تھا۔ آپ کا بہت دور ہے۔ آج ۱۹۵۹ء میں آپ جتنے امریکہ یا روس سے قریب ہیں، میں سر سید اور ان کے رفقا سے قریب تھا۔ اس لیے ہم یا میرے ساتھی جس طرح سر سید، ان کے مشن اور ان کے تابعین اور تبع تابعین کے زیر اثر ہو سکتے تھے، آپ روس یا امریکہ، ان کے مشن یا ان کے تابعین اور تبع تابعین کے زیر اثر ہو سکتے ہیں، ما بخیر شما سلامت:

انیسویں صدی کے وسط میں مسلمانوں پر جو مصیبت نازل ہوئی اس سے ان کو بچا لے جانے کا شرف سر سید کے حصے میں آیا جن سے زیادہ جامع حیثیات سے مسلمان اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ ہر تباہی اپنی تلافی بھی ساتھ لاتی ہے۔ اتنی بڑی تباہی اتنا ہی بڑا شخص پیدا کر سکتی تھی۔ اس عہد میں مسلمانوں کو نئی زندگی، نیا شعور اور نیا حوصلہ دینے میں علی گڑھ تحریک اور اس سے برآمد ہونے والے سب سے مبارک مستحکم اور معتبر ادارے علی گڑھ کالج (مسلم یونیورسٹی) نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ محتاجِ بیان اس لیے نہیں کہ آپ میں شاید ہی ایسا کوئی ہوگا جو ان سے کم و بیش واقف نہ ہو۔ سر سید نے مدرستہ العلوم کے وسیلے سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ ہندوستان میں عزت اور فراغت کی زندگی بسر کریں۔ یہی نہیں بلکہ اسلام اور مسلمان دونوں ہندوستان میں غیر مسلموں کے لیے نیز دنیا کے دوسرے خطوں کے لیے اور خود مسلمانوں کے لیے قابلِ قدر نمونہ بنیں۔

سر سید کے معتمد رفقا بعض امور میں ان کے ہمنوا نہیں تھے۔ سر سید نے کہیں اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اس پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہیے۔ موجودہ عہد کے

تقاضوں کی روشنی میں سرسید کے افکار و آراء کو ضرور پرکھنا چاہیے۔ اور سرسید کا کیا ذکر آپ تو جانتے ہیں اسلام سے پہلے کے ادیان اور ان کے صحائف مقدسہ میں خود ان کے مصنف اعظم (خدا) نے حالاتِ زمانہ کے اعتبار سے پیچھے بعد دیگرے ترمیم و تنسیخ کی ہے۔ جن حالات و حادثات کی زد میں سرسید نے جو تدابیر اختیار کیں ان میں کچھ ایسی بھی ہیں جن کو فرسٹ ایڈ سے تعبیر کرنا زیادہ صحیح ہو گا۔ اگر ہم اس وقت کی مرہم پٹی کو مستقل علاج سمجھ لیں تو یہ عقل سلیم اور سرسید دونوں کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ سرسید کی سیاسی تعلیمی معاشرتی اور مذہبی اصلاحات کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ انگریز اور انگریزی حکومت سے تعاون، مغربی تحریکات کی طرف توجہ، اردو یونیورسٹی کے قیام کے بجائے انگریزی پڑھنے اور ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم گاہ قائم کرنے پر زور دینا، مذہب کو روزی کمانے جہالت پھیلانے اور فتنہ اٹھانے کا وسیلہ بنانے کے بجائے فہم و بصیرت، حوصلہ مندی اور انسانیت دوستی کا محرک اور ترجمان بنانے پر زور دینا، کانگریس کی پالیسی سے مسلمانوں کو دور رکھنے کی کوشش اور اس طرح کی دوسری باتیں اس عہد کے حالات کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے مناسب اور مفید سمجھی گئیں۔ ۷۰۔۸۰ سال بعد ہم ان پر ریویو کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں۔ البتہ اس کے مجاز نہیں کہ ان باتوں پر سرسید کو رجعت پسند، ہندوستانی قومیت کا دشمن یا اردو فارسی عربی کا مخالف قرار دیں۔

بذاتِ خود میں ہندوستان کے مسلمانوں کو عقائد اور اعمال کے اعتبار سے دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان سمجھتا ہوں۔ چنانچہ جب کبھی بلادِ اسلامیہ کے مسلمانوں کا نام لے کر مسلمانوں کو ان کی روش پر چلنے کی ترغیب دی جاتی ہے تو اس کو صحیح رہنمائی نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمان باہر کے مسلمانوں کے لیے قابلِ تقلید ہیں نہ کہ باہر کے مسلمان یہاں کے مسلمانوں کے لیے۔ یہاں کے مسلمانوں کو یہ امتیاز علی گڑھ نے بخشا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان کے دوسرے اسلامی اداروں کا اس میں حصہ نہیں یقیناً ہے لیکن علی گڑھ نے مذہبی ادارہ نہ ہوتے ہوئے ایک معیاری تعلیم گاہ (کالج و یونیورسٹی) کی حیثیت سے جس کثرت سے اچھے مسلمان اور اچھے شہری پیدا کرنے کی جیسی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا جواب شاید

ہندوستان کی کسی دوسری تعلیم گاہ میں نہ ملے اور یہ فیضان اس علی گڑھ کا ہے جس میں غیرمسلم پوری آزادی کے ساتھ یونیورسٹی کے ان تمام فوائد سے متمتع ہوتے ہیں جن سے مسلمان ہوتے ہیں. علی گڑھ کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ خیال بھی آیا ہے کہ اچھے مسلمان، مذہبی اداروں کے مقابلے میں ایسے اسلامی اداروں سے زیادہ نکلتے ہیں جہاں دینوی علوم و امور سے بھی طلباء کو آشنا ہونے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔

مجھے اپنے عہد کا علی گڑھ اس لیے خاص طور پر عزیز رہا ہے کہ اس زمانے میں کالج کی نام وری تمام تر طلبہ کی کارگزاریوں کی رہینِ منّت تھی. اچھّے سے اچھّے طالب علم ہونے کے علاوہ بڑے اچھّے مقرر، بڑے اچھّے کھلاڑی، بڑے اچھّے انشا پرداز اور شاعر ہوتے. جرأت، ذوق اور ذہانت کے مواقع تلاش کرتے کہ کوئی اچھّے سے اچھّا بولنے والا باہر سے آئے اور دیکھے کہ ہمارے ساتھی طالب علم اس فن میں کیسی مہارت رکھتے ہیں. کوئی مشہور مقرّر یا لیڈر اس زمانے میں باہر سے آنے والا ہوتا تو ہم اس پر خوش ہوتے کہ آج ہمارے فلاں بولنے والے کا جوہر چمکے گا اور مہمان کو معلوم ہو گا کہ اس کا سابقہ کیسے طالب علموں سے ہے. اس پر فخر نہیں کرتے تھے کہ معزز مہمان کے تشریف لانے اور گہر افشانی فرمانے سے "کلاہِ گوشۂ دہقاں" کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔

چنانچہ میں کچھ اس طرح پر سوچنے لگا ہوں کہ اس ادارے کی ناموری اور نیک نامی کا مدار جتنا یہاں کے طلبہ کی ناموری اور نیک نامی پر ہے کسی اور پر نہیں. اتھارٹیز، اسٹاف، سرمایہ، ساز و سامان، کتب خانے، باغ و راغ، کاخ و کو، خورد و نوش، بود و باش، کھیل کود، تفریح و تفنن سب ہیچ ہیں. اگر ہمارے طلبہ بطور خود اپنے آپ کو بہتر بنانے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں، ایسے طلبا متداول اور مقررّہ علوم و فنون پر عبور رکھنے کے علاوہ اس ادارے کے بنیادی مقاصد اور بہترین روایات کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی. اس لیے کہ انھوں نے ایسا کر دکھایا ہے. اس دانش گاہ کے طلبہ کی ذمّہ داریاں دوسری درس گاہوں کے طلبہ کی ذمّہ داریوں سے کہیں زیادہ مختلف اور مشکل ہیں. اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہاں کے طلبہ باہر کی ہر تحریک اور ہر جماعت کی پیروی آنکھ بند کر کے نہ کیا کریں خواہ وہ تحریک اور جماعت طلبہ

ہی کیوں نہ ہوں۔

علی گڑھ سے میرا شغف ان عزیزوں کو گراں گزرا ہے جنھوں نے خود کبھی علی گڑھ میں تعلیم نہیں پائی۔ مجھے یقین ہے اگر انھوں نے طالب علمی کے دن یہاں گزارے ہوتے تو میرے ہمنوا ہوتے۔ اتنی سی بات تو وہ بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ اپنے زمانۂ طالب علمی کی یاد ہر شخص کو خوشگوار محسوس ہوتی ہے، چاہے وہ زمانہ تکلیف اور تردد ہی کا کیوں نہ رہا ہو۔ پھر مجھ سے کیوں بدگمان ہوں جس نے اپنی طالب علمی کا بہترین زمانہ ایسے ادارے میں بسر کیا ہو جو ہندوستان کے مسلمانوں کے دیرینہ علمی اور تہذیبی ورثے کا امین، ان کے حوصلوں کا مرکز اور امیدوں کا سرچشمہ رہا ہو اور ایسے ساتھیوں میں گزارا ہو جو مذہب، ملک، سوسائٹی اور علوم و فنون کی دی ہوئی طرح طرح کی نعمتوں اور برکتوں سے بہرہ مند تھے۔ ایسی روایات، ایسی فضا، ایسا ساتھ، ایسے مشغلے، ایسے شب و روز ان سب کا آخر کچھ تو اثر ہوتا ہی ہے۔

مجھ سے آپ کی بیزاری بے وجہ بھی نہیں ہے آپ کو وہ عہد ملا جس میں عالم گیر اختلال و انتشار راہ پا چکا ہے جہاں قدیم اقدار و معتقدات کی شکست و ریخت کا تو امکان ہے، نئے اقدار و معتقدات کا بروئے کار آنا آسان نہیں۔

نئے اور پرانے میں اس وقت جو تصادم ہے اس کا المناک پہلو یہ ہے کہ ہم سائنس کی مدد سے روز بروز نوامیسِ فطرت پر جو قدرت حاصل کرتے جا رہے ہیں، اس سے اس بھول میں پڑ گئے ہیں کہ انسانی اذہان اور وجدان پر بھی قابو پا سکتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سائنس کے زور سے دنیا کو لمحوں میں نیست و نابود کیا جا سکتا ہے مگر ایک فردِ واحد کے ضمیر کی آزادی کسی طرح ختم نہیں کی جا سکتی۔ اور یہی فطرتِ انسانی کی وہ ماورائی استعداد ہے جس پر آج تک نہ کوئی حاکم، نہ حکومت، نہ مذہب اور نہ کوئی اور قابو پا سکا ہے جس طرح سائنس نے محیر العقول کرشمے آج دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں، اخلاق و انسانیت نے بھی ویسے ہی کرشمے آج نہیں ہمیشہ پیش کیے ہیں چنانچہ فراعنوں میں حکمرانوں نے جب کبھی سائنس کا آخری حربۂ ہلاکت استعمال کرنا چاہا، اخلاق اور انسانیت کی قوتوں نے روک دیا۔ اس لیے میرے نزدیک اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ایسے اعتقاد اور اقدار پر بھروسہ کیا جائے جن کی بنیاد منطقی اور حکمت

پر ہو۔ اس کے بغیر انسانیت کو جائے پناہ میسر نہیں آسکتی خلاصہ یہ کہ میرا عہد اقدار و اعتقاد کی محکمی کا تھا موجودہ عہد اقدار و اعتقاد کی نامحکمی کا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

جدید اردو جس کو میں نے ایک موقع پر علی گڑھ سے تعبیر کیا ہے، علی گڑھ کا عطیہ ہے۔ اُردو جا ہے جہاں بنی ہو یا نمودار ہوئی ہو اس کے اسباب کچھ ہی رہے ہوں اس کی تنظیم استحکام، ہمہ جہتی ترقی اور اس کو مقبولِ عام اور مفیدِ انام بنانے میں علی گڑھ کا بڑا نمایاں اور بیش بہا حصہ ہے اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ اس وقت ہم میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اُردو اور علی گڑھ کے دیرینہ روایات و روابط سے واقف نہ ہو۔ جدید اردو میں ان تمام صالح، دل کش اور وقیع عناصر کی جلوہ گری ملتی ہے جن سے خود علی گڑھ عبارت ہے بالفاظ دیگر جن معاشرتی علمی اور تہذیبی کسر و انکسار سے اُردو وجود میں آئی ان ہی قوتوں کی کارفرمائی علی گڑھ کی تشکیل میں ملتی ہے۔ اگر اُردو اور علی گڑھ کا یہ رشتہ تسلیم کیا جاسکتا ہے تو علی گڑھ کے لوگوں کے اس شغف کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو علی گڑھ اور اُردو دونوں سے ان کو رہا ہے۔ اُردو کی حفاظت، حمایت اور ترقی علی گڑھ کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

کچھ دنوں سے یونیورسٹی کی زمین پر جا بجا بڑی عالی شان عمارتیں نمودار ہونے لگی ہیں۔ ان کی موجودگی سے یونیورسٹی کی شان و شوکت اور قدر و قیمت دونوں میں معتدبہ اضافہ ہوگا آزادی سے پہلے علی گڑھ میں ایسی مرتفع مستحکم اور بیش قیمت عمارات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن جس تاریخی وحدت اور تہذیبی منزلت کا احساس و افتخار سرسیّد کی بنائی ہوئی عمارتوں کو دیکھنے سے ہوتا ہے، وہ دوسری عمارتوں سے نہیں ہوتا۔ جدید عمارات میں انجینیری کے فن کے معجزے نظر آتے ہیں۔ ان کی افادیت بھی مسلّم ہے لیکن ان میں پرانی عمارتوں کی وہ شخصیت نہیں ملتی جو تاریخی اور تہذیبی روایات و اقدار کو زندہ اور تابندہ رکھتی ہے شاعری ہی کی طرح عمارت میں بھی ورائے فن چیزے دگر ہست کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

میں یونیورسٹی کا شمار اعلیٰ درجہ کے کلچرل اداروں میں کرتا ہوں، بالخصوص قومی یونیورسٹی اس لیے اس کی عمارتوں میں اس چیز کے دیکھنے کا مشتاق رہتا ہوں جس سے اس یونیورسٹی

کے کلچرل اقدار کا پتہ لگ سکے۔

. . . .

بغداد، دمشق، قرطبہ، غرناطہ، دلّی وغیرہ علم و فضل کے کیسے کیسے امصار و دیار انقلابات کی زد میں آئے تو شاعروں نے ان کے ماتم میں جاں گداز مرثیے لکھے۔ علی گڑھ سب کے بعد آیا ہے۔ ممکن ہے سب کے پیچھے بھی ہو لیکن مدینۃ العلم کی حیثیت سے اس کے پیش رووں کی طرح اس کی حیثیت و عظمت کا بھی اعتراف کبھی نہ کبھی ہم کو کرنا پڑے گا۔ ملک میں یونیورسٹیوں کا اضافہ بڑی تیزی سے ہو رہا ہے اور تعجب نہیں کچھ دنوں میں چپے چپے پر یونیورسٹیاں قائم ہو جائیں لیکن ان میں اور علی گڑھ میں بہت سی اصطلاحی اور سرکاری مماثلت ہونے کے باوجود ایک بڑا اہم اور بنیادی فرق بھی ہے۔ علی گڑھ کے نقش کو ایک مردِ خدا نے تمام کیا ہے اس میں "رنگِ ثبات و دوام ہے"

ممکن ہے آپ ان تصورات کو آرائشِ سخن سے زیادہ وقعت نہ دیں اس لیے عرض کروں گا کہ آپ خود کبھی مہدی منزل سے مسجد تک کی عمارتوں پر سرسری نظر بھی ڈالیں تو محسوس کریں گے کہ کس طرح اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ کے اشعار آپ کے ذہن اور عمارات کے خشت و سنگ اور پیچ و خم میں مرتسم ہونے لگتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے رستاخیز میں جب کبھی ادھر سے گزرتا اور نظر ان عمارتوں کی خاموش صف سے گزرتی ہوئی مسجد کے گنبد و مینار پر ٹھہرتی تو دل میں مایوسی، غیرت و الم کے طرح طرح کے طوفان امنڈنے لگتے لیکن اس بشارت کے سامنے ساکت و سربسجود ہو جاتے ہیں:

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں میں فاش سرِّ کلیم و خلیل

صاحبو! آخر میں میرے اعترافات کا خلاصہ سن لیجیے اور مجھے بخش دیجیے وہ یہ کہ جب تک آپ کے دل میں کسی بڑے عقیدہ، ارادہ، مقصد یا شخصیت کا احترام اور اس سے بے لوث شغف نہ ہوگا۔ نہ آپ اپنے لیے کسی مصرف کے

رہیں گے نہ کسی دوسرے کے لیے۔ ہر شخص اپنے محبوب سے پہچانا جاتا ہے جس پائے کا آپ کا محبوب ہوگا وہی درجہ آپ کو لوگوں کی نظر میں حاصل ہوگا۔ مجھے اپنی درس گاہ سے محبت ہے جس نے مجھ میں اعلیٰ کو ادنیٰ سے تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کی اور اعلیٰ کو پانے اور ادنیٰ سے بچنے کا حوصلہ دیا۔

حاجی صاحب

حاجی صاحب شعر کہتے ہیں اور بسکٹ بیچتے ہیں۔ شعر اور بسکٹ دونوں خستہ۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی المتخلص بہ دارالمصنفین کا بیان ہے کہ حاجی صاحب جس خلوص کے ساتھ شعر کہتے ہیں، اس سے زیادہ مہنگے بسکٹ بیچتے ہیں۔ مولوی صاحب کے اس بیان نے دنیائے شاعری اور بسکٹ میں تہلکہ مچا دیا۔ موصوف اس قسم کے غیر محتاط فقرے اکثر سنجیدگی سے زبان پر لاتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بارہ بنکی کے کسانوں سے تنگ آ کر حاجی صاحب پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ اس کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس کی خصوصیات یہ رکھی گئیں کہ صرف ایک ممبر ہو جس نے تمام عمر شعر نہ کہے ہوں اور بسکٹ کھائے ہوں، مولانا سہیل (اقبال احمد خاں صاحب وکیل علیگ) کے یہاں مقیم ہو اور موکلوں سے نہ ڈرے۔

آخری شرط ایسی تھی کہ اس سے عہدہ برآ ہونے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی۔ حکومت نے سپر ڈال دی۔ کانگریس نے ذاکر صاحب کو منتخب کیا اور ذاکر صاحب نے مجھ کو چنانچہ میں اعظم گڑھ پہنچا۔ چھوٹی لائن نے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جہاں صرف یکہ بان اور بندر تھے۔ یکہ بانوں سے الجھتا، بندروں سے بچتا، مولانا سہیل کے مکان پر پہنچا۔ عرصہ تک یہ طے نہ کر پایا کہ

ملازم کون ہے اور آقا کون۔ کتنے مقدمات لڑتے ہیں کتنے بلیک بیچتے ہیں۔ کتنے وکیل اور کتنے موکل اور کب اپنے مشاغل ایک دوسرے سے بدل لیتے ہیں!

مولانا سہیل سے ایک عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ امتدادِ زمانہ سے حکومت ہند اور مولانا شوکت علی بھی بدل گئے تھے۔ لیکن مولانا سہیل میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ ایک مشتِ استخوان اور اُردو شاعری میں تبدیلی بھی کیا ہو سکتی تھی۔ مولانا سہیل اور کچّی بارک سے آج سے سولہ برس قبل میں علی گڑھ میں سب سے پہلے دوچار ہوا تھا۔ اور انہی دونوں کا طفیل تھا کہ ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ مولانا ہی کی ایما، اصرار اور ہمت افزائی سے میں نے موجودہ رنگ میں مضمون لکھنا شروع کیا۔ یادش بخیر کچّی بارک میں اگلی منزل، اس رنگ میں میرا سب سے پہلا مضمون تھا۔ اگلی منزل ختم ہو چکی ہے اب ہماری باری ہے۔

مولانا کھانا بہت اچھا کھلاتے ہیں اور شعر بہت اچھے کہتے ہیں اور سناتے ہیں۔ ان دونوں کی خوبی اس وقت دوبالا ہوتی ہے جب مولانا کا بالائے بام برآمدہ ہو۔ اور موکل موجود نہ ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ مولانا موجود نہ ہوں، کھانا موجود نہ ہو، مکان نہ ہو، مکین نہ ہوں لیکن موکل کا موجود ہونا یا پیدا ہو جانا یا نمودار ہونا لازمی ہے۔ موت کا وقت معیّن ہے موکّل کا نہیں۔ آپ کھانا کھا رہے ہوں، سو رہے ہوں، خلوت میں ہوں، بیمار ہوں، غسلخانہ میں ہوں اس کا اطمینان نہیں ہو سکتا کہ موکّل نظر نہیں آئے گا اور موکّل بھی کیسا، ہر شکل کا، ہر عمر کا، مرنے والا، مارنے والا۔ ڈرنے والا، ڈرانے والا۔ ڈرنے ڈرانے والے کی صورت بنانے والا، نہتا، لٹھ بند، اژدقہ طلب، اژدقہ بر دوش بیٹھا ہوا دیکھیے تو کانگریس کا پنڈال سوتا پائیے تو راج گھاٹ کا اسٹیشن غور کیجیے تو مارسڈن ہسٹری کے اوراق میں نظر آنے والے ٹھگ!

شام کو مولانا نے کہا چلو کلب چلیں وہاں سے دار المصنفین (شبلی منزل) یعنی عرض کیا حاجی صاحب کہاں ملیں گے؟ فرمایا کلب میں اشعار پڑھ رہے ہوں گے یا دار المصنفین میں لسباٹ کا پرچہ ترکیب استعمال تقسیم کرتے ہوں گے۔ ایک عرصہ کے بعد دار المصنفین کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ہر طرف نئی تعمیرات نظر آئیں۔ ایک ستھری اور خوب صورت مسجد تھی۔ کتب خانہ اور دار المطالعہ کی عمارت نئی بنی تھی۔ بساط بدل گئی تھی مہرے پرانے تھے۔

شبلی منزل میں چند باتیں خاص طور پر نظر آئیں، مثلاً ہر جگہ صفائی، ہر بات میں سلیقہ، رفقا کا رہن سہن، آپس کا میل جول اور تصنیفی کاموں میں ان کا غیر معمولی انہماک. اس ادارے سے عرصہ سے واقف ہوں اس کی تاریخ کے بعض ایسے قابلِ تحسین و تقلید واقعات بھی معلوم ہیں جو اب تک نہ منظرِ عام پر آئے نہ لائے گئے ان واقعات اور روایات کا مخفی یا جلی فیضان ہر طرف نظر آتا ہے۔

شبلی منزل میں حقّہ اور پان بہت مقبول ہے لیکن پان کی پیک اور حقّے کی راکھ اور کوئلہ کہیں نظر نہ آیا. یہ اس لیے کہنا پڑا کہ بعض ایسے مقامات بھی دیکھنے میں آئے جہاں حقّہ اور پان کا عمل دخل نہ تھا. لیکن ان کے مقویات ہر جگہ بکھرے نظر آئے۔

جس طرح دو فوق البشر ہمیشہ ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے بدگمانی محسوس کرنے لگتے ہیں اسی طرح حاجی صاحب سے میری ملاقات ہوئی معلوم تھا کہ حاجی صاحب شاعر ہیں موصوف کو البتہ نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں تعارف کے الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے کہ حاجی صاحب نے فرمایا۔

" یہ مانا کہ آپ پرودھیسر (پروفیسر) ہیں حلیکت (حقیقت) یہ ہے کہ علی گڑھ کے اسیر ہیں "۔

نورؔ علی نور۔ اپنی اس قدر جامع و مانع تعریف سن کر سناٹے میں آگیا. ایسا "تمامی تلفظ" یہ ہندوستانی "فضا" یہ سودیسی بشارت!

حلیکت (حقیقت) یہ ہے کہ آپ علی گڑھ کے اسیر ہیں۔

عرض کیا " حاجی صاحب آپ اولیا بھی ہیں شاعر بھی. آپ کے کمال کی داستانیں سنی تھیں. مختلف روایتیں تھیں لیکن آج شرفِ نیاز حاصل کر کے وہ بصیرت حاصل ہوئی کہ "سچ" اور "نگار" کے مذاکراتِ علمیہ بھول گیا آپ کا شعر دار المصنفین اور آپ خود یونیورسٹی ہیں "۔

مولوی مسعود صاحب نے فرمایا " شعر سن کر تو آپ کا یہ عالم ہو ابسکٹ کھا کر کیا ہوگا" عرض کیا " دیکھا جائے گا. آخر سوراج پورن راج اور مکمل آزادی وغیرہ بھی تو ہے " آزادی کا لفظ سننا تھا کہ حاجی صاحب نے جھرجھری لی اور فرمایا۔

مسلم کا پھرج آجادی ہے   مرے تو سہید جندہ رہے تو گاجی ہے

فرض   آزادی   شہید   زندہ   غازی

میں نے کہا "حاجی صاحب فرض اور آزادی کا آپ جیسا تلفّظ فرماتے ہیں، اسے اگر دارالمصنّفین تسلیم کرلے تو میں اس کی معنویت مہاسبھا سے منوانے کا ذمّہ دار ہوتا ہوں "شہید" اور "غازی" کا مسئلہ تو آپ نے "زندہ" کے تلفّظ سے حل کر دیا ہے۔ اس قسم کے شہید اور غازی "جندہ" رہتے ہیں۔ ڈاکٹر مونجے اگر آپ کا تلفّظ سن لیتے تو راؤنڈ ٹیبل میں شریک ہونے کے بجائے دارالمصنفین چلے آتے۔ سر اقبال نے بڑی ہمّت کی تو کہہ سکے:

نغمہ ہندی ہے تو کیا، لے تو حجازی ہے مری!

لیکن آپ نے تو نغمہ اور لے دونوں کو نجیب الطرفین سوراجی بنا دیا۔ اس کی مبارک باد آپ کو دوں یا دارالمصنفین کو ارشاد ہوا۔

اب ہوا دارالمصنفین کا اروج! — الپسوس سبلی نومانی نہ رہے!

(عروج — افسوس شبلی نعمانی)

عرض کیا "حاجی صاحب دیکھیے ملنے سے کتنی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں دشمنوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ آپ میں اور دارالمصنفین میں چشمک ہے لوگوں کو شکایت بھی یہی ہے کہ دارالمصنّفین میں اروج کو عروج کہتے ہیں اور نومانی کو نعمانی۔ دارالمصنفین سے یہ عصبیت دور ہو جائے تو ہندوستانی اکیڈیمی کو بھی شکایت کا موقع نہ رہے گا۔ الپسوس اور افسوس میں ظاہر ہے ف کا بدل پ ہے۔ مثلاً فارسی سے پارسی۔ فیل سے پیل۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب نہ سہی مولوی مسعود علی صاحب ضرور ان سوراجی تصرّفات پر آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ "حاجی صاحب نے بے اختیار فرمایا۔

کس شان سے ٹھہرا ہے مسعود علی ہمارا

یہ رہنما ہمارا یہ دل ربا ہمارا!

عرض کیا "حاجی صاحب شاعر اور غیر شاعر میں فرق بھی اتنا ہی ہے کہ شاعر کے دل میں جو کچھ آتا ہے کہہ ڈالتا ہے۔ ہم لوگ صرف سوچ کر رہ جاتے ہیں۔ اور کہنا چاہیں بھی تو اکثر نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ آپ کی جو رائے مولوی مسعود علی صاحب کے بارے میں ہے ممکن ہے مولانا سہیل کی بھی وہی ہو۔ لیکن ان کے پاس صرف الفاظ ہیں

آپ کے یہاں صرف اظہار۔ تو آج یہ معاملہ صاف ہو گیا کہ ہم آپ مولوی مسعود علی صاحب کے سامنے بے وقوف کیوں معلوم ہونے لگتے ہیں۔"

ان باتوں سے حاجی صاحب پر رقت بہ شکل ترنم طاری ہو گئی۔ اور اشعار سنانے لگے۔

جی کہتا ہے یہاں کہیں یار مرا　　جبان رکتی نہیں دل ہے بیکرار مرا

بے قرار　　زبان

یہ سان و سوکت تیری یہ سہرا مبارک ہوا ہے گیاس

غیاث　　شان و شوکت

مگلوب دسمن اور گالب ہو اکتیار تیرا!

اختیار　غالب　دشمن　مغلوب

پہلے شعر میں مصرعۂ اول کی کمی دوسرے مصرعہ کی سادگیِ اعتراف نے پوری کر دی اور دونوں اشعار کا ستھراؤ حاجی صاحب کی موسیقی نے کر دیا سب نے یک زبان ہو کر کہا یہ سوز و گداز تو آپ کے تنور اور سکٹوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔ آپ مرثیہ کہنے لگیں تو زندہ کا تو ذکر کیا مُردے پر بھی کیا کچھ نہ گزر جائے گی۔ حاجی صاحب گویا اسی کے منتظر تھے فرمایا سہیل صاحب نے مولانا محمد علی مرحوم کا مرثیہ لکھا تھا۔ محمد علی "جندہ" ہوتے تو عمر بھر سمجھ نہ پاتے۔ میں نے بھی لکھا ہے سنیے (تحت اللفظ)

کرم مولا کا ہوا دریائے رحمت جوس میں

جوش

چل دئے جھگڑے سے چھوٹے جنت الپھردوس میں

جنت الفردوس

مکدس جبین کہتی ہے تو آ مرے آگوس میں!

آغوش　زمین　مقدس

جاں نثاری کرتے تھے جب تک تھے اپنے ہوس میں

ہوش

ایک صاحب بھرے بیٹھے تھے کہنے لگے حاجی صاحب بعض قافیے بڑے گریز پا ہیں،
موصوف نے فی البدیہہ فرمایا۔

یہ احساس ہر مسلم میں ہے لیکن نہیں کھرگوس میں
خرگوش

انھیں کہاں پائے گا ڈھونڈیے پاپوس میں
پاپوش

حریف کھاموس ہوگیا لیکن اظہار تخلص پر حاضرین سے وہ دارو گیر بلند ہوئی کہ تھوڑی دیر کے لیے حاجی صاحب بھی سراسیمہ ہوگئے۔ ایک صاحب نے مولوی مسعود علی صاحب سے دریافت فرمایا "مولوی صاحب کھرگوس حرام ہے یا حلال" مولوی صاحب نے فرمایا "جب خرگوش حلال ہے تو کھرگوس کو تو کچا کھا لینے میں کوئی قباحت نہیں۔"

حاجی صاحب کو مچھلی کے شکار کا بھی شوق ہے تالاب پر شکار کھیلنے کے لیے گئے لوگوں نے فرمائش کی، حاجی صاحب اس موقع پر کچھ ارشاد ہو۔ فرمایا۔

ٹہلتی ہوئی مچھلیاں آئیں　　ننیں سست کانٹے میں
پھنسیں

لگیں اجل کی ٹھمکیاں　　آئیں اک طمانچے میں

ایک ٹھاکر صاحب بھی اسی شغل میں مبتلا تھے۔ حاجی صاحب سے چشمک تھی شکار نہ ملنے کی خفت، کچھ حاجی صاحب کو چھیڑنے کا تاؤ۔ فرمایا، حاجی صاحب کانٹے میں بسکٹ لگا دت ہو گا؟

حاجی صاحب نے فرمایا۔

دعویٰ یہ تھا ماریں گے روہو پھسا کر
کھسیا کے رہ گئے پھنسے بھی نانگنا ٹھاکر

قریب تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ہوجاتا، لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ حاجی صاحب فطرتاً صلح پسند واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے اس موقع پر صرف اظہار تغزل فرما کر خاموش ہوگئے۔ ارشاد ہوا۔

وہ دل جل جائے جس میں چاہ نہیں
وہ چھاتی ہے ناکارہ جس میں آہ نہیں

حاجی صاحب کے بسکٹ اور اشعار ان کے حلیہ کے ترجمان ہیں۔ اس پر صرف ایک داڑھی کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ جس کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ٹھوڑی نہ ہوتی تو داڑھی بھی نہ ہوتی۔ حاجی صاحب کی شاعری "دندان تو جملہ در دہانند" کے مطابق ہے یعنی ان کے دندان کے مطابق۔

حاجی صاحب کی شکل اور رنگ دونوں عاشقانہ ہیں آواز اور چال دونوں میں لچک ہے گفتگو کرنے میں لیڈری اور تصوّف کا رنگ نمایاں رہتا ہے۔ ایک دفعہ احباب کے اصرار پر حاجی صاحب فٹ بال کھیلنے پر آمادہ ہو گئے کھیل میں حاجی صاحب اپنے بسکٹوں کی ڈلیا بھول گئے اور ان کے حریف فٹ بال کھیلنا۔ چنانچہ ڈلیا کو تماشائیوں نے اور خود حاجی صاحب کو کھلاڑیوں نے فٹ بال بنا دیا۔ مولوی مسعود صاحب ریفری تھے کھیل ختم ہونے کے بعد فیصلہ یہ دیا کہ تمام لوگ حاجی صاحب سے معافی مانگیں اور حاجی صاحب سب کو چائے اور بسکٹ پر مدعو کریں۔

مولانا سہیل کا بیان ہے کہ حاجی صاحب اعظم گڑھ کے صاحب خدمت ہیں ہند اور حجاز دونوں میں ان کے کرامات کی دھوم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ بدوؤں نے ان کو کنوئیں میں پھینک دیا چالیس دن اور اتنی ہی راتوں کے بعد وہی بدّو پھر آئے اور حاجی صاحب کو کنوئیں سے نکالا حاجی صاحب ویسے ہی تر و تازہ نمودار ہوئے جیسے تنور سے خستہ بسکٹ! بیان یہ کیا جاتا ہے بدوؤں کی مونشیوں اور بیویوں نے مفارقت شروع کر دی آخر بدوؤں کو دوسری غلطی کا مرتکب ہونا پڑا اور حاجی صاحب کو کنوئیں میں سے نکال لیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حاجی صاحب ایک گلی سے گزر رہے تھے سامنے سے ایک بدّو کا بہکا ہوا غصیلا بھینسا چلا آ رہا تھا۔ حاجی صاحب کو دیکھ کر پھنکارتا ہوا لپکا۔ موصوف پر مطلق اثر طاری نہیں ہوا قریب تھا کہ بھینسے کے سینگ اور حاجی صاحب کے دانت کا تصادم ہو حاجی صاحب نے اپنی ایک انگلی بھینسے کے مستک پر رکھ دی۔ بھینسا بھیڑ بن گیا۔ مولوی صاحب کا بیان ہے کہ یہ واقعہ صرف بھیڑ کی حد تک صحیح ہے اور حجاز والے معاملے کی حقیقت کا صرف تنور اور

اور خستہ بسکٹ تک پتہ چلتا ہے۔

لیکن مولانا سہیل اور مولانا مسعود علی کے بیانات کو تسلیم کرنے سے پہلے اس امر کو ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ حاجی صاحب شاعر بھی ہیں اس لیے اول الذکر دونوں بزرگوں کا موصوف کی شاعری یا بسکٹ کو داغدار کرنے کی کوشش کرنا تعجب کی بات نہیں۔ مولانا سہیل فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب صاحبِ کشف و کرامات ہیں لیکن جب حاجی صاحب کے شاعر ہونے کا مسئلہ پیش کیا جاتا ہے تو جواب سے کتراتے ہیں۔ مگر شاید مولانا کو یہ نہیں معلوم کہ ایک شاعر صاحبِ کشف و کرامات بھی ہوتا ہے اور نہیں ہوتا تو صرف ایک وکیل رہ جاتا ہے۔

رہی دارالمصنفین اور حاجی صاحب کی چشمک تو اس کو بھی انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ اگر الہ آباد کے امرود اور اکبر مشہور ہیں تو اعظم گڑھ کا دارالمصنفین اور حاجی صاحب کے بسکٹ کیوں نہ مشہور ہوں۔ حاجی صاحب کا ہر شعر دارالمصنفین پر بھاری ہے دوسری طرف دارالمصنفین کو دیکھیے کتنے دنوں سے قائم ہے لیکن نہ کوئی حاجی صاحب پیدا کر سکا نہ ان کا بسکٹ!

ایک صاحب نے بیان کیا کہ شبلی منزل کے بعض ورثا کی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ شبلی منزل ان کو واپس کر دی جائے۔ مولوی صاحب کو تحقیقات کے بعد پتہ چلا کہ اس کے محرک حاجی صاحب ہیں اور اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے بے دریغ بسکٹ خرچ کر رہے ہیں۔ ان کی اسکیم یہ تھی کہ شبلی منزل میں ایک بسکٹ ٹرسٹ قائم کر دیا جائے۔ حاجی صاحب ایک سیدھے سادے مسلمان ہیں مسعود علی صاحب نے ان سے سمجھوتہ کر لیا کہ تنور میں بنوائے دیتا ہوں بسکٹ کا انتظام آپ کر لیجیے۔ چنانچہ بڑے بڑے تنور یا بھٹے لگا دیے گئے حاجی صاحب کا خلوص دیکھیے انھوں نے نان پاؤ کی طرح ڈالی اور مسعود علی صاحب کی کرامت ملاحظہ ہو اس میں سے اینٹیں برآمد ہو رہی ہیں ایک مسجد اور متعدد مکانات تعمیر ہو گئے ہیں۔ مسجد میں حاجی صاحب حق اللہ ادا کرتے ہیں اور مکانات میں ارکان دارالمصنفین حق العباد۔

حاجی صاحب سے لوگوں نے معافی مانگ لی اس کے بعد موصوف سے پارٹی کا مطالبہ کیا حاجی صاحب نے فرمایا کہ میں پارٹی صرف رشید صاحب کو دوں گا اور اس میں صرف

وہی لوگ مدعو کیے جائیں گے جن کو رشید صاحب بلائیں۔ حاجی صاحب کی اس شرط کو اس ترمیم یا اضافہ کے ساتھ منظور کر لیا گیا کہ مولوی مسعود علی صاحب اس کے مہتمم ہوں گے اور شبلی منزل جائے وقوع۔ چنانچہ ایک روز شام کو بارش اور پارٹی شروع ہوئی۔ حاجی صاحب گھر سے چیزیں لاکر رکھ جاتے۔ اور دوسری قسط لانے کے لیے واپس جاتے تو حاضرین بصدارت مولوی صاحب حاجی صاحب کے لائے ہوئے اشعار کو مشاعرے کے لیے منتخب یا موزوں کرنا شروع کر دیتے۔ بعض سرے سے حذف کر دیے گئے بعض کے مصرعے یا الفاظ ادھر اُدھر کر دیے۔ بعض کو قطعہ بند کر دیا گیا۔ چند ایسے بھی تھے جن کو نثر کا جامہ پہنایا گیا تھا۔ حاجی صاحب اختلاف پر آمادہ ہوتے تو ان کو تیار دیا جاتا کہ اشعار سب موجود ہیں صرف ان کے محل وقوع بدل دیے گئے ہیں! حاجی صاحب سے مزید فرمائش کر دی جاتی، بیچارے پھر تلاشِ مقصود میں روانہ ہو جاتے۔ اسی دوران میں مولوی صاحب نے مجھے بلاکر فرمایا حضرت آپ نے آنے کے ساتھ ہی بسکٹوں کی فرمائش کر دی تھی۔ حاجی صاحب سے خریدنے لگتے تو واپسی کے ٹکٹ کے دام بھی نہ بچتے۔ حاجی صاحب نے گیہوں کی ارزانی کو بسکٹوں کی گرانی سے متوازن کرنا چاہا ہے۔ جس قیمت پر یہ بسکٹ بکتے ہیں اس قیمت پر عبدالسلام صاحب اپنے مستقبل سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ دیکھیے گھاگ نے تازے اور باسی بسکٹ ایک کر دیے ہیں۔ مٹھری اور حلوے دست وگریباں ہیں جیسے شب برات کی خیرات مانگ لائے ہوں۔ آم بھی ملے جلے ہیں۔ انڈے اُبلے ہوئے ہیں ان سب کو میں علیحدہ ٹوکری میں بندھوائے دیتا ہوں۔ علی گڑھ لیتے جائیے گا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں مولوی صاحب نے ایک بڑی ٹوکری ان نعمتوں سے بھر بھراکر علیحدہ کر دی۔ حاجی صاحب لدے پھندے آگئے۔ بارش تھم گئی اور پارٹی شروع ہو گئی۔ حاجی صاحب شعر خوانی کرنے لگے۔ دوسروں نے وہ کرنا شروع کیا جس کے حاجی صاحب سزاوار یا حاجی صاحب کا سامان مستحق تھا۔

مولانا سہیل کا مکان نہایت اچھی قطع کا ہے بالخصوص چھت کا برآمدہ۔ برسات میں بیٹھیے تو شعر اور شباب یاد آنے لگتا ہے۔ طے ہوا تھا کہ میں رہوں یہاں اور تمام دوسرے اشغال شبلی منزل میں سرانجام پائیں۔ دو گھر کا مہمان اکثر فاقے کرتا ہے لیکن اعظم گڑھ میں تخمہ کا بھی اندیشہ رہتا ہے شام کو مولوی مسعود علی صاحب تشریف لایا کرتے تھے مولوی صاحب کا حکم تھا کہ جب تک وہ

موجود رہیں کوئی موکّل نظر نہ آئے۔ ورنہ وکیل اور موکّل دونوں کی خیر نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب کے حکم کی تعمیل نہایت تندہی سے کی جاتی ہے لیکن اس معاملے میں مولوی صاحب کی طبیعت کچھ اس درجہ تنگی واقع ہوئی ہے کہ وہ کبھی کبھی ساکنانِ خانہ کو بھی موکّل سمجھ لیتے ہیں اور اپنی ایسی کر گزرتے ہیں یا کر گذرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

اس میں مولوی صاحب کا تصور بھی نہیں ہے عام طور پر سب کا قیام دوسری منزل پر رہتا ہے لیکن اوپر آنے کے لیے چھت کو جابجا کھول دیا گیا ہے جس سے بیک وقت صرف ایک شخص جس کا جثّہ نارمل سے کم ہو برآمد ہو سکتا ہے۔ چھت پر بیٹھ کر دیکھیے تو آدمی اس طرح نمودار ہوتا نظر آتا ہے جیسے الف لیلیٰ کا جن صندوق سے اس کے علاوہ جابجا چھت میں سوراخ بھی رکھ دیے گئے ہیں جو برسات سے زیادہ باشندوں کے کام میں آتے ہیں۔

موکّلوں کے نمودار ہونے کا چونکہ کوئی وقت مقرر نہیں ہے اور سونے کا معین ہے اس لیے ارادہ کر لیا تھا کہ اس آسیب سے محفوظ رکھنا میزبان کا اختیار نہیں تو اس سے محفوظ رہنے کا حق مہمان کو حاصل ہے۔ چنانچہ ایک دن لوگ سو گئے تو میں نے سارے سوراخ اور رخنے بند کر دیے۔ ایک پر چارپائی بچھا کر سو رہا۔

۱۲ بجے رات کا عمل ہوگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ متعدد چھوٹے بڑے فٹ بال چارپائی کی سطح زیریں سے چارپائی سمیت ابھرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی چارپائی کا ایک آدھ پیہ بھی اٹھ جاتا کبھی یہ معلوم ہوتا جیسے متعدد اشخاص محنتِ شاقّہ میں مبتلا ہیں اور تھک کر ہانپنے لگتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیتے ہیں۔

کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ ماجرا کیا ہے۔ کھانا زیادہ کھا لیا ہے یا سوراج مل گیا ہے جب یہ یقین ہوا کہ اس میں سے کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے تو لیٹے ہی لیٹے اور ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے" یہ پوچھنا تھا کہ سارے فٹ بال غائب ہو گئے تھوڑی دیر میں کوئی چیز پہلو میں محسوس ہوئی احتراناً دوسری طرف ہو گیا۔ وہاں بھی یہی پیش آیا۔ اس رخ کو بدلا تو گردن کے پاس وہی واقعہ پیش آنے کے قریب ہوا۔ خالی دیا تو شانہ نے محسوس کیا۔ غرض بستر پر مسلسل کھسکتا لڑھکتا رہا۔ پوچھا اور اب کے کافی دلیری سے کہا "یہ کیا شرارت ہے" تھوڑی

دیر کے لیے سکوت ہو گیا. اب گھٹنے اونچے نیچے ہونے لگے. ان کو ہٹا لیا. اتنے میں انیڈی کے نیچے ایک گرانڈیل فٹ بال ابھرتا معلوم ہوا. چنانچہ جی کڑا کر کے ایک ایسی بھرپور پانڈی رسید کی کہ چارپائی کا جتنا آسیبی حصہ ابھرا تھا اتنا ہی پچک گیا.

ایک آواز "معاف کیجیے اگر آپ کے آرام میں مخل نہ ہوتا ہوں تو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں" میں: "جی ہاں، آپ میرے آرام کے درپے ہیں اور میں آپ کی جان کے" آواز "معاف کیجیے یہ نہیں معلوم تھا کہ آپ نے اوقات تقسیم کر رکھے ہیں. ہم جس عالم سے تعلق رکھتے ہیں وہاں اس قسم کا کوئی پروگرام نہیں ہے." میں "آپ کا خیال صحیح ہے. جہاں سے آپ تشریف لا رہے ہیں ممکن ہے وہاں ایسا ہی ہوتا ہو لیکن اس دنیا میں بعض لوگ اس طرح کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں." آواز: "لیکن مجھ کو کیا معلوم کہ آپ بغیر سوچے سمجھے ایسی جگہ فروکش ہوئے ہیں اس لیے آپ کو میرے مخل عافیت ہونے پر شکایت کرنے میں تامل کرنا چاہیے." میں "بجا فرمایا، آپ نے بھی اسی قسم کی غلطی کی اس لیے آپ پر جو کچھ گزر گئی اس کا آپ کو بھی شاکی نہیں ہونا چاہیے." آواز: "آنچہ گزشت گزشت اب اجازت دیجیے کہ ہم اوپر آجائیں ممکن ہے دوبدو ہو کر ایک دوسرے کو بہتر سلوک کا مستحق پائیں." میں "لیکن یہ تو بتائیے آپ کا کیا نام ہے اور آپ کے ساتھی کتنے اور کس قسم کے ہیں." آواز "جناب میرا نام بقبقائیل ہے میرے دوسرے ساتھیوں کا نام بھی اسی طرح کا ہے."

"لاحول ولا قوۃ." آواز "قطع کلام ہوتا ہے یہ الفاظ جو آپ بے اختیار استعمال کر گئے ہیں معیارِ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں." میں "چھیڑ آپ کی طرف سے ہوئی." آواز "اب اجازت دیجیے تو حاضر ہو جائیں."

میں "لیکن آپ کے ساتھ وہ بزرگ تو نہیں ہیں جو ہم کو کراماً کاتبین اور منکر نکیر دونوں سے شرمندہ رکھتے ہیں." آواز "ہرگز نہیں ان سے معاہدہ ہوا ہے کہ جہاں ہم جائیں وہاں وہ تکلیف نہ کریں گے." کچھ دیر تک تو اطمینان کے بڑے بڑے سانس لیتا رہا. بیوی بچوں کا بھی دل سے خیال جاتا رہا. اس کے بعد گلا صاف کر کے بولا. میں "آپ کو اوپر بلانے میں پس و پیش نہیں ہے لیکن یہ اور بتا دیجیے آپ کے ساتھ بیوی بچے تو نہیں ہیں."

آواز۔ "ہمارے صرف بیویاں ہوتی ہیں بچّے نہیں۔" میں: "جزاک اللہ۔ عرض یہ ہے کہ آپ کی تشریف آوری بھی کسی سبب سے ہوگی آپ کے گھریلو معاملات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتا لیکن ہمدردی کی بنا پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

آواز: "شکریہ! بات دراصل یہ ہے کہ بعض خانگی معاملات ایسے پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ اب ان کو پبلک میں لانا ضروری ہوگیا ہے۔"

میں: "لیکن ایسے معاملات کو یوں شہرت دینا کب روا ہے۔"

آواز: "جی نہیں اس قسم کی باتیں اگر افراد تک محدود رہیں تو بد تہذیبی ہے لیکن سوسائٹی اور عدالت میں پہنچ جائیں تو شہرت اور تہذیب کے حدود میں داخل ہوکر مستحسن بن جاتی ہیں۔"

میں: "کیا آپ کے حلقے میں ہم ایسوں کا بھی گزر ہو سکتا ہے؟"

آواز: "کیوں نہیں لیکن بعض مسائل ایسے ہیں جن کی عملی تعبیر میں آپ کو ذرا وسیع الخیال اور لطیف الحس ہونا بھی پڑے گا۔"

میں: "وہ کیا؟" آواز: "خدا اور بیوی۔" میں: "یعنی۔" آواز: "آپ خدا اور بیوی سے متعلق جن معتقدات کے پیرو ہیں وہ باعتبارِ مفہوم مشتبہ اور باعتبارِ تعبیر اور تطبیق غلط ہیں ہم بیوی کو اور آپ خدا کو خطا سے بے نیاز سمجھتے ہیں۔ ہم لوگوں کے نزدیک بیوی ایک عمومی صداقت ہے اور آپ کے یہاں خدا ایک طور پر انفرادی یا شخصی صداقت ہے۔ مذہب اور عقل کے پیروؤں میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے۔ مذہب شخصی اور سائنس یا عقل عمومی صداقت ہے۔ آپ عمومی صداقت کے منکر اور ہم شخصی صداقت سے بےزار۔"

میں: "سوال یہ ہے کہ صداقتوں کے یہ تر تفصیل آپ کے انکشافات ہیں یا آپ کی بیوی کے۔" آواز: "آپ خالص علمی مباحث میں بھی عصبیت اور نفسانیت سے احتراز نہیں کرتے۔ یہ طریقہ آئینِ تہذیب کے خلاف ہے۔"

میں: "اور کیوں صاحب آپ نے جس طور پر یہاں نزول اجلال فرمانے کا ارادہ کیا تھا وہ کہاں تک تہذیب کے قرین تھا۔ آپ نے مہذب یا غیر مہذب ہونے کی سعادت

اس طور پر کیوں تقسیم کر رکھی تھی کہ آپ کی عورتیں ہمیشہ مہذب اور ہمارا خدا غیر مہذب! کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارا خدا بھی کبھی کبھی مہذب ہو جایا کرے اور آپ کی بیویاں غیر مہذب؟" آخری فقرہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ شور اٹھا "مار ڈالو جلا دو غیر مہذب، تہذیب کا مغرب کا خواتین کا منکر۔"

چارپائی بھونچال بن گئی چیخ اٹھا۔ "السلام علیکم" آنکھ کھلی تو دیکھا مولوی صاحب کھڑے ہیں اور پیچھے پیچھے پر .... موکل!

مولانا سہیل

مولانا سہیل (اقبال احمد خاں، ام۔اے۔ ال۔ال۔بی۔ علیگ) سے میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ اس زمانے میں مولانا شاعری کرتے تھے، یونین کے الیکشن لڑاتے تھے اور معجون کھاتے تھے۔ اب مقدمے لڑاتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا ایسی ہو، اس کا انجام یہ کیوں نہ ہو! ہم دونوں گل منزل (یادش بخیر کچی بارک) میں رہتے تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا، لو چلتی تھی خاک اڑتی تھی۔ معلوم نہیں آپ نے گل منزل دیکھی بھی ہے یا نہیں۔ یہ بھی نہیں مولانا سے واقف ہیں یا نہیں۔ ان میں اگر آپ کو کسی ایک سے بھی نیاز حاصل ہے تو سمجھ لیجیے دوسرے کو بھی دیکھ لیا۔ مولانا ساکنِ گل منزل، گل منزل متحرکِ مولانا!

جس دن ملاقات ہوئی مولانا الیکشن میں مبتلا تھے۔ کچی اور پکی بارکوں میں یوں بھی چشمک رہا کرتی تھی۔ جب سے مولانا کچی بارک میں آ گئے تھے اس میں اضافہ ہو گیا تھا ہر طرف الیکشن کا چرچا تھا۔ مسجد، ڈائننگ ہال، یونین، کلاس روم، ہر جگہ، ہر وقت ہر شخص اس آشوب میں اسیر تھا۔ ایک فریق کے ایجنٹ میرے کمرے میں بھی آ گئے، مولانا کو خبر ہوئی قاآنی کا ایک شعر گنگناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ پانوں کی ڈبیا ہاتھ میں، پیک منہ میں

اور اس کے دھبے شیروانی پر کمرے میں بیٹھنے کا سامان کہاں۔ جس پر فریق مخالف کے ایجنٹ بیٹھے اپنے امیدوار سے زیادہ میری قابلیت کا خطبہ پڑھ رہے تھے۔ کچّی بارک کے غسلخانے معلوم نہیں آپ نے دیکھے ہیں یا نہیں۔ نہانے سے پہلے ان غسلخانوں کی ستر پوشی لازمی تھی۔ ایسی ستر پوشی جس کے ہوتے ہوئے بھی بقول "حکیم حاذق" بے غلاف ستر پوشی بقدر اشک شوئی ہی کرسکتا تھا۔ میرے غسلخانے کی آبادی صرف ایک گھڑے پر مشتمل تھی۔ دوسرے کی جگہ خالی تھی۔ اس پر مولانا بلا تکلّف اس طور پر بیٹھ گئے گویا آج تک اسی قسم کی نشست پر بیٹھنے کے عادی تھے۔ مجھ پر اس کا اچّھا اثر پڑا۔ یہ البتّہ نہیں معلوم کہ اس گھڑے پر اس کا کیا اثر پڑا جس کے رفیق کی جگہ مولانا نے غصب کرلی تھی۔

مولانا اور فریق مخالف کے ایجنٹ میں بحث ہونے لگی۔ حریف نے آخر اس اعتراف پر گفتگو ختم کرنی چاہی کہ دونوں امیدوار احمق تھے۔ مولانا نے برجستہ فرمایا "تو جناب میرا احمق ووٹ کیوں نہ پائے"۔ یہاں احمق کے بجائے دونوں نے ایک اور لفظ استعمال کیا تھا جو احمق سے زیادہ جامع تھا۔ لیکن اس کا اعادہ اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ اس قسم کے لوگ خاکساری کی عافیت میں خلل انداز ہوں گے۔ اردو میں بہت سے ایسے الفاظ، فقرے اور کہاوتیں ہیں جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے پوری داستان پر بھاری ہوتے ہیں۔ گفتگو میں وہ بے تکلّف استعمال بھی ہوتے ہیں لیکن چونکہ استادوں کا کلام ان سے خالی ہے اس لیے ان کا اظہار و اعلان نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا کا "محاربہ الیکشن" ایک نظام کے ماتحت ہوتا۔ امیدوار کا انتخاب اکثر ذوق و نظر کے ماتحت کرتے۔ اس کے بعد پروپیگنڈا شروع ہوتا۔ مشاعرہ ہوتا تو غزل تیار کردیتے۔ تقریر ہوتی تو وہ لکھ دیتے۔ روپے پیسے کی ضرورت ہوتی تو اس سے بھی دریغ نہ کرتے۔ کسی مضمون میں نیازمندی ہوتی تو درس دیتے۔ وہ کوئی حماقت کر بیٹھتا تو ثابت کردیتے کہ اس سے بڑھ کر لیاقت اور ذہانت اگر کسی میں تھی تو خود ان میں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ لوگ مولانا کے قائل اور ان کے چھُٹّو کے دشمن بن جاتے۔ اس سلسلے میں مولانا کو اکثر خودستائی پر مجبور ہونا پڑتا۔ ایک دفعہ کسی دل جلے نے کہہ دیا "مولانا آپ اپنا پروپیگنڈا کرتے ہیں کتنی شرم کی بات ہے۔"

مولانا نے برجستہ فرمایا پیغمبر نبوت ہونے کا دعوے نہ کرے تو آپ لوگ نبی کے کب قائل ہوں۔"

کالج میں فارغ التحصیل عیال دار کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ الیف اے پاس کر کے آئے تھے۔ ایم اے ال ال بی ہو کر نکلے۔ چار برس کالج میں رہے۔ بورڈر تھے لیکن تمام زمانہ دوسروں کے کمروں پر گزارا۔ دن کا کیا ذکر رات ہوئی جس کمرے میں ہوتے وہیں رات گزار دیتے۔ کمرے والے کو شعر سناتے رہتے یا اس کو اقتصادیات، فلسفہ، تاریخ، الٰہیات، فارسی، عربی یا شعر و شاعری پر لکچر دیتے ورنہ پھر آم، پان، زمینداری، مذہب، عورتوں کی اقسام، مردوں کے امراض، مسلمانوں کے انجام پر خطبہ دیتے تھے۔ زائد چارپائی کا انتظام ہوا تو خیر ورنہ کسی کے ساتھ اسی کی چارپائی پر شکنِ بستر ہو جاتے۔ جس بحث کو اٹھاتے معلوم ہوتا۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں!

انگریزی میں نیاز مند تھے ریاضی سے دلچسپی تھی سائنس سے قطعاً ناآشنا۔ ان کے علاوہ کالج میں درسیات کے سلسلے میں جتنے مضامین تھے ہر ایک پر عبور تھا۔ جدید ترین نظریات سے آشنا تھے۔ ذہانت اور حافظہ کا حال یہ تھا کہ جس چیز کو عمر میں کبھی کبھار دیکھا یا پڑھا تھا اس کی ادنیٰ جزئیات پر بھی اتنی قدرت تھی کہ اس پر نہایت اعتماد کے ساتھ درس دے سکتے تھے۔ مرشد (ڈاکٹر ذاکر حسین خاں) کے قائل تھے۔ اکثر فرماتے "ذاکر کی ذہانت اور فطانت تک پہنچنا آسان نہیں ہے، کیا کروں خرابیٔ صحت نے برباد کر دیا ورنہ اس عمر میں بھی ایسا ہی تھا!"

بی اے میں ذاکر صاحب کے مضامین انگریزی کے علاوہ فلسفہ اور اقتصادیات تھے۔ الیف اے میں سائنس، انٹرنس میں ریاضی کا نصاب اعلیٰ۔ مرشد کو پڑھنے لکھنے سے کیا سروکار۔ بی اے میں حاضری کم تھی ٹول صاحب نے بلا کر دھمکایا تو کتاب لے کر بیٹھے۔ کچھ دیر تک قرۃ العین کے اشعار اس انداز سے پڑھتے رہتے جس سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ایک پٹھان کے ہاتھوں قرۃ العین اور اس کے اشعار کا کیا حشر ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد اپنے اور قرۃ العین کے انجام پر غور کرنے کے لیے لیٹ جاتے۔ مولانا

تشریف لاتے ذاکر صاحب فرماتے مولانا اب جان کی خیر نہیں پڑھنا شروع کیا ہے لیکن قدم قدم پر کتاب کے مصنف سے اختلاف آرا ہوتا ہے یہ بھی طے نہیں کر سکتا کہ کون حق بجانب ہے۔ مولانا جواب دیتے کہ کوئی مضائقہ نہیں لاؤ کتاب لاؤ۔ کتاب لائی گئی۔ مولانا فرماتے ذرا اصل عبارت کا ترجمہ سناؤ وہ بھی سنایا گیا۔ لاحول ولا قوۃ کہہ کر مولانا کرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتے تبصرہ شروع ہوتا ثبوت میں مثالیں اپنی زمینداری یا علامہ شبلی مرحوم کی تصانیف سے دیتے۔ ذاکر صاحب کچھ دیر سنتے پھر کہتے بس بس سمجھ گیا۔ مولانا فرماتے دیکھو جلدی نہ کرو ابھی تو محض ابتدائی باتیں بیان کی ہیں مصنف بڑا فریبی ہے اب اس کا فریب کھولتا ہوں۔ غرض نوبت یہاں تک پہنچتی کہ ذاکر صاحب قرۃ العین کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوتے اور مولانا کسی حالت میں ہوتے ان کے پیچھے ہولیتے۔ اب ذاکر صاحب آگے چلے جا رہے ہیں مولانا تعاقب میں ہوتے دونوں کے درمیان جتنا فاصلہ بڑھتا جاتا مولانا اپنی آواز بلند کرتے جاتے یہاں تک کہ ذاکر صاحب آنکھ سے اوجھل ہو جاتے اور یہ پاس کے کمرے میں بغیر کسی تامل یا تکلف کے داخل ہو جاتے۔ کمرہ کسی کا ہوتا مولانا کا قیام آئندہ بارہ گھنٹوں کے لیے وہاں مسلّم ہو گیا۔ یہاں بھی ذکر و فکر کا کوئی نہ کوئی سلسلہ شروع کر دیا جاتا۔

میں کپلی بارک کے ۲، نمبر میں تھا مسجد سے بہت قریب۔ جمعہ کا دن تھا۔ مولانا بھی موجود تھے موصوف کے غسل کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ مولانا کو غسل اور رفیریٹی سے ہمیشہ نفرت رہی لیکن آج لوگ کچھ اس درجہ آمادہ نقص امن ہو گئے کہ جی کڑا کر کے نہانے پر آمادہ ہو گئے۔ چھوٹی سی میلی بنیان اور اس سے زیادہ میلا آڑا پائجامہ قریب ستر بنے ہوئے تھے کثیف کمربند صاف پائجامہ میں ڈالا جا چکا تھا اور میلے پائجامہ کو تہبند کی سی بندش دے رکھی تھی۔ جس کو مزید کمک نتق کی کانی سے پہنچائی گئی تھی۔ اتنے میں کھانا آ گیا مولانا نے کہا کھانے کے بعد نہاؤں گا۔ ابھی ایک "ملی رشدی" سے الجھے ہوئے تھے کہ صاحب باغ سے کچھ احباب آ گئے۔ طہارت کے اسلامی اور غیر اسلامی تصور پر بحث چھڑ گئی بحث کے انہماک میں مولانا کو یہ خبر نہ ہوئی کہ جس چیز یعنی نلی کو ٹھونک کر گردا نکال رہے تھے وہ غسلخانے کی اونچی دہلیز تھی۔ لوگوں نے غل مچایا تو خبر ہوئی۔ نو دارد دل نے مسجد کا رخ کیا لیکن مولانا کی بحث ختم نہ ہوئی تھی بے خبری میں حریفوں کا تعاقب کرتے ہوئے مسجد تک پہنچ گئے گدا گر مرد عورت بچے سب مولانا کو دیکھ کر اس درجہ سراسیمہ ہوئے

کہ بچوں نے بوڑھیوں کی بڑھیوں نے بوڑھوں کی اور بوڑھوں نے اپنے چنیٹروں کی پناہ پکڑی۔ ہم لوگ بھی دوڑ پڑے اور مولانا کو کمرے پر واپس لائے۔

موصوف کو ہر کھیل سے دلچسپی تھی اور جسے جتنا کم جانتے تھے اتنا ہی زیادہ اس سے شغف ہوتا۔ تاش، چوسر، گنجفہ، شطرنج، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، ٹینس، پولو کہیں ہو رہا ہو مولانا ضرور موجود ہوں گے۔ اور اس تندہی اور دلچسپی کے ساتھ محو نظارہ ہوتے کہ دنیا و مافیہا کسی کی خبر نہ رہتی اس سلسلے میں مولانا کا رعب اسی وقت تک قائم رہتا جب تک خاموش رہتے۔

مولانا صرف "اندرون خانہ" قسم کے کھیلوں میں براہ راست حصہ لیتے تھے تاش کھیلنے کا بھی شوق تھا لیکن مولانا کے ساتھ کھیلنا ہر شخص کے بس کا نہ تھا۔ اول تو خراب کھیلتے تھے دوسرے خلوص نیت سے نہ کھیلتے۔

مولانا کی شاعری پر اظہار خیال مرشد نے کیا ہے اور خدا جانے کیا اور کس طور پر کیا ہے کیونکہ نہ مجھ کو خبر کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور نہ ان کو خبر کہ میں کس آفت میں مبتلا ہوں مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ مولانا کی شعر و شاعری کے بعد ہم سب پر شاعر اور شاعری کا پھر کبھی رعب نہیں پڑا کسی قسم کی شاعری ہو، مصرع طرح کیسا ہی سنگلاخ اور وقت کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو، اردو ہو یا فارسی مولانا کا قلم بقول ظفر علی خاں صاحب ٹھاٹھیں مارتا چلا جاتا ہے معلوم نہیں ٹھاٹھیں مارنے کی ترکیب یا یہ محل استعمال صحیح بھی ہے یا نہیں مفہوم بہرحال وہی ہے جو ظفر علی خاں کا ہوگا۔ مولانا دوسروں کو غزلیں، نظمیں لکھ دیا کرتے تھے اصلاح نہیں دے سکتے تھے۔ کہتے تھے جب تک اصلاح دوں پوری نظم کیوں نہ لکھ دوں۔

مولانا سے شعر لکھا کر مشاعرے میں پڑھنا خطرناک تھا۔ مشاعرے میں کبھی تو اپنے یا اس کے کلام پر بآواز بلند سوچنا شروع کر دیتے تھے یا پھر ان کا پیچ و تاب یا اظہار جذبات اس درجہ نمایاں اور معنی خیز ہوتا کہ لوگ تاڑ جاتے کہ دراصل کلام کا مصنف کون تھا۔ اس لیے جو شخص مولانا سے استفادہ کرتا وہ اس کا بھی اہتمام کرتا کہ جس موقع پر وہ کلام پیش کیا جائے وہاں مولانا موجود نہ ہوں۔ مولانا کا کلام ان کے تخلص سے تقریباً نایاب ہے۔ لیکن دوسروں کے تخلص سے اتنا ہی وافر ہے جتنا کسی دوسرے کا ہو سکتا ہے۔

ایک زمانے میں غالب اور ذوق کا موازنہ کالج میں بڑی مقبول ادبی ورزش تھی مولانا بھی گشت لگاتے پہنچ گئے۔ سب نے مولانا سے رجوع کیا طبیعت بحث پر مائل نہ تھی۔ حاضرین نے چھیڑنا شروع کیا۔ مولانا برابر "غیر حاضر" رہے۔ ایک صاحب نے بڑے فاتحانہ انداز سے ذوق کا یہ شعر پڑھا۔

سر بوقتِ ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

مولانا چونک پڑے، فرمایا سبحان اللہ، اس کے بعد شعر کے ثانی مصرعہ کے ایک لفظ کو دو حصوں میں تقسیم کرکے پڑھا اور سر نیچا کرکے لاحول ولا قوۃ کہہ دیا۔ ذوق کے حامی خفیف اور خجل ہوکر اٹھ گئے۔

یہاں تذکرہ تھا مولانا کے کلام کی کمیابی اور نایابی کا۔ حال ہی میں کسی اخبار میں اشتہار دیکھا جس میں درخواست کی گئی تھی کہ مولانا کا دیوان زیر ترتیب ہے اس لیے جن صاحبوں کے پاس مولانا کا کلام ہو وہ مرتب کے پاس بھیج دیں۔ اس سلسلے میں دو باتیں قابل ذکر ہیں ایک مولانا کی یہ کوشش اور تمنا کہ وہ کلام بھی مجموعے میں شامل کرلیا جائے جس کو مولانا کمزوری کے لمحات میں وقف علی الاولاد کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف ان لوگوں کی سراسیمگی ہے جو اس پر قابض و متصرف تھے اور ان ہی کے نام سے وہ کلام شائع کیا گیا۔

ایک صاحب مولانا کے عزیز دوست تھے مولانا سے فرمائش کی کہ یونین میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں آپ کوئی بڑھیا تقریر لکھ دیں۔ مولانا آمادہ ہو گئے اور تقریر لکھ کر حوالہ کردی نہایت پرمغز مدلل اور شاندار۔ الکشن کا زمانہ قریب تھا جب ہر امیدوار کے لیے یونین میں اپنی تقریر کا سکہ جمانا لازم آتا تھا کئی ہفتے بعد اسی مبحث کا اعلان کیا گیا جس پر مولانا نے تقریر لکھی تھی محرک کا نام بھی وہی تھا جس کے لیے تقریر لکھی تھی۔ مقررہ یوم اور وقت پر ہم سب مولانا کے ساتھ یونین پہنچے۔ وائس پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ بعض وجوہ کی بنا پر محرک تشریف نہ لاسکے اس لیے فلاں صاحب تحریک پیش کریں گے۔ یہ بزرگ مولانا کے دوست تھے لیکن خود مولانا ان کے ازلی دشمن تھے۔ مولانا کو کچھ تو اپنے دوست کے فرار ہوجانے پر خفت اور مایوسی تھی کیونکہ حسب معمول ممدوح نے اپنی تصنیف اور اپنے دوست کے ملکۂ تقریر کا اپنے مخصوص انداز میں کافی

پروپیگنڈا کر رکھا تھا۔ حریف کی پیش قدمی سے متحیر و مکدر ہوئے۔ مولانا نے اب نووارد کے خلاف طبع آزمائی شروع کی کہ یہ تقریر کرنا کیا جانیں ان کو عبارت صحیح لکھنا اور بولنا نہیں آتا موضوع زیر بحث ان کے فرشتوں کے بھی سمجھ میں نہیں آسکتا وغیرہ۔

محرک حریف پارٹی کے رکن تھے۔ اوران کا شہرت پانا مولانا کے مقاصد کے منافی تھا تقریر شروع ہوئی۔ مولانا چونک پڑے۔ یہ بزرگ نہایت صفائی اور جرأت کے ساتھ مولانا ہی کی لکھی ہوئی تقریر دہرا رہے تھے۔ اب مولانا کو معلوم ہوا کہ فریب دیا گیا ہے۔ ایسا فریب جس کی اہمیت اور نزاکت کو نظرانداز کیا گیا تو الیکشن کا سارا بنا بنایا نقشہ پلٹ جائے گا۔ تقریر ختم ہوئی اور ہال ابھی نعرۂ تحسین سے گونج ہی رہا تھا کہ مولانا اسٹیج پر نظر آئے۔

حاضرین متحیر تھے کہ مولانا تقریر کرنے پر کیوں کر آمادہ ہوگئے۔ مولانا کی جادو بیانی مشہور تھی لیکن موصوف کو تقریر پر آمادہ کرنا ہر شخص کا کام نہ تھا۔ آج جو یہ آمادگی پائی گئی تو مجمع ہمہ تن گوش بن گیا۔ مولانا نے تحریک کی مخالفت میں اپنی ہی لکھی ہوئی تقریر کی رد میں برجستہ کامل ایک گھنٹہ تقریر کی۔ اس عالمانہ تبحر لطف بیان اور جوش خطابت کے ساتھ کہ لوگ حیرت میں آگئے بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے بعد لوگوں پر مولانا کے تبحر ذہانت اور سحر بیانی کا ایسا سکہ جما کہ جب تک کالج میں رہے حریفوں نے کبھی سرتابی نہیں کی۔ سرور خاں مرحوم طلبائے کالج کی "جماعت اشراف" کے مسلمہ لیڈر تھے اور مولانا سہیل اوران کے "چوٹی والوں" کے سخت مخالف۔ ایک بار مولانا کا ذکر آگیا۔ کہنے لگے "فتنہ ہے فتنہ لیکن کیا کیا جائے کمبخت بڑا قابل اور بے پناہ ہے"۔

۱۸ئہ یا ۱۹ئہ کا واقعہ ہے یونین میں ام الالسنہ عربی پر خواجہ کمال الدین مرحوم کی اردو میں تقریر تھی مرحوم نے بڑی قابلیت اور اعتماد کے ساتھ تقریر شروع کی۔ مولانا سہیل کی آنکھوں میں تکلیف تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا مولانا کو احباب اسپتال لائے تھے۔ یونین میں مجمع دیکھا تو کہا مولانا تکلیف نہ ہو تو ذرا تقریر سنتے چلیں۔ مولانا نے کہا اچھی بات ہے لیکن آنکھوں میں تکلیف زیادہ ہے جلد اٹھ آئیں گے سب لوگ یونین میں آئے مولانا سر سے پاؤں تک بڑے وزنی لبادے میں ملفوف تھے سر پر ادنی کنٹوپ تھا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس پر ایک ہرے رنگ کا چھجا دستیدہ لگا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے کم و بیش دو گھنٹے تک تقریر کی۔ حاضرین

محوِ حیرت تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو وائس پریسیڈنٹ نے اعلان کیا کہ مولانا سہیل فاضل مقرر کا طلبائے کالج کی طرف سے شکریہ ادا کریں گے۔ مولانا کے خلاف سازش کامیاب ہوئی۔ دوستوں اور ساتھیوں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ ڈائس پر پہنچایا۔ مولانا کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی میز کے پاس کھڑے کیے گئے تھوڑی سی ناک اس سے ذرا بڑی ٹھوڑی اور ہاتھ کی صرف انگلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مولانا نے بے تکلف تقریر شروع کردی اس اعتماد سے گویا تمام عمر اسی مبحث پر تیاری کی تھی۔ جو لوگ یونین کے مجمع سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ اچھے مقرر کے بعد کسی اور کی تقریر سننے کے لیے کوئی نہیں ٹھیرتا اور صدر کا شکریہ بھی اسی بدنظمی کا ایک سلسلہ ہوتا ہے۔ مولانا نے بھی ام الالسنہ عربی پر تقریر شروع کی۔ پون گھنٹہ تک تقریر کی نئے نئے پہلوؤں سے موضوع پر روشنی ڈالی، نئی نئی مثالیں پیش کیں۔ تقریر کو اس درجہ دلنشیں اور کہیں کہیں اتنا شگفتہ بنادیا کہ خواجہ صاحب نے بے اختیار ہوکر مولانا کو گلے سے لگالیا اور فرمایا "تمھارے ایسا جامع کمالات ساتھ کام کرنے والا مل جائے تو میں اسلام کا جھنڈا یورپ کی سب سے بلند چوٹی پر نصب کردوں۔"

مسز سروجنی نائیڈو کالج میں پہلے پہل تشریف لائی تھیں۔ آج سے کم و بیش سترہ اٹھارہ سال قبل اسٹریچی ہال میں رات کے وقت تقریر ہوئی۔ وہ رات اردو شعر و ادب اور ہندوستانی سیاست میں یادگار رہے۔ سارنے دو اسو بھا "آغا حیدر حسن دلہوی نے بیگاتی زبان میں بیگم نائیڈو پر ایک مضمون لکھا جو اپنی خوبیوں کے اعتبار سے اردو ادب میں بے نظیر ہے۔ دوسری نظم مولانا سہیل نے لکھی ترکیب الفاظ، لطافت خیال، لطف زبان اور ترنم و تازگی میں وہ خود سروجنی کا پیکر تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کے کالج سکریٹری کے "ٹحر" بننے کی شان نزول بھی اسی واقعہ سے وابستہ ہے۔

یہاں مولانا کے کلام کا جائزہ لینا مقصود نہیں ہے۔ عام طور پر لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ مولانا کی شعر و شاعری صرف اردو تک محدود تھی حالانکہ مجھے اکثر ایسا محسوس ہوا کہ مولانا کے فارسی کلام میں اردو سے زیادہ طرفگی اور تازگی ہے۔ اعلیٰ حضرت شہریار دکن کے ورود مسعود پر مولانا نے جو فارسی قصیدہ اسٹریچی ہال میں سنایا تھا وہ مولانا کی فارسی دانی کا ادنیٰ ثبوت ہے۔

یہ قصیدہ مولانا نے رات بھر میں لکھ ڈالا تھا اس کے علاوہ متعدد ایسی نظمیں ہیں جو دالس پریسیڈنٹ یونین کی صدر نشینی کے موقع پر تصنیف فرمائیں۔ کہا نہیں جاسکتا کہ مولانا فارسی نظمیں جلد لکھ سکتے تھے یا اردو۔ کچھ بھی ہو لکھتے بہت جلد تھے اتنا جلد کہ تصور میں بھی بہ مشکل آسکتا ہے۔

اکثر ایسا ہوا کہ شہر سے کچھ لوگ آئے ڈھونڈتے ڈھونڈتے مولانا تک پہنچے مولانا کہیں جانے پر آمادہ ہیں، لوگوں نے ہاتھ پاؤں جوڑنا شروع کیا۔ مولانا نے کھڑے کھڑے نظم مکمل کردی۔ ایک دن قضائے حاجت کے بعد لوٹا لیے واپس آرہے تھے کہ کچھ اجنبیوں نے گھیر لیا منظوم رقعۂ دعوت کی التجا تھی مولانا بھی وہیں لوٹا لیے ہوئے نیب کے سائے تلے اکڑوں بیٹھ گئے پہلا مصرعہ لکھایا تھا کہ ایک صاحب بول اٹھے حضور اردو نہیں فارسی۔ مولانا نے بغیر کسی تامل کے فارسی شعر لکھانے شروع کردیے فریقین کے نام گاؤں تاریخ سب کچھ نظم کردی کیسی دل کش اور ستھری نظم تھی میں نے کہا مولانا اسے علی گڑھ منتھلی میں شائع کرادوں مجھے بھی لکھا دیجیے۔ فرمایا اب یاد کہاں اور پھر ایسی ویسی نظموں سے کون اپنے آپ کو منسوب کرے کتنے تو ایسے تھے جنھوں نے انعامی نظم اور مضامین نثر مولانا سے لکھوائے اور اول درجہ کا انعام حاصل کیا۔ ایک واقعہ کا ذکر کروں۔ علی گڑھ کی نمائش قریب تھی اور لکھنؤ کا ایک سفر درپیش تھا۔ کالج کے بقایا ان پر مستزاد۔ ہم سب اس فکر میں تھے کہ کہیں سے روپے مل جائیں تو یہ دشواریاں دور ہوجائیں۔ ہم میں سب سے زیادہ مال دار مولانا تھے جو صرف کپڑے اور دواؤں پر روپے صرف کرتے تھے یا ہم لوگوں کو قرض حسنہ دیتے تھے۔ قرض حسنہ کا مفہوم یہ تھا کہ اگر کبھی مولانا کو ضرورت ہو تو ہم ادا کریں ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ مرشد نے اس میں اضافہ کردیا تھا یعنی بجائے اس کے کہ اصل پر سود کا اضافہ کرکے مولانا کو واپس کیا جائے ادا کرتے وقت اصل میں سے سود اور بھول چوک کی رقم وضع کرلی جاتی تھی مولانا اس پر بھی اکتفا کرتے تھے، کہتے تھے جو مل گیا وہ پورا نفع ہے۔

مرشد نے فرمایا مولانا کو ٹٹولو۔ میں نے کہا رقم زیادہ ہے مولانا دے تو جائیں گے لیکن واپسی کے بھی متمنی ہوں گے۔ مولانا نے مانگا نہیں اور ہماری ساکھ گئی نہیں۔ علوی نے کہا

ترکیب میں بتاؤں ابھی ایک نوٹس دیکھا ہے، اردو کا ایک مضمون طلب کیا گیا ہے، اول انعام سو روپے کا ہے مضمون مولانا سے لکھواؤ نام ہم اپنا دیں گے۔ انعام تو مل ہی جائے گا، سو روپے مولانا سے قرض لے لیے جائیں انعام ملے تو حقِ شاگردی وضع کر کے مولانا کو کچھ روپے واپس کر دیے جائیں گے۔ یہ ترکیب پسند کی گئی اور پوری اسکیم مرتب کر کے ہم سب منہ لٹکائے ہوئے مولانا کے پاس پہنچے۔

مولانا ہم لوگوں کو کبھی افسردہ خاطر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بولے خیر تو ہے سُست سُست سے کیوں نظر آتے ہو۔ علوی نے کہنا شروع کیا مولانا وہ اشتہار تو آپ نے دیکھا ہوگا جس میں سو روپے کا انعام مقرر ہے۔ مولانا نے کہا ہاں لیکن بڑا مبتذل اور پیش پا افتادہ مبحث ہے۔ علوی نے کہا جی ہاں ٹھیک ہے لیکن سرور صاحب نے آغا صاحب کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ صاحب کو لکھنؤ لکھا تھا وہاں سے وہ مضمون تیار ہو کر آگیا ہے۔ نہایت عمدہ لکھا گیا ہے، انعام تو خیر آغا کو مل ہی جائے گا لیکن آپ نے یہ بھی سوچا آئندہ الکشن پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ہم لوگ تو کہیں کے نہ رہے سرور کہتے تھے کہ انعام ملنے پر سہیل کی مزاج پرسی کروں گا۔

مولانا نے جھرجھری لی۔ بولے سرور سے کہہ دینا ستارہ یمانی علی گڑھ میں بھی طلوع ہو سکتا ہے اچھا تو ذرا میز پر سے سادی کاپی اٹھانا۔ قلم تمہارے پاس ہے لکھو۔ مولانا نے مضمون لکھانا شروع کیا۔ بولے "بدو آفرینش سے" ہم لوگوں نے کہا مولانا یہ "بدو" وغیرہ مہمل ہیں ذرا سیدھا سادہ لکھا جائے ایسا بھی کیا مضمون جس کا پہلا ہی لفظ نہ ٹھیک پڑھا جائے نہ سمجھا جائے مسکرائے پھر بولنا شروع کر دیا کم و بیش تین گھنٹے تک لکھاتے رہے اس کے بعد دوسرے وقت کے لیے لکھائی ملتوی ہوئی۔ دوسرے دن پھر شروع کیا اور بغیر یہ پوچھے ہوئے کہ ادھر کیا لکھا گئے ہو بولنا شروع کر دیا۔ مضمون فلسکیپ کے تیس صفحات پر ختم ہوا چونکہ نتیجہ جلد معلوم ہو گیا اس لیے مولانا سے اُدھار نہیں لینا پڑا انعام کے روپے مل گئے اور ہمارے پروگرام کی ایک ایک مد پوری ہو گئی۔

مولانا کی گھریلو زندگی بڑی دلچسپ ہے تمام رشتے دار عورتوں میں بے حد مقبول ہیں خاندان کے لڑکے لڑکیوں کی شادی کی بات چیت مولانا ہی کے ذمہ ہے۔ پرانے قصے قضیے

اس وقت تک کے لیے ملتوی رکھے جاتے ہیں جب تک تعطیل میں مولانا کا پھیرا نہ ہو جائے گھر کے ایک معتبر بھیدی سے روایت ہے کہ بڑے بوڑھے بچے سب کے ساتھ مولانا ایک ہی چارپائی پر بیٹھے صبح سے شام تک جھگڑے چکایا کرتے ہیں۔ انھیں کے لب ولہجہ اور روزمرّہ میں گفتگو کرتے ہیں انھیں کے ساتھ کھانا کھا لیتے ہیں۔ اس دوران میں ان سے کئی عورتیں ایک ساتھ کپڑوں کی فرمائش کر دیتی ہیں تو مولانا جس طرح بیٹھے ہوتے ہیں ویسے ہی اٹھ کر بازار چلے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ بایں ہیئت کذائی دیکھا کہ دال منڈی (بنارس) میں ننگے سر بزاز کے ہاں سے کم سے کم دو درجن کپڑے کے تھان نوکر کے ساتھ سر پر رکھوائے چلے آرہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں رشتے دار عورتوں ہی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی گلوری ہے، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی بہ شکلِ سلیپر۔ راستے میں ایک بساطی سے اہلِ حدیث قسم کی بحث کرنے لگے تپاک سے ملے کہنے لگے صدیقی خوب آئے بغل گیر ہونے پر آمادہ ہوئے۔ میں نے کہا مولانا شیروانی میرے پاس ایک ہی ہے اور نئی بھی ہے اس پان کو یا تو یہیں کسی بالاخانے پر دے آیئے یا اس بساطی کو دے دیجیے۔ بڑی بحثیں کرتا ہے آپ کا پان کھا کر مدتوں گلچھڑے کو ردے گا۔

ہم دونوں مکان واپس آئے عورتوں نے باوجود مولانا کی طلاقتِ لسانی کے سارے کپڑے واپس کر دیے اور فرمائش کر دی دوسرے لاؤ۔ مولانا پھر آمادۂ سفر ہوئے اور اس اطمینان کے ساتھ گویا شبلی منزل میں دعوت کھانے جا رہے ہیں۔ عرض کیا مولانا یہ نہ ہوگا کپڑے نوکر سے واپس کر دیجیے آپ جس حیثیت سے دال منڈی میں گشت لگاتے ہیں اس کا اثر ان کی "بالانشینوں" پر کیا پڑے گا۔ مولانا نے کہا دال منڈی والیوں کا خیال کروں یا گھر والیوں کا۔ دال منڈی میں تم نہیں جانے دیتے گھر والیاں اندر نہ گھسنے دیں گی۔ میں نے کہا کوئی پروا نہیں، یہ دیکھیے سامنے کیسے اچھے سیخ کے کباب اور پیاز کے لچھے نظر آرہے ہیں۔ ہم آپ یہی کھائیں گے آپ شعر سنایئے گا میں سو رہوں گا۔ اتنے میں نبی احمد مرحوم آ گئے کہنے لگے صدیقی تمھارا آنا ہم سب کی نجات کا باعث ہوا ورنہ اقبال ان عورتوں کے پھیر میں تمام دال منڈی میں آسیب کی طرح چکر کاٹتے۔ ادھر گھر میں عدالتِ دیوانی کا اجلاس ہو رہا ہے

مولانا سہیل کو فن عمارت میں بڑا درک ہے جس طرح مشکل زمین میں اچھے شعر نکالنا ہر شاعر کا کام نہیں اسی طرح شہر کی چپقلش میں عمارت کا اچھا نقشہ بنانا بھی آسان نہیں ٹیڑھی میڑھی زمین میں مولانا نے ایسے خوش وضع مکان بنوائے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے معلوم نہیں مولانا اچھا کھانا کھانے کے شائق ہیں یا نہیں یہ ضرور ہے کہ مولانا کے یہاں نہایت لذیذ اور ستھرا کھانا پکتا ہے۔ میں نے اکثر اپنے خرچ سے مولانا کے یہاں ارہر کی دال اور کھڑے مسالے کا گوشت کھایا اور ان کے بالاخانے کے ہوادار برآمدے میں سونے کے لیے اعظم گڑھ کا سفر کیا ہے۔ پان کثرت سے کھاتے ہیں دانت بالکل نہیں صاف کرتے جس طرح بعض لوگ شکر کی خاطر چائے پیتے ہیں مولانا چونے کی خاطر پان کھاتے ہیں۔ فن عمارت کی اصطلاح یا استعارے میں یوں کہہ سکتے ہیں پان پر کتھے کی صرف کوچی پھری ہوتی ہے۔ لیکن چونے کا پلاسٹر ہوتا ہے۔ لیموں کے دلدادہ ہیں۔ کہتے ہیں اللہ میاں نے اگر عیسائیوں کا عقیدہ صحیح ہے، چھ دن میں دنیا کی ساری چیزیں بنائیں ساتویں دن لیموں سے دل بہلایا ہے۔ ایک دن تو مزے میں آکر یہاں تک کہہ گئے کہ لیموں ہی عورت کی تخلیق کا موجب ہوا۔

اعظم گڑھ میں وکالت کرتے ہیں خوب چلتی ہے۔ وکالت کے پیشے سے میں طبعاً متنفر ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ مولانا اس عذاب سے نجات پا جائیں مولانا کا بہترین مشغلہ تصنیف و تالیف یا درس و تدریس ہوگا۔ مرشد اور سہیل عہد حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں میں منفرد ہیں۔ میں نے ان سے زیادہ کسی اور کو طباع، ذہین اور بے پناہ نہیں پایا۔ لیکن مرشد اور سہیل میں ایک فرق ہے۔ مرشد اپنی سیرت اور شخصیت کے اعتبار نسبتاً بہت بلند و بہتر ہیں۔ مولانا سہیل وکالت میں اپنے حریف کا مقابلہ بحیثیت ایک فریق کے کرتے ہیں اور اس کے قائل ہیں کہ جنگ کا کوئی صحیفۂ اخلاق نہیں ہے۔ مرشد حریف کا مقابلہ فریق کی حیثیت سے نہیں کرتے اصول کو انھوں نے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ حریف کی عظمت کے بھی قائل ہو جاتے ہیں۔ سہیل کی عصبیت اکثر ان کو حریف کی سیرت اور شخصیت کے بہتر پہلوؤں کا احساس کرنے سے باز رکھتی ہے۔ وہ اپنے دشمن کو حق و صداقت کا دوست

نہیں سمجھ سکتے مرشد کا عقیدہ یہ ہے کہ دشمن بھی مخالفت میں مخلص ہوسکتا ہے۔ سہیل کے جانی دشمن بھی ہوسکتے ہیں، مرشد کے کبھی نہیں۔

سُہیل کثیر الاولاد ہیں دو لڑکے اور بہت ساری لڑکیاں۔ سب سے چھوٹا لڑکا حال ہی میں پیدا ہوا چونکہ متعدد لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا اس لیے مولانا کو اس کی بڑی مسرت ہوئی اس کی ولادت پر مولانا مسعود علی صاحب ندوی کو ایک خط لکھا گیا جس کا آخری فقرہ یہ تھا۔

" خدا کرے مولود کو سر یعقوب کی خوش نصیبی آپ کی بھلمنساہٹ اور سہیل کی قابلیت ارزانی ہو۔"

دھوبی

علی گڑھ میں نوکر کو آقا ہی نہیں، "آقائے نامدار" بھی کہتے ہیں اور وہ لوگ کہتے ہیں جو آج کل خود آقا کہلاتے ہیں یعنی طلبہ! اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نوکر کا کیا درجہ ہے۔ پھر ایسے آقا کا کیا کہنا، جو "سپید پوش" واقع ہو۔ سپید پوش کا ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ اب سے دور اور میری آپ کی جان سے بھی دور، ایک زمانے میں پولیس کا بڑا دور دورہ تھا۔ اسی زمانے میں پولیس نے ایک شخص کا بدمعاشی میں چالان کر دیا۔ کلکٹر صاحب کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ ملزم حاضر ہوا تو کلکٹر صاحب دنگ رہ گئے۔ نہایت صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے، صورت شکل سے مرد معقول، بات چیت نہایت نستعلیق۔ کلکٹر صاحب نے تعجب سے پیش کار سے دریافت کیا کہ اس شخص کا بدمعاشی میں کیسے چالان کیا گیا، دیکھنے میں تو یہ بالکل بدمعاش نہیں معلوم ہوتا! پیش کار نے جواب دیا "حضور! تامل نہ فرمائیں، یہ سپید پوش بدمعاش ہے!"

لیکن میں نے یہاں سپید پوش کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ میں نے آج تک کسی دھوبی کو میلے کپڑے پہنے نہیں دیکھا اور نہ اس کو خود اپنے کپڑے پہنے دیکھا۔ البتہ اپنا

کپڑا پہنے ہوئے اکثر دیکھا ہے۔ بعضوں کو اس پر غصہ آیا ہوگا کہ ان کا کپڑا دھوبی پہنے ہو۔ کچھ اس پر بھی جز بز ہوئے ہوں گے کہ خود ان کو دھوبی کے کپڑے پہننے کا موقع نہ ملا۔ میں اپنے کپڑے دھوبی کو پہنے دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ کہ دیکھیے زمانہ ایسا آگیا کہ یہ غریب میرے کپڑے پہننے پر اتر آیا گو اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اپنی قمیص دھوبی کو پہنے دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں افتخار بھی محسوس کیا ہے۔ اپنی طرف سے نہیں تو قمیص کی طرف سے۔ اس لیے کہ میرے دل میں یہ وسوسہ ہے کہ اس قمیص کو پہنے دیکھ کر مجھے در پردہ کسی نے اچھی نظر سے نہ دیکھا ہوگا۔ ممکن ہے خود قمیص نے بھی اچھی نظر سے نہ دیکھا ہو۔

دھوبیوں سے حافظ اور اقبال بھی کچھ بہت زیادہ مطمئن نہ تھے۔ مجھے اشعار یاد نہیں رہتے اور جو یاد آتے ہیں وہ شعر نہیں رہ جاتے سہل ممتنع بن جاتے ہیں کبھی سہل زیادہ اور ممتنع کم اور اکثر ممتنع زیادہ اور سہل بالکل نہیں۔ اقبال نے میرے خیال میں (جس میں اس وقت دھوبی لیسا ہوا ہے) شاید کبھی کہا تھا

آہ بیچاروں کے اعصاب پہ دھوبی ہے سوار ؟

یا حافظ نے کہا ہو

فغان کین گاذران شوخ و قابل دار و شہر آشوب !

ان دونوں کا سابقہ دھوبیوں سے یقیناً رہا تھا۔ لیکن میں دھوبیوں کے ساتھ ناانصافی نہ کروں گا۔ حافظ اور اقبال کو تو میں نے تصوف اور قومیات کی وجہ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں نے بہت سے ایسے شعرا دیکھے ہیں جن کے کپڑے کبھی اس قابل نہیں ہوتے کہ دنیا کا کوئی دھوبی سوا ہندوستان کے دھوبی کے دھونے کے لیے قبول کرلے۔ اگر ان کپڑوں کو کوئی جگہ مل سکتی ہے تو صرف ان شعرا کے جسم پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ لڑائی کے بعد جب ہر چیز کی در و بست نئے سرے سے کی جائے گی اس وقت عام لوگوں کا یہ حق بین الاقوامی پولیس مانے اور منوائے گی کہ جس شاعر کے کپڑے کوئی دھوبی دھوتا ہو بشرطیکہ دھوبی خود شاعر نہ ہو، اس سے کپڑے دھلانے والوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دھلائی کا نرخ کم کرالیں۔ یہ شعرا اور ان کے بعض قدردان بھی دھوبی کے سپرد اپنے کپڑے اس وقت کر دیتے ہیں

جب ان میں اور کپڑے میں کوڑا اور کوڑا گاڑی کا رشتہ پیدا ہو جاتا ہے۔

دھوبی کپڑے چراتے ہیں، بیچتے ہیں کرائے پر چلاتے ہیں، گم کرتے ہیں۔ کپڑے کی شکل مسخ کر دیتے ہیں، پھاڑ ڈالتے ہیں۔ یہ سب میں مانتا ہوں اور آپ بھی مانتے ہوں گے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ہمارے آپ کے کپڑے اکثر ایسی حالت میں اترتے ہیں کہ دھوبی کیا کوئی دیوتا بھی دھوئے تو ان کو کپڑے کی ہیئت وحیثیت میں واپس نہیں کر سکتا۔ مثلاً غریب دھوبی نے ہمارے آپ کے ان کپڑوں کو پانی میں ڈالا ہو میل پانی میں مل گیا اللہ اللہ خیر سلا۔ جیسے خاک کا پتلا خاک میں مل جاتا ہے خاک خاک میں آگ آگ میں، پانی پانی میں اور ہوا ہوا میں۔ البتہ ان کپڑے پہننے والوں کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے کپڑے کو تو اپنی شخصیت میں جذب کر لیا اور شخصیت کو کثافت میں منتقل کر دیا۔ مثلاً لطافت بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کر سکتی! اور یہی کثافت ہم دنیا داروں کو قمیص، پگڑی اور شلوار میں نظر آتی ہو۔ یہ بات میں نے کچھ یوں ہی نہیں کہہ دی ہے۔ اونچے قسم کے فلسفے میں آیا ہے کہ عرض بغیر جوہر کے قائم رہ سکتا ہے اور نہ بھی آیا ہو تو فلسفیوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات کبھی نہ کبھی ماننی پڑے گی۔

دھوبی کے ساتھ ذہن میں اور بہت سی باتیں آتی ہیں مثلاً گدھا، رسّی، ڈنڈا، دھوبی کا کتا، دھوبن (میری مراد پرند سے ہے) استری (اس سے بھی میری مراد وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں) میلے ثابت پھٹے پرانے کپڑے وغیرہ۔ ممکن ہے آپ کی جیب میں بھولے سے کوئی ایسا خطرہ گیا ہو جس کو آپ سینے سے لگائے رکھتے ہوں لیکن کسی شریف آدمی کو نہ دکھا سکتے ہوں اور دھوبی نے اسے دھو پھاڑ کر آپ کا آنسو خشک کرنے کے لیے بلاٹنگ پیپر بنا دیا ہو یا کوئی یونانی نسخہ آپ جیب میں رکھ کر بھول گئے ہوں اور دھوبی اسے بالکل "صاف نو" کر کے لایا ہو۔

لڑائی کے زمانے میں جہاں اور بہت سی دشواریاں ہیں وہاں یہ آفت بھی کم نہیں کہ بچے کپڑے پھاڑتے ہیں، عورتیں کپڑے سیتی ہیں، دھوبی کپڑے چراتے ہیں، دکاندار قیمتیں بڑھاتے ہیں اور ہم سب کے دام بھگتتے ہیں۔ لڑائی کے بعد زندگی کی

از سر نو تنظیم ہو یا نہ ہو کوئی تدبیر ایسی نکالنی پڑے گی کہ کپڑے اور دھوبی کی مصیبتوں سے نوعِ انسانی کو کلیتاً نجات نہ بھی ملے تو بہت کچھ سہولت میسّر آ جائے۔

کپڑے کا مصرف پھاڑنے کے علاوہ حفاظت، نمائش اور ستر پوشی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ باتیں اتنی حقیقی نہیں ہیں جتنی ذہنی یا رسمی۔ سردی سے بچنے کی ترکیب تو یونانی اطبا اور ہندوستانی سادھو جانتے ہیں۔ ایک کشتہ کھاتا ہے، دوسرا جسم پر مل لیتا ہے۔ نمائش میں ستر پوشی اور ستر نمائی دونوں شامل ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ستر کے رقبہ پر کنٹرول عاید کر دیا جائے تو کپڑا یقیناً کم خرچ ہو گا اور دیکھ بھال میں بھی سہولت ہو گی۔ جنگ کے دوران میں یہ مراحل طے ہو جاتے تو صلح کا زمانہ عافیت سے گزرتا۔

لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر دنیا کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ تمام سائنس دانوں اور کاریگروں کو جمع کر کے قوم کی اس مصیبت کو ان کے سامنے پیش کریں کہ آئندہ سے لباس کے بجائے "انٹی دھوبی ٹینک" کیوں کر بنائے اور اوڑھے پہنے جا سکتے ہیں اگر یہ ناممکن ہے اور دھوبیوں کے پھاڑنے پچھاڑنے اور چرانے کے پیدائشی حقوق مجروح ہونے کا اندیشہ ہو جس کو خدا نرسی حکومتیں گوارا نہیں کر سکتیں یا بعض بین الاقوامی پیچیدگیوں کے پیش آنے کا اندیشہ ہو تو پھر رائے عامہ کو ایسی تربیت دی جائے کہ لباس پہننا ہی یک قلم موقوف کر دیا جائے اور تمام دھوبیوں کو کپڑا دھونے کے بجائے بین الاقوامی معاہدوں اور ہندوستان کی تاریخوں کو دھونے پچھاڑنے اور پھاڑنے پر مامور کر دیا جائے۔

بفرضِ محال ستر پوشی پر کنٹرول ناممکن ہو یا ترکِ لباس کی اسکیم پر بزرگانِ قوم جامے سے باہر ہو جائیں اور دھوبی ایجی ٹیشن کی نوبت آئے تو پھر ملک کے طول و عرض میں "بھارت بھبوت بھنڈار" کھول دیے جائیں۔ اس وقت ہم سب سر جوڑ کر اور ایک دوسرے کے کان پکڑ کر ایسے بھبوت ایجاد کرنے کی کوشش کریں گے جن میں جامے کے خواص ہوں گے یعنی گرمی میں ٹھنڈک اور سردی میں گرمی پیدا کریں گے۔ ستر پوشی سے جسم پوشی کرنا پڑے گی۔ اگر ہم اتنی ترقی نہیں کر سکے ہیں اور قوم و ملک کی نازک اور ناگفتہ بہ حالت دیکھتے ہوئے بھی ستر کو قربان نہیں کر سکتے تو بھارت بھبوت بھنڈار کے ذریعہ ایسے انجینیر اور آرٹسٹ پیدا کیے جائیں گے

جو ستر کو کچھ کا کچھ کر کے دکھائیں جیسے آج کل لڑنے والی حکومتیں دشمن کو دھوکا دینے کے لیے دھوئے کی ٹٹی قائم کر دیا کرتی ہیں جس کو انگریزی میں (SMOKE SCREEN) کہتے ہیں۔ اور جس کے تصرف سے دیوار و در دردو دیوار نظر آنے لگتے ہیں۔

میں تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس بھبوتیائی آرٹ کے ذریعے ہم کسی حصۂ جسم کو یا ان میں سے ہر ایک کو اس طرح مسخ یا مزین کر سکیں گے کہ وہ کچھ کا کچھ نظر آئے۔ بقول ایک شاعر کے جو اس آرٹ کے رمز سے غالباً واقف تھے یعنی :

وحشت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

شعرا نے ہمارے آپ کے اعضاء و جوارح کے بارے میں تشبیہ استعارہ یا جنون میں جو کچھ کہا ہے۔ بھارت بھبوت کے آرٹسٹ اسی قسم کی چیز ہمارے آپ کے جسم پر بنا کر غزل کو نظم معرّا کر دکھائیں گے اس وقت آرٹ برائے آرٹ اور آرٹ برائے زندگی کا تنازعہ بھی ختم ہو جائے گا۔ بہت ممکن ہے بھبوت بھنڈار میں ایسے سرمے بھی تیار کیے جا سکیں جن کی ایک سلائی پھیرنے سے چھوٹی چیزیں بڑی اور بڑی چھوٹی نظر آنے لگیں یا دور کی چیز قریب اور قریب کی دور نظر آئے۔ اس طور پر شعر آرٹ اور تصوف کو ایک دوسرے سے مربوط کر سکیں گے۔ دوسری طرف ستر دوستوں یا ستر دشمنوں کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی۔ اس وقت دھوبیوں کو معلوم ہو گا کہ ڈکٹیٹر کا انجام کیا ہوتا ہے۔

علی گڑھ میں میرے زمانۂ طالب علمی کے۔ ایک دھوبی کا حال سنیے جو اب بہت معمّر ہو گیا ہے۔ وہ اپنے گاؤں میں بہت معزز مانا جاتا ہے۔ دو منزلہ وسیع پختہ مکان میں رہتا ہے۔ کاشت کاری کا کاروبار بھی اچھے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں میں کالج کے قصے اس طور پر بیان کرتا ہے جیسے پرانے زمانے میں سورماؤں کی بہادری و فیاضی اور حسن و عشق کے افسانے بھاٹ سنایا کرتے تھے۔ کہنے لگا میاں وہ بھی کیا دن تھے اور کیسے کیسے اشراف کالج میں آیا کرتے تھے۔ قیمتی خوب صورت نرم و نازک کپڑے پہنتے تھے

جلد اُتارتے تھے، دیر میں منگاتے تھے، ہر مہینہ دو چار کپڑے ادھر اُدھر کر دیے وہاں خبر بھی نہ ہوئی، یہاں مالامال ہوگئے۔ اُن کے اُتارے کپڑوں میں بھی میرے بچّے اور رشتے دار ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے علی گڑھ کی نمائش۔ آج کل جیسے کپڑے نہیں ہوتے تھے گویا پوری اور پھول واری لٹکائے پھر رہے ہیں۔ ایک کپڑا دھونا پچاس ہاتھ مگدر ہلانے کی طاقت لیتا ہے۔ کیسا ہی دھوؤ بناؤ آب نہیں چڑھتا۔ اس پر یہ کہ آج لے جاؤ کل دے جاؤ۔ کوئی کپڑا بھول چوک میں آجائے تو عمر بھر کی آبرو خاک میں ملادیں۔

میاں ان رئیسوں کے کپڑے دھونے میں بھی مزہ آتا تھا جیسے دودھ ملائی کا کاروبار۔ دھونے میں مزا، استری کرنے میں مزا، دیکھنے میں مزا، دکھانے میں مزا، کوئیں کے پاس کپڑے دھوتے تھے کہ کوتوالی کرتے تھے۔ پاس پڑوس دور سے کھڑے تماشا دیکھتے۔ پولیس کا سپاہی بھی سلام ہی کرکے جاتا۔ مجال تھی جو کوئی پاس آجائے۔ برادری میں رشتہ ناتا اونچا لگتا کہ سیّد صاحب کے کالج کا دھوبی ہے۔ پنچایت چکانے دور دور سے بلاوا آتا۔ ایسے ایسے کپڑے پہن کر جاتا کہ گاؤں کے مکھیا اور پٹواری دیکھنے آتے جو بات کہتا سب ہاتھ جوڑ کر مانتے کوئی چیں چپڑ کرتا تو کہہ دیتا بچّا ہیکڑی دکھائی تو سیّد صاحب کے ہاں لے چل کر وہ گت بنوائی ہو کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ پھر کوئی نہ ٹکتا!

شہر میں کہیں شادی بیاہ ہوتا تو مجھے سب سے پہلے بلایا جاتا۔ لڑکی لڑکے کا بزرگ کہتا بھیّا انگنو لڑکی کی شادی ہے عزت کا معاملہ ہے، برادری کا سامنا ہے مدد کا وقت ہے، میں کہتا نچنت رہو۔ تمھاری نہیں میری بیٹی ہے۔ کالج پھلے پھولے، فکر مت کرو پرماتما کا دیا سب کچھ موجود ہے۔ میاں یقین مانو کالج آتا لڑکوں سے کہتا حضور لڑکی کی شادی ہے اب کے جمعہ کو کپڑے نہ آئیں گے سب کہتے انگنو، کچھ پروا نہیں، ہم کو بھی بلانا، جو چیز چاہو لے جاؤ دبّے کے کام نہ کرنا۔ میاں پھر کیا تھا گز بھر کی چھاتی ہوجاتی!

ایک باری کے کپڑے، دری، فرش، چاندنی، تولیے، دسترخوان سب دے دیتا، محفل چماچم ہوجاتی ایسا معلوم ہوتا جیسے کالج کا کوئی جلسہ ہے۔ براتی دنگ رہ جاتے۔ میاں اس ہیرا پھیری اور ہڑبونگ میں ایک آدھ گم ہوجاتا، کوئی کچھ رکھ لیتا یا ادھر اُدھر دے ڈالتا،

دوسرے تیسرے جمعہ کو کالج آتا نہ لڑکا بجائے اس کے کہ کپڑے پر ٹوٹ پڑتا دور ہی سے پکارتا کیوں انگنو، اکیلے اکیلے لڑکی کی شادی کر ڈالی ہم کو نہیں بلایا۔ سب کو سلام کرتا، کہتا میاں تمھارا لکھنے پڑھنے کا ہرج ہوتا، کہاں جاتے تمھارے اقبال سے سب کام ٹھیک ہو گیا۔

میاں لوگ نواب تھے۔ کہتے انگنو ہم کو فرصت نہیں میلے کپڑے لے لینا۔ دھلے کپڑے بکس میں رکھ دینا، چابی تکیے کے نیچے ہو گی۔ بکس بند کر کے مجھے دے جانا۔ ان کو کیا خبر کون کپڑے لے گیا تھا کیا واپس کر گیا۔ کبھی کچھ یاد آ گیا تو پوچھ بیٹھے انگنو فلاں کپڑا نظر نہیں آیا میں کہہ دیتا سرکار وہ لڑکی کی شادی نہ تھی۔ کہتے ہاں ہاں ٹھیک کہا، یاد نہیں رہا اور کیوں تم نے ہم کو نہیں بلایا۔ میرا یہ بہانہ اور ان کا یہ کہنا چلتا رہتا اور پھر ختم ہو جاتا۔

کالج میں کرکٹ کی بڑی دھوم تھی۔ ایک دفعہ کپتان صاحب نے گھاٹ پر سے بلوا بھیجا۔ کہنے لگے انگنو دلی سے کچھ کھیلنے والے آ گئے ہیں، ہم لوگوں کو کھیلنے کی فرصت نہیں لیکن ان کو بغیر میچ کھلائے واپس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ میچ کالج کے بیرر کھیلیں گے۔ تم نماز کے یہاں چلے جاؤ وہ بتلائے گا کہ کتنے کوٹ پتلون اور قمیص مفلر وغیرہ درکار ہوں گے۔ بیروں کی پوری ٹیم کو کرکٹ کا یونی فارم مہیا کر دو۔ کل گیارہ بجے دن کو میں سب چیزیں ٹھیک دیکھ لوں۔ میاں کپتان صاحب کا یہ خبڈیلی آرڈر پورا کیا گیا ٹیم کھیلی اور جیت گئی۔ کپتان صاحب نے سب کو دعوت دی اور بھرے مجمع میں کہا "انگنو کا شکریہ!"

اکثر سوچتا ہوں کہ دھوبی اور لیڈر میں اتنی مماثلت کیوں ہے۔ دھوبی لیڈر کی ترقی یافتہ صورت ہے یا لیڈر دھوبی کی! دونوں دھوتے پچھاڑتے ہیں۔ دھوبی گندے چیکٹ کپڑے علیحدہ لے جا کر دھوتا ہے اور صاف اور اجلا کر کے دوبارہ پہننے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیڈر برسر عام گندے کپڑے دھوتا ہے اور گندگی اچھالتا ہے washing dirty linen in Public کا یہی تو مفہوم ہے۔ لیڈر کا مقصد نجاست کو دور کرنے کا اتنا نہیں ہوتا جتنا نجاست پھیلانے کا۔ دھوبیوں کے لیے کپڑے دھونے کے گھاٹ مقرر ہیں لیڈر کے لیے پلیٹ فارم حاضر ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دھوبی کپڑے پھاڑتا ہے، غائب کر دیتا ہے اور ان کا آب و رنگ بگاڑ

دیتا ہے۔ لیکن لیڈر کی طرح وہ گندگی کو پائدار یا رنگین نہیں بناتا، نہ متعدی کرتا ہے۔

ہمارے معلم بھی دھوبی سے کم نہیں۔ وہ شاگرد کو اسی طرح دھوتے پچھاڑتے مروڑتے اور اس پر استری کرتے ہیں جیسے دھوبی کرتا ہے۔ آپ نے بعض دھوبیوں کو دیکھا ہوگا جو دھلائی کی زحمت سے بچنے اور مالک کو دھوکا دینے کے لیے سفید کپڑے پر نیل کا ہلکا سا رنگ دے دیتے ہیں۔ دھوبی کو اس کی مطلق پروا نہیں کہ سر پر سے گھما گھما کر کپڑے کو پتھر پر پٹکنا، اینٹھنا اور نچوڑنا اور اس کا لحاظ نہ کرنا کہ کپڑے کے تار و پود کے رنگ کا کیا حشر ہوگا، بٹن کہاں جائیں گے، لباس کی وضع قطع کیا سے کیا ہو جائے گی، استری ٹھیک گرم ہے یا نہیں ٹھنڈی استری کرنا چاہیے یا گرم۔ بالکل اسی طرح معلم کو اس کی پروا نہیں کہ طالب علم کس قماش کا ہے اس پر کیا رنگ چڑھا ہوا ہے، اور اس کے دل و دماغ کا کیا عالم ہے وہ اسے دے دے مارتا ہے اور پھر کس نکال دیتا ہے۔ وہ طالب علم کی استعداد، اس کے میلانات اور اس کی الجھنوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ صرف اپنا رنگ چڑھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے چنانچہ گاذری کے سارے مراحل طے کرنے کے بعد جب طالب علم دنیا کے بازار یا گاہک کے ہاتھ میں آتا ہے تو اس کا جسم، ذہن و دماغ سب جواب دے چکے ہوتے ہیں۔ اس پر رنگ بھی ناپائدار ہوتا ہے۔ کلف دے کر اس پر جو بے تکی اور بے تکان استری کی ہوتی ہے وہ حوادثِ روزگار کے ایک ہی چھینٹے یا جھونکے سے بدرنگ اور کاواک ہو جاتی ہے۔ دھوبی کی یہ روایات معلمی میں پورے طور پر سرایت کر چکی ہیں۔

ہندوستانی دھوبی کے بارے میں آپ نے ایک مشہور ستم ظریف کا فقرہ سنا ہوگا جس نے اس کو کپڑے پچھاڑتے دیکھ کر کہا تھا کہ دنیا میں عقیدہ بھی کیا چیز ہے، اس شخص کو دیکھیے کپڑے سے پتھر توڑ ڈالنے کے درپے ہے۔ اگر ستم ظریف نے ہندوستانی شعرا یا عشاق کا مطالعہ کیا ہوتا جو سنگِ سجدہ سے محبوب کا سنگِ آستاں گھس کر غائب کر دیتے ہیں تو اس پر معلوم نہیں کیا گزر جاتی۔ یہ تو پرانے شعرا کا وطیرہ تھا، حال کے شعرا کا رنگ کچھ اور ہے۔ انھوں نے سوسائٹی کے میلے گندے کپڑے شارعِ عام پر دھونے پچھاڑنے کا نیا فن ایجاد کیا ہے۔ اس قبیل کے شعرا سوسائٹی کی خرابیوں کو دور کرنے کے اتنے

قائل اور شاید قابل بھی نہیں رہے ہیں جتنا ان خرابیوں کا شکار ہو چکے ہیں یا اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ان خرابیوں کی نمائش کرنے اور اس کو ایک فن کا درجہ دینے کے درپے ہیں۔ کمزوریوں کو تسلیم کرنا اور ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا مستحسن آثار ہیں لیکن ان کو آرٹ یا الہام کا درجہ دینا کمزوری اور بدتوفیقی ہے۔ شاعری میں دھوبی کا کاروبار برا نہیں لیکن دھوبی اور دھوبی کے گدھے میں تو فرق کرنا ہی پڑے گا!

میرا ایک سے سابقہ رہا ہے جسے بہانے تراشنے میں وہ مہارت حاصل ہے جو اردو اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر کو بھی نصیب نہیں۔ پرچہ کے توقف سے شائع ہونے پر یا بالکل نہ شائع ہونے پر یہ ایڈیٹر جس جس طرح کے عذر پیش کرتے ہیں اور عاشقانہ شعر پڑھتے ہیں اور فلمی گانے سناتے ہیں وہ ایک مستقل داستان ہے اور فن بھی۔ لیکن میرا دھوبی اور اس کی بیوی جس قسم کے حیلے تراشتے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ مثلاً موسم خراب ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ دھوپ نہیں ہوئی کہ کپڑے سوکھتے یا گرد و غبار کا یہ عالم تھا کہ دُھلے بن بن دُھلے ہو گئے یا دھوپ اتنی سخت تھی کہ دھونے کے لیے کپڑے کا تر کرنا محال ہو گیا! صحت خراب ہے یعنی دھوبی یا دھوبن یا اس کے لڑکے بالے یا اس کے دور و نزدیک کے رشتے دار ہر طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ قسمت خراب ہے یعنی ان میں سے ایک ورنہ ہر ایک مرگیا۔ زمانہ خراب ہے، یعنی چوری ہوگئی، فوجداری ہوگئی یا گدھا کانجی ہاؤس بھیج دیا گیا۔ کپڑا خراب ہے یعنی پھٹ گیا بدرنگ ہوگیا یا گم ہوگیا۔

عاقبت خراب ہے یعنی ریڈیو پر طرح طرح کی خبریں آتی ہیں اور مٹی خراب ہے۔ یعنی وہ میرے کپڑے دھوتا ہے۔ میرے خلاف اور غالباً ناظرین میں سے بھی بعض حضرات کے خلاف دھوبیوں کو یہ شکایت ہے کہ میں کپڑے اتارنے اور دھوبی کے سپرد کرنے میں زیادہ دیر لگاتا ہوں یہی نہیں بلکہ دھوبی کے حوالہ کرنے سے پہلے وہ لوگ جو دھوبی نہیں ہیں یا دھوبی سے بھی گئے گزرے ہیں میرے اترے ہوئے کپڑوں کا میل دور کرنے کی اپنے اپنے طور پر کوشش اور تجربے کرتے ہیں۔ کوئی چونا گڑ کر کوئی کھانا پیالی پلیٹ اور دیگچی پونچھ کر کوئی جھاڑن کا کام لے کر کوئی آلو شاٹرا اور کوئی لنگوٹ باندھ کر اور

جب یہ تمام تجربے یا مراحل طے ہو لیتے ہیں تو وہ کپڑے دھوبی کے حوالے کیے جاتے ہیں۔

دنیا کو رنگ برنگ کے خطروں سے سابقہ رہا ہے۔ مثلاً لال خطرہ، پیلا خطرہ، کالا خطرہ۔ ان سے کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی حد تک گلو خلاصی ہوتی رہتی ہے لیکن یہ دھوبی خطرہ زندگی میں اس طرح خارش بن کر سما گیا ہے کہ نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مصیبت و مایوسی میں انسان توہم پرست ہو جاتا ہے اور ٹونے ٹوٹکے اور فال تعویذ پر اتر آتا ہے۔ میں نے دھوبی کو ذہن میں تول کر غالب سے رجوع کیا تو فال میں یہ مصرعہ نکلا:

تیرے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

گھبرا گیا لیکن چونکہ غالب یہ بھی کہہ چکے تھے کہ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا۔ اس لیے میر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں سے یہ جواب ملا۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اسی دھوبی کے سب اسیر ہوئے!

بایں ہمہ دھوبی جس دن دھلے کپڑے لاتا ہے اور میلے کپڑے لے جاتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے گھر میں برکتیں آئیں اور بلائیں دور ہوئیں۔ چاندنی، چادریں، غلاف، پردے، دسترخوان، میز پوش سب بدل گئے۔ نہا دھو کر چھوٹے بڑوں نے صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ طبیعت شگفتہ ہو گئی اور کچھ نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس ہونے لگا کہ زندگی بہر حال اتنی پُرمحن نہیں ہے جتنی کہ بتائی جاتی ہے۔

وکیل صاحب

متعدد ناکام حملوں کے بعد ایک روز جون کے مہینے میں معلوم ہوا کہ ہمارا ہیرو یونیورسٹی سے "حق بخشوانے" میں کامیاب ہوا اور ایک نیا سوٹ، پرانی ٹائی اور اس سے پرانی ٹوپی جو ایامِ دماغ سوزی کی "تفسیرِ روغنی" ہو کر رہ گئی تھی زیبِ سر کر کے کلکٹر صاحب کے بنگلے سے لے کر نینی تال کی بلندیوں تک ڈپٹی کلکٹر کا گز بن گیا تھا۔ گرمی کا موسم جنون و مراق کے لیے مضر ہوتا ہے۔ اسی لیے نینی تال، مسوری، شملہ، کسولی وغیرہ میں جب دو ایک گرمیاں سر سے گزر جاتی ہیں تو بقول شخصے "مغز کی گرمی" چھٹ جاتی ہے مکان واپس آتے ہیں۔ والدین جو بی اے پاس ہو جانے کے بعد قانون پڑھانا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا کہ منضج کے بعد مسہل دینا اور لیڈرانِ قوم اسپیچ کے بعد چندہ لینا، ان کو قانون کا امتحان پاس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک مدت کی سرگرانی کے بعد "نے محقق بود نہ دانش مند" ہو کر واپس آئے۔ اب جو دیکھیے تو ایک ٹوٹے ہوئے سائبان میں ایک خانہ ساز کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے ان کے خیالات کی طرح ڈانواں ڈول ایک میز ہے جس کا ایک پاؤں کسی حادثے کی نذر ہو گیا تھا، اس کے نیچے تین اینٹیں تلے اوپر رکھی ہوئی ہیں۔ اوپر تین چار کتابیں جن کو دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے تھے

اتنے میں ایک گاؤں سے کوئی دہقان اونچی دھوتی، کندھے پر لاٹھی اور لاٹھی کے سرے پر اس کا ایک جوڑا جوتا، جس پر تیل اور گرد کی تہیں جم چکی تھیں، پشت پر پیتل کا ایک لوٹا اور ایک میلی مختصر پوٹلی باہم دست و گریباں، کچھ بوکھلایا ہوا کچھ چوکنّا رک کر آتے ہوئے دیکھا۔ فوراً سب سے موٹی کتاب کو اس بدحواسی کے ساتھ کھینچ کر بیچ میں سے پڑھنا شروع کردیا کہ دوسری کتابیں میز پر منتشر ہوگئیں۔ اس خلفشار میں میز کا پایہ اینٹ پر سے کھسک گیا لیکن ڈگمگاتی ہوئی میز کو ایک طرف سے اپنے پاؤں پر سنبھال کر فوراً دریائے فکر میں غوطے لگانے لگے، ساتھ ہی ساتھ، کنکھیوں سے دہقانی کو بھی دیکھتے جاتے تھے۔ بدقسمتی سے اس کا رخ دوسری طرف مائل ہوگیا۔ انھوں نے مایوسی سے کتاب کو میز پر پٹک دیا میز پہلے ہی سے ڈگمگا رہی تھی، بل چل سے قلابازی کھا گئی۔ قہر درویش بر جانِ درویش، سر جھکائے ہوئے کیل کانٹے درست کر رہے تھے کہ ایک دوسرا موکل نظر آیا۔ معاً اپنی حالتِ زار کا اندازہ کیا اور سر اٹھا کر کرسی پر واپس آنا چاہتے تھے لیکن یہ بھول گئے کہ سر میز کے نیچے ہے، اٹھے تو سر میز سے ٹکرا گیا۔ کسان قریب آیا۔ چوٹ کی وجہ سے ایک ہاتھ مقامِ ماؤف پر، آنکھیں ڈبڈبائی ہوئیں۔ کچھ خفت کچھ غصہ لیکن یہ سب حالتیں اُس امید پر قابلِ برداشت تھیں جو نووارد کی ذات سے وابستہ تھی۔ آنکھوں کے اشارے سے مطلب دریافت کیا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس نگاہ میں یاس و امّید کے کیسے مدّوجزر اٹھ رہے تھے۔ کتنے ایسے ہیں جو اس بدنصیب کی ان مبارک اور خوش آیند امیدوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس نے طالب علمی کے زمانے میں محنت اور کلفت کی گھڑیوں میں، شب کی تاریکی، صبح کی سپیدی اور شام کے دھندلکے میں مستقبل کے لیے قائم کر رکھی تھیں۔ نووارد نے ایک دوسرے وکیل کا پتہ دریافت کیا۔ غریب نے ایک طرف کو اشارہ کردیا۔ کسان روانہ ہوگیا۔ وکیل صاحب کی مایوس نگاہیں کچھ دور تک جانے والے کے ساتھ گئیں پھر تھک کر کہیں رہ گئیں۔

دن کے نو بجے ہیں۔ وکیل صاحب نے کچھ کھا پی کر بستہ سنبھالا۔ شہر کے چوراہے پر یکے کے انتظار میں جا کھڑے ہوئے ایک ہاتھ میں بدرنگ شکستہ چھتری، دوسرے میں بستہ بغل

ہیں چوغہ کی پوٹلی یکہ والے ۲ آنے سواری پر مُصر یہ ڈیڑھ آنے سے زیادہ دینے پر تیار نہیں جتنے یکے والے سامنے سے گزرے سبھی سے ردّ و قدح ہوئی کسی نے ان کا خیال نہیں کیا۔ کسی نے سخت و سُست بھی کہہ دیا۔ غلط راستے پر کھڑے تھے ایک گھوڑے سے ٹکراتے بچے۔ کانسٹبل نے ڈانٹا اور یہ بے چارے سمٹ سمٹا کر ایک طرف ہو لیے ایک نہایت حقیر اور شکستہ یکہ پر دو سواریاں پہلے سے موجود تھیں اس میں ایک زنانی سواری بھی تھی یکہ بان پیر فرتوت، بقول سودا گھوڑا ایسا جسے آگے سے توبڑا دکھلایا جائے اور پیچھے سے لاٹھی ماری جائے تو چلنے پر آمادہ ہو ورنہ پاؤں کے نیچے پہیے لگانے کی ضرورت ہو۔ بہ ہزار دقّت ڈیڑھ آنے پر معاملہ طے ہوا یکہ بان کے ساتھ تیسری سواری ہو کر بیٹھے بستہ بغل میں سر پر چھتری یکہ روانہ ہوا گھوڑے کی چال ان سواریوں کی حالتِ زار کے مطابق تھی۔ ہر ایک پر وجد طاری تھا اور ہچکولوں کی تال و سم پر سر دھنتا تھا یا وکیل صاحب ضابطہ فوجداری یا ضابطہ دیوانی کی معلوم نہیں کس دفعہ میں غلطاں و پیچاں تھے کہ گھوڑے نے ٹھوکر لی بستہ مع پوٹلی کے زمین پر آ رہا۔ اور خود کہنیوں کے بل گھوڑے کی پیٹھ پر آ رہے۔

کرایہ کے یکے اور گاڑیوں کو کچہری کے دروازے تک جانے کی اجازت نہ تھی۔ احاطہ کے باہر وکیل صاحب اتر گئے اور نظر بچاتے ہوئے کچہری کی عمارت میں آئے بستہ عرائض نویسوں اور محرّر کے بورے پر رکھا، پوٹلی سے نکال کر گاؤن زیبِ تن کیا ایک مدّت گزری کبھی اس چوغہ کا رنگ سیاہ تھا امتدادِ زمانہ اور وکیل صاحب کے پیش رووں کی سرپرستی سے اس کی رنگت ان بالوں کی سی ہو گئی تھی جن پر عرصہ سے خضاب نہ لگایا گیا ہو پچھلے دامن کی گوٹ علیحدہ ہو کر نیم بیضاوی شکل میں ان کی بے گناہی پر خندہ دنداں نما تھی۔ اس دامن کی شہادت کے بارے میں بعض اشخاص شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سعادت ایک موکل کی دراز دستی سے حاصل ہوئی تھی۔

وکیلوں کے کمرے میں پہنچے۔ یہاں کس کا کون پرسانِ حال ہوتا ہمارا ہیرو وا کوپی و درماندگی کی تصویر بنا ہوا ایک گوشہ میں بیٹھ کر سب سے سستے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر

آخری سگریٹ پینے لگا۔ خیالات کا ہجوم کمرے میں ہوا کا گزر نہیں۔ دھوئیں کے حلقے فضا میں تحلیل ہو رہے تھے سگریٹ کی راکھ میز کے کنارے سے لگا کر گرا تا جاتا تھا۔ دوسرے وکلا ہنس بول رہے تھے، شور پکار سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سامنے ایک بوڑھے بنگالی وکیل کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک میلا بھدّے قسم کا کوٹ، اسی کپڑے کا پائجامہ پاؤں میں کریپ سول کا ایک پرانا جوتا۔ کاغذ کے ایک خول پر چلم رکھ کر مسلسل کش لگا رہے تھے اور نظر مسل پر لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف موکّل جھکے ہوئے تھے۔ کچھ نوجوان وکیل ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے جن کو وہ کبھی کبھی بنگلہ زبان میں کچھ نہ کچھ سمجھاتے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر میں ایک شخص ہانپتا کانپتا کمرے میں آیا اور کہنے لگا، "حضور پکار ہو رہی ہے" بوڑھا بنگالی اجلاس پر پہنچا۔ چپراسی نے جھک کر سلام کیا اور اس نے پہنچ کر دو ہی ایک جملے کہے، مقدمے کی سماعت ملتوی کر دی گئی تاریخ بھی بدل دی گئی۔ روپیوں کے بوجھ سے بنگالی وکیل کی مضبوط جیب کسی قدر اور لٹک گئی۔ اسی دوران میں حلوائی کا چھوٹا لڑکا پیپل کے ایک ہی پتّے کے ہرے دونے میں دو گلاب جامن لایا۔ پیتل کے منجھے ہوئے لوٹے میں پانی بھرا ہوا تھا بنگالی وکیل نے کریپ سول کا جوتا علیحدہ کیا۔ دونوں گلاب جامنوں کو داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور انگوٹھے سے اٹھا کر ٹھیک حلق کے اندر یکے بعد دیگرے ٹپکا دیا، پورے لوٹے کا پانی ایک سانس میں پی گیا۔ انگوٹھے کو منہ سے، منہ کو انگوٹھے سے پونچھا اور مسلوں کی ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ شخص کتنی دولت کا مالک تھا۔ رائے بہادر سی۔ آئی۔ ای پانچ ہزار روپیہ ماہوار آمدنی اور بنک آف انگلینڈ میں دس لاکھ کا حصہ دار۔

"۔۔۔۔ حاضر ہے۔" عدالت میں پکار ہوئی چپراسی نے کرخت آواز میں متغیثہ کو آواز دی۔ ایک غریب نوجوان شریف عورت میلے کچیلے لباس میں عدالت کے دروازے پر متوحش کھڑی تھی، اس بدنصیب سے چپراسی کو کوئی رقم وصول نہیں ہوئی تھی۔ بڑے سخت لہجے میں پوچھا "تیرا وکیل کون ہے" غریب عدالت سے ناواقف طرح طرح کے لوگوں کا ہجوم، عدالت کا ایوان، ہر طرف دوڑ دھوپ اور ڈانٹ ڈپٹ، یہ غریب ایک دور افتادہ گاؤں کی رہنے والی جس نے سادہ دل کسان اور مویشیوں کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھا تھا۔ اس ہنگامے

سے اور زیادہ مبہوت ہوگئی۔ چپراسی نے جواب نہ پاکر دھتکار دیا۔ سامنے سے ایک وکیل کا گزر ہوا سر چھوٹا پیٹ بڑا نیت کھوٹی آواز بھاری عورت نے آنکھوں سے اپنی کس مپرسی کی خاموش داستان سنادی۔ وکیل اس عورت کی طرف سے اسی مقدمے کی پیروی کرچکا تھا عورت کی بے بسی کو نظر انداز کرکے فیس کا طالب ہوا غریب نے ہزاروں منتیں کیں، بیوگی اور بے مائگی کا سانحۂ غم رو رو کر کہہ سنایا لیکن وکیل نے توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گیا۔ غریب نے ایک بار پھر عدالت تک پہنچنا چاہا لیکن چپراسی سختی سے مانع ہوا اور مقدمہ عدم پیروی میں خارج ہوگیا۔

ایک اور وکیل صاحب کلکتہ ہائی کورٹ میں مدت تک کام کرچکے تھے زمانے کی گردش سے مفلوک الحال ہوگئے تھے زندگی کا آفتاب لبِ بام تھا کہولت اور کمزوری کے باعث نشست و برخاست میں بھی دقت ہوتی ہے لیکن قانون کے روگ میں اب تک مبتلا ہیں۔ عدالت میں ان کا وجود سب پر وبال ہے۔ وکلا یا حکام کی لائبریری میں ان کا گذر ہوتا ہے تو لوگ بے رخی سے پیش آتے ہیں تازہ نظائر کے مطالعہ کے شائق ہیں اور ان کا خلاصہ اپنی اس نوٹ بک میں درج کرتے جاتے ہیں جس کے اطراف کی جلد مدت ہوئی حق رفاقت ادا کرکے واصل بحق ہوچکی ہے اور ادھر ادھر کے دس بیس اوراق بھی غائب ہوچکے ہیں۔ ہاتھ میں میلے اور مل گجے کاغذات کا ایک پلندہ رہتا تھا جس کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان کے ابتدائی زمانہ کے وہ پراسرار کاغذات تھے جن کی نسبت یقین کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ ملکی مسائل اور سیاسی اصول پر اس سرگرمی اور جوش کے ساتھ گفتگو کرتے کہ لوگ متحیر رہ جاتے۔ قانونی نکات خوب سمجھتے تھے لیکن ان کا حلیہ ان کی حالت ان کی کہولت کچھ ایسے اسباب تھے کہ ان کی طرف کوئی رخ نہیں کرتا تھا۔

ان کی وضعداری کو دیکھیے دس بجے دن سے پانچ بجے شام تک نچلے نہ بیٹھتے اور کبھی ایک پیسہ نہ کمایا شام کو گھر کی مراجعت کرتے تو آدھ گھنٹے سے کم وقت کرایہ چکانے میں صرف نہیں کرتے تھے یکہ والے ان کی صورت دیکھ کر پناہ مانگتے تھے یہ الف لیلیٰ کے اس تسمہ پا بوڑھے کی مانند تھے جس کے پاؤں جس کسی کی

گردن میں حائل ہو جاتے تھے اس کی جان لے کر چھوڑتے تھے۔

وکلاء کے کمرے سے علیحدہ محرروں اور عرائض نویسوں کی نشست گاہ سے متصل ایک صاحب قابلِ توجہ ہیں جو منصفی کے وکیل ہیں سر پر پٹھے جو بیچ سے علیحدہ کر دیے گئے تھے، بال خضاب سے سیاہ، چہرے پر جھریاں، آنکھوں میں سرمے کی تحریر۔ ململ کی بنڈار اچکن زیب تن۔ عمامہ برفرق۔ جیسے ابھی کہیں سے عقد پڑھا کر چھوہارے لیے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ بڑی مہری کا پاجامہ جس میں چار انگل چوڑی گوٹ لگی ہوئی حاشیہ کے اندر سرخ ڈورے دے دیے گئے تھے۔ اردو کی قانونی کتابوں کا بستہ سامنے تھا جس میں عرضی دعوے وغیرہ لکھنے کے مجرّب نسخے تہہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ کہا جاتا ہے ان کے شاگرد ہمارے وہ وکیل صاحب بھی رہ چکے تھے جن کا ذکر ابتدا میں آیا ہے۔ ایک شاگرد مسودہ لے کر اصلاح کے لیے حاضر ہوئے، انھوں نے دبیز شیشوں کی عینک ناک کے کنارے پر رکھ کر میلے کچیلے ڈورے سر کے پیچھے کھسکا کر باندھ دیے۔ کاغذ ہاتھ میں لے کر انتہائی فاصلے سے پڑھنا شروع کیا۔ پہلے ہی لفظ پر رکے، مسودہ زمین پر پٹک دیا۔ عینک لکڑی کے ایک خول میں جس کا ڈھکنا اسی وقت سے غائب تھا جب سے وکیل صاحب نے اس وادی میں قدم رکھا تھا، بند کر دی گئی۔ غریب شاگرد گھبرا گیا۔ کچھ دیر تک وکیل صاحب پیچ و تاب کھاتے رہے۔ آخر کار شاگرد نے ڈرتے ڈرتے عتاب کی وجہ دریافت کی تو فرمایا۔ "میاں تمھیں عرضی دعویٰ لکھنا کیا آئے گا خاک، مدتوں سے ساتھ ہوں اتنا مغز مارتا ہوں لیکن تمھارے دماغ میں کوئی بات نہیں گھستی۔ بس اب ہو چکا بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔"

شاگرد: "آخر کیا غلطی ہوئی میں نے حتیٰ الوسع نہایت کوشش سے مسودہ تیار کیا ہے۔"

وکیل صاحب: "اچھا لو ایک موقع اور دیتا ہوں غور سے پڑھ جاؤ سامنے ہی غلطی ہے ہاں شاباش!" شاگرد ایک ایک لفظ غور سے پڑھ گیا، مسودے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا لیکن کوئی غلطی نہ پاکر کاغذ واپس کر دیا۔ اور عرض کیا: "وکیل صاحب مجھے تو اب بھی کوئی غلطی نظر نہ آئی۔"

وکیل صاحب برافروختہ ہو کر بولے "کیوں خلاصہ فریاد ہے، کہاں لکھا ہے بسم اللہ ہی

غلط۔ شاگرد خاموش ہوگیا اور مایوس و ملول گھر واپس آیا۔ ایک بی بی دو بچے موجود تھے۔ بچے دوڑ کر لپٹ گئے جیبوں میں ہاتھ ڈال دیے "ابا میرے لیے کیا لائے ہیں، میں تو آج ناشپاتی ضرور لوں گی، اماں پیسے نہیں دیتیں کہتی ہیں ابا کچہری سے ناشپاتی لائیں گے۔" چھوٹی لڑکی ماں کے پاس سے دوڑ کر بدقسمت باپ کے گھٹنوں میں لپٹ گئی۔ "ابا کچہری نہ جایا کرو۔ تم نہیں تھے، فاطمہ کی ماں رمضانی آن کر اماں سے روپے مانگتی تھی اور جب اماں نے کہا کہ تم کچہری سے آن کر دے دوگے تو وہ بہت بگڑی اور شور مچانے لگی۔ اماں اب تک رو رہی تھیں، کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ کچہری سے آتے ہو تو بیمار معلوم ہوتے ہو۔ میرے ساتھ دن بھر رہا کرو ہم تم ساتھ جھولا جھولیں گے۔ کیوں اماں اب بابا بھی ساتھ رہیں گے تو گھر میں آکر کوئی شور نہیں مچائے گا۔"

بیوی جوان کے لیے چشم براہ تھی ناہموار قدموں کی چاپ سن کر سمجھ گئی کہ آج بھی حالات میں کوئی امید افزا تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن متبسم ہو کر خیر مقدم کیا۔ بیوی کے اس انداز پذیرائی سے شوہر کے جذبات متلاطم ہو گئے۔ اس نے بچوں کو گود میں لیا اور پرنم آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے میری قسمت قابل رشک نہیں۔"

اپنی یاد میں

دیوتاؤں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جسے عزیز رکھتے ہیں، اسے دنیا سے جلد اٹھا لیتے ہیں۔ دیویوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ جس کو عزیز رکھتی ہیں اسے کہیں کا نہیں رکھتیں۔ خود اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ دیویوں کو عزیز رکھنے کا سودا برا نہیں!

مجھے اپنی پیدائش اور وفات دونوں کا علم نہیں۔ ان سانحات کے وقت دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہوا. ظاہر ہے جب تک انقلاب نہ ہو پیدائش اور وفات دونوں عبث. میں نے شعر تمام عمر نہیں کہے. غلط البتہ پڑھ سکتا تھا. نثر لکھتا رہا. بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری آتی ہو تو انقلاب پیدا کرنے کا امکان کم، ارمان بڑھ جاتا ہے. غرض تمام عمر میں اور انقلاب ایک دوسرے سے بدگمان رہے. میری زندگی میں شاعر انقلاب پیدا ہونے لگے تھے لیکن جس وقت میں نے ان کو چھوڑا ہے تو وہ سربکف تھے اور انقلاب سربگریباں!

میں نے نثر میں جو کچھ لکھا اور بکثرت لکھا وہ اردو داں طبقے کے سامنے ہے۔ ہر طرح کی زندگی بسر کی اور ہر طرح کے لوگ دیکھے. آپ منتظر ہوں گے کہ میں اپنے مضامین کے بارے میں کچھ اعترافات کروں لیکن اعتراف کرنے سے پہلے ایک بات کھٹکتی ہے. دل

کی کھٹک میں مرنے کے بعد بھی ساتھ لایا ہوں۔ وہ یہ کہ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ مرتے وقت آدمی جو کچھ بیان کرتا ہے، وہ سچ ہو یا نہ ہو عدالت اسے سچ تسلیم کرتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مر جانے کے بعد بیان دے تو آپ اسے سچ مانیں گے یا جھوٹ۔ اس سوال کا جواب دینے میں آپ کو مشکلات کا سامنا ہو یا نہ ہو کراماً کاتبین کو یقیناً ہوگا۔ آپ ہنسیں گے کہ مرنے کے بعد کراماً کاتبین کیوں اور کیونکر۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں تحریروں میں "مکرر آنکہ" کا بھی ایک مقام ہے۔

مرنے کے بعد جو دقتیں پیش آتی ہیں، ان میں ایک کا اور اضافہ کر دیا گیا ہے یعنی اپنی یاد میں مبتلا ہو جاؤ اور دوسروں کو ہنسنے کا موقع دو۔ مرنے کے بعد ہنسنے کا موقع دینا کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہے جو مجھے یا میرے ہی جیسے کسی دوسرے کو اپنی حرکات سے باز رکھ سکے۔ زندگی میں ہنسانا مجھے پسند تھا مرنے کے بعد رلانا بالکل پسند نہیں۔ لیکن اگر رونا کسی کا پیدائشی حق ہو تو اس میں مخل بھی نہ ہوں گا البتہ کوئی بے کھٹکے ہنس پڑے تو لڑ پڑوں گا اگر فی الفور مر نہ گیا۔ موت کا علم کسی کو نہیں گو موت سب کو آتی ہے۔ یہ شروع میں کہہ آیا ہوں لیکن جہاں میں ہوں (فوجی ہی نہیں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی آج کل مقام کا اتا پتا دینا خلافِ مصلحت ہے) وہاں افواہ یہ ہے کہ میری موت واقع اس لیے ہوئی کہ ایک کور ذوق بغیر کچھ سمجھے محض احتیاطاً میری بات پر ہنس پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ میں نے بات کہی ہے اس لیے وہ یقیناً کوئی ہنسی کی بات ہوگی! فریقین کے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا چنانچہ میں نے ڈوبنے کا انتظار نہ کیا، بس مر گیا! اربابِ فن وفتن کو گوارا نہ ہوا کہ "مر گیا کچھ نہ گیا" کا الزام مجھ پر لگایا جاتا۔ انھوں نے سب سے پہلے مجھے زندگی کے الزام سے بری کر دیا۔ اس کے بعد متوقع ہیں کہ میں "بیانِ استغاثہ" یا "جوابِ ملزم" کے طور پر آپ کے سامنے کچھ عرض کروں۔

ہنسنے ہنسانے کی علت نے زندگی کے آخری دور میں مجھے کھکھا بنا دیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بڑھاپے میں جب دانت مفارقت کر جاتے ہیں تو کھکھنے پن سے اس کی تلافی ہوتی رہتی ہے۔ میں مرنے سے پہلے ادھ موا ہو چکا تھا۔ مجھ پر ایسے لوگوں کی نشمول بڑی شاق ہوتی

تھی جن کو بات کرنے کی تمیز نہ تھی۔ وہ بات اس طور سے کرتے تھے جیسے ان جیسا خوش مذاق یا خوش مذاقوں کا مربی و محسن کوئی دوسرا نہ تھا۔ دوسری طرف میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی غرض مجھ سے جلد جلد بیان کر دیں جو مجھ سے پوری نہ ہو سکے تو بھی اس کو پورا کرنے کا جھوٹا حلف اٹھالوں گا لیکن وہ برابر مذاقیہ جملے فرماتے اور گنواروں کی طرح ہنس ہنس کر اپنے آپ کو داد دیتے جاتے، میں چاہتا تھا کہ وہ بزلہ سنجی اور بدیہہ گوئی سے باز آکر مجھے جلد سے جلد گولی ماردیں لیکن وہ "مزاح المزارعین" سے باز نہیں آتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جتنا وقت وہ مسخرگی کے مظاہرے میں صرف فرماتے اس سے کچھ زیادہ وقت میں اپنے دل کو مضبوط کرنے پر صرف کرتا تھا کہ سب کچھ کروں گا انہی کا کام نہ کروں گا۔ بالآخر وہ مانگتے قرض اور میں کچھ نہ کرپاتا ان کا سوا اس کے کہ دوسروں سے قرض لے کر ان کے حوالہ کر دوں۔ چوں کہ قرض لینے کے بعد وہ میرا بیں ان کا سامنا نہ کر سکتے۔ اس لیے فرشتے اس حادثہ کو لکھتے میرے اعمالنامے میں اور کاٹتے میرے مقروضوں کے اعمالنامے سے۔

ایک دوسری دقت یہ ہے کہ میں اپنے فن یا موضوع یا اسلوب کے بارے میں گفتگو کہاں سے اور کیسے شروع کروں۔ زندگی کا بیشتر اور بہترین حصہ پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں صرف ہوا۔ کوئی طالب علم مجھ سے پوچھتا کہ اچھا لکھنا کیسے آئے گا، میں کہتا اچھے آدمی بن جاؤ اچھا لکھنے لگو گے، وہ مجھ پر ہنستا اور طرح طرح کے اقوال پیش کرتا۔ میں کہتا سیکھنے مجھ سے آئے ہو قول دوسرے کا پیش کرتے ہو۔ میرے لیے تو میرا ہی قول مستند ہے۔ وہ کہتا موتی پھر موتی ہے غواص کوئی ہو۔ میں کہتا غواص اور موتی میں ربط نہیں، تو پھر غواص چور ہے یا موتی جھوٹا۔ وہ اس پر جزبز ہوتا تو میں اس پر ہنستا اس لیے کہ میں جزبز ہوتا تو وہ ہنستا اور یہ مجھے گوارہ نہ تھا۔

میں مسلمان پیدا ہوا۔ نہ میری پیدائش میں میرا کوئی دخل تھا نہ مسلمان ہونے میں، لیکن زندگی بھر جب مجھے ہر بات میں دخل تھا یعنی خودکشی بھی کر سکتا تھا اور اسلام سے بھی منحرف ہو سکتا تھا، میں نے زندگی اور اسلام دونوں کو ایک ہی بات سمجھا ظاہر میں بھی، باطن میں بھی۔ مجھے اسلام کا پابند رہنے میں مرتے دم تک کبھی کوئی اہتمام نہ کرنا پڑا۔ بری بات کو میں نے ہمیشہ برا سمجھا اور ہر اچھی بات میں اسلام کو معاون پایا۔ کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوا ہے کہ مسلمان نہ پیدا ہوتا تو بھی شاید مسلمان

ہی رہتا چاہیے مسلمان نہ کہلاتا۔ میں خدا سے سلوک کرنے پر ہمیشہ آمادہ رہا بغیر اس خیال کے کہ خدا میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا یا خدا کا تصوّر ایک مسلمان کا کیا اور دوسرے کا کیا ہے قطع نظر اس سے کہ رسالتمآبؐ کا درجہ خدا نے کیا مقرر کیا تھا۔ رسالتمآبؐ کا تصوّر میرے ذہن میں ہمارے ہی جیسے ایک انسان کا تھا جس سے بڑے اور برگزیدہ انسان کا تصوّر میرے ذہن میں بھی کبھی نہ آیا۔ میں کیا اور میرا تصوّر کیا لیکن میرے لیے تو یہ میں سب کچھ ہے۔

مجھے ابتدا ہی سے زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا۔ فراز کم نشیب زیادہ، گھر پر تھوڑی بہت فارسی پڑھ کر انگریزی اسکول میں داخل ہوا۔ سالہا سال اسکول میں اور چھ سال تک علی گڑھ کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں رہا۔ بورڈنگ لائف کا ٹھپّہ میری بقیہ زندگی پر گہرا اور نمایاں رہا۔ آسودہ حال ہونے کے باوجود جب علی گڑھ کی اصطلاح میں کافی "عیاشی" کر سکتا تھا، ایک مختصر کمرے میں اپنی ضروریات کا تمام سامان سموئے رکھتا تھا۔ سونے کا کمرہ، پڑھنے کا کمرہ، مہمان کا کمرہ، ملاقات کا کمرہ، کھانے کا کمرہ، لباس کا کمرہ، غسل خانہ، سودی خانہ، بساط خانہ بس یہی ایک کمرہ تھا۔ وہ چیزیں بھی اسی میں پناہ لیتیں جن کو گھر کے چھوٹے بڑے چلن سے دور یا چاکری سے معذور قرار دے چکے ہوتے! چنانچہ میں مہمان کی حیثیت سے کہیں جاتا اور میزبان میری پذیرائی اور طعام و قیام کا وسیع پیمانے پر اہتمام کرتا یا تکلف برتتا تو مجھے بڑی وحشت اور ذہنی تکلیف ہوتی۔ میں کسی کا مہمان ہونا بڑی مشکل سے گوارا کرتا تھا!

اسکول میں ہاکی، کرکٹ، فٹ بال کا کیپٹن رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ کھیلنے کا شوق مجھے علی گڑھ لایا لیکن آنا بڑی ہی کس مپرسی کے عالم میں ہوا تھا۔ وہ زمانہ علی گڑھ اور علی گڑھ والوں کی ایسی تمکنت و جلال کا تھا کہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال میں میرا کوئی پرسانِ حال نہ ہوا۔ ناچار ٹینس سیکھنی شروع کی اور کچی بارک (اب عثمانیہ) میں چارپائی ٹینس کلب کا خود رو ممبر ہو گیا۔ جال کے بجائے چارپائی کھڑی کر لی جاتی اور بارک کے سامنے ریت سے اَٹے ہوئے میدان پر لوٹے سے پانی ڈال کر کورٹ بنا لیا جاتا۔ ممبر ہر وہ شخص ہو سکتا تھا جس کے پاس چارپائی اور سکنڈ ہینڈ گیند ہو۔ آنریری ممبر وہ ہو سکتے تھے جو بیت الخلا (جس کا نام اس زمانے میں بر سر آفس بھی تھا) جاتے اور وہاں سے آتے وقت کورٹ کی مٹی اور روندی ہوئی لائن پر پانی ڈال کر لے سے پھر سے

نمایاں کردیتے!

انٹرنس کے بعد کلرکی کرلی تھی۔ کالج میں چھٹیاں ہوتیں تو کلرکی پر چلا جاتا ختم ہوجاتیں تو کالج چلا آتا۔ اس طور پانچ سال گزارے۔ دیوانی کی گشتی عدالتوں میں کلرکی کرکے بہت سے مقامات دیکھے اور عجیب وغریب تجربات حاصل ہوئے۔

زندگی کا سب سے وقیع حصہ علی گڑھ میں اور علی گڑھ کے لیے صرف ہوا۔ یہاں شہرت حاصل کی اور آسودگی پائی۔ یہاں کی فیض بخشیوں نے مجھے دوسروں کے فیض سے بے نیاز کردیا۔ علی گڑھ میری زندگی، میری شخصیت، میری تحریر میں جاری وساری رہا۔ بعض تنقیدنگاروں نے میرے مضامین پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان میں علی گڑھ کی اتنی بہتات ہے کہ باہر والے ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ مجھے چاہیے کہ ہر مضمون کے ساتھ ایک فرہنگ کا اضافہ کردیا کروں۔ اعتراض صحیح ہے مشورہ غلط ہے۔ فرہنگ کے اضافہ کرنے کا کام میرا نہیں ہے اُن کا ہے جو میرے مضامین کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

"اندازِ گل افشانیِ گفتار" مجھ میں علی گڑھ کے ہی "پیمانہ وصہبا" سے آیا۔ کسی معقول اجنبی سے ملتا تو بے اختیار سوال کرتا "علی گڑھ میں بھی پڑھا ہے"۔ وہ کہتا نہیں تو افسوس ہوتا، کیسی کمی رہ گئی!

میری تحریر میں علی گڑھ کی جو آب وہوا ملتی ہے اور بہتوں کو سازگار نہیں ہوتی، وہ ان تقریروں میں نہ ملے گی جو ریڈیو پر میں نے کی ہیں۔ ریڈیائی تقریروں میں بڑی رکاوٹیں تھیں ان میں فن کا حق نہیں ادا ہوسکتا تھا۔ یوں تو انیس نے بھی کہا ہے کہ خیالِ خاطرِ احباب چاہیے کہیں ان آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے لیکن ریڈیو نے خیالِ خاطرِ احباب کی خاطر اس درجہ احتیاط اور نزاکت برتی ہے اور ایسی ایسی ٹھیس بچاؤ تدبیریں وضع کردی ہیں کہ طنز وظرافت کے لیے فن اور زندگی دونوں کی وسعتیں تنگ ہوگئیں اور میرا حال "دست وبایم شکستند وکانم دادند" کا مصداق ہوگیا۔ طنز وظرافت میں توانائی ورعنائی پیدا ہوتی ہے خیال ومقال کی آزادی سے۔ ضرورت سے زیادہ پابندیاں عاید کردینے سے موضوع، مقصد، فن، ہیئت سبھی مجروح ومفلوج ہوجاتے ہیں۔

فن کوئی خارجی چیز نہیں ہے۔ یہ خود صاحبِ فن کی زندگی اور کارکردگی کا حاصل بھی ہوتا ہے اور اس کا جزو بھی۔ یہ وہ خدمت اور عبادت ہے جس کے لیے وہ غیب سے مامور ہوتا ہے۔ ہر موجود یا ہر شخص کسی نہ کسی وظیفۂ عبادت یا مشن کے لیے خلق کیا گیا ہے جس کے مطابق اس میں استعداد ودلیعت کی گئی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنا مشن یا اپنی عبادت دریافت کرے اور اسے پورا کرے۔ اسی عبادت میں اس کی نجات مضمر ہے اگر وہ اپنی نجات چاہتا ہو۔ اسی طور پر ہنسنا ہنسانا بھی ایک عبادت ہے اور اس کا اجر اتنا ہی ہے جتنا کسی عبادت کا ہو سکتا ہے بشرطیکہ یہ عبادت اسی استقامت، خلوص، خوب صورتی سے کی جائے جیسے دوسری عبادتیں کی جاتی ہیں۔

ظرافت یا طنز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی چہار دیواری کے اندر خاص رسوم کے ساتھ کسی پیر یا پروہت کی نگرانی میں حاصل کی جائے۔ دوسرے فنون یا انسانی سرگرمیوں کی مانند ان کا سرچشمہ بھی زندگی کی ناقابلِ تسخیر اور ناپیدا کنار وسعتیں ہیں۔ کوئی شخص زندگی سے علیحدہ اور عقیدے سے بے گانہ رہ کر نہ فن کو پا سکتا ہے نہ اپنے آپ کو۔

ظرافت ہو یا عبادت اس کو زندگی ہی میں تلاش کرنا چاہیے۔ زندگی ہی سے اس کی آبیاری کرنا چاہیے اور زندگی ہی کے لیے اس کو کارآمد بنانا چاہیے۔ فن اگر زندگی سے ترقی پاتا ہے تو زندگی ہی کی تقدیس و ترفع اس کا مقصد ہونا چاہیے۔

طنز و ظرافت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ محض کتابیں پڑھنے، دوسروں کی نقل کرنے، بے وقوف بننے، بھدے ٹکے فقرے کہنے، بسورنے بھیجنے اور پینترے بدلنے سے نہیں آتی۔ میرے زمانے میں بہت سارے مزاح نگار پیدا ہو چکے تھے لیکن ان میں دو چار کے علاوہ کوئی ایسا نہ تھا جس کی کارگزاری کو امید افزا کہا جا سکتا۔ اس وقت کے عام فن کاروں کو بندہ بننے سے پہلے خدا بن جانے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ ظرافت کا معیار "پنچ" کا تھا۔ ظرافت کا جو رنگ و آہنگ میرے زمانے میں تھا اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ممکن ہے ہندوستان کو آزادی جلد مل جائے ظرافت دیر میں آئے گی۔

ظرافت میں طنز مضمر ہوتی ہے۔ طنز میں ظرافت کو داخل نہ کرنا چاہیے میرے نزدیک

ظرافت طنز سے مشکل فن ہے ظرافت کے لیے خوش دلی آرزو اور مرحمت درکار ہوتی ہے طنز میں جوش، رنج، غصہ اور بیزاری کی کارفرمائی ہوتی ہے ظاہر ہے زندگی میں دونوں کا کیا مقام ہے۔ زندگی اور زمانہ کی مکروہات سے بیزار و بددل ہو نا طیش میں آجانا دوسروں کو غصہ یا غیرت دلانا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ دوسری طرف خرابیوں کو دیکھ کر مسکرا دینا اور دوسروں کو خواہ وہ کتنی ہی مصیبت و مایوسی میں کیوں نہ مبتلا ہوں اس پر آمادہ کر دینا کہ وہ ہنس کھیل کر ان مصائب و مکروہات سے گذر جائیں اور بے دلی و بےزاری کو پاس نہ آنے دیں معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ایک طنز نگار جن فرائض کو جتنا جلد پورا کر دیتا ہے ظرافت نگار نہیں کر سکتا میرا خیال ہے کہ اکبر کی ظرافت نے یکہ و تنہا جو کام کیا وہ بہت سے طنز نگار دل سے مل کر بھی نہ ہو سکا۔ مغربیت کی مضرتوں پر سب سے پہلا اور بھرپور وار اکبر کی ظرافت نے کیا۔ شبلی، ابوالکلام، ظفر علی خاں، محمد علی، عبدالغفار، عبدالماجد وغیرہ کی آتش نوائی و نشتر زنی بعد کی چیزیں تھیں۔ ظرافت نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز سے گذرے مجبور ہو کر نہیں، خوشی، فراخدلی، حوصلہ اور خلوص کے ساتھ ظرافت کی کوئی کان نہیں ہوتی جہاں یہ متاع مدفون ملتی ہو یہ جواہر پارے ہر مقام پر ہوا اور حرارت کی مانند فضا میں سرایت کیے ہوئے ملیں گے۔ کوئی اور ہو یا نہ ہو ظریف اور طنز نگار کو مقامی نہیں آفاقی ہونا چاہیے۔

میں نے شاید ہی کوئی مضمون "خوشی خاطر" لکھا ہو۔ لکھنا اسی وقت شروع کیا جب ایسے لوگوں نے میری زندگی تلخ کر دی جن کو میں عزیز رکھتا تھا، جن سے ہر قیمت پر چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مضمون لکھ چکتا تو سمجھتا بڑا کام کیا ہے۔ اس سے دنیا میں تہلکہ مچ جائے گا لیکن اس کے شائع ہوتے ہی محسوس کرتا کہ مجھ جیسا مہمل نگار بھی شاید ہی کوئی اور ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے چھپے ہوئے مضامین کو شاید ہی کبھی پھر سے پڑھا ہو۔ اگر کبھی ایسا کرنا پڑتا تو دو چار ہی فقروں کے پڑھنے کے بعد اپنے اوپر نفریں کرتا اور سوچتا کہ اس سے بدرجہا بہتر لکھ سکتا تھا۔ یہ میں نے کیا کیا۔ کچھ عرصے بعد دوسرا مضمون لکھتا تو پھر اسی یقین کے ساتھ کہ کوئی نہ کوئی تہلکہ ضرور برپا ہو گا۔ اسی طرح تمام عمر مضامین لکھتا رہا۔ تہلکہ کبھی برپا نہ ہوا اور "عجب آزاد مرد" نہ ہونے کے باوجود "حق مغفرت کرے" کا مجھ پر اطلاق ہو گیا۔

مجھے مضامین لکھنے میں اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ اس کا اہتمام کہ کسی طرح لکھنے کا وقت ٹلتا رہے خواہ مخواہ ارد گرد کی صفائی میں، جو باتیں مدّتوں سے التوا میں تھیں ان کے پورا کرنے میں سرگرمی، جزئیات میں انہماک، وغیرہ اس طرح کی حرکتوں میں لکھنے کا وقت نکل جاتا تو اپنے کو آفریں کہتا کہ کام کے اتنے اور ایسے ہجوم میں کون شخص مضمون لکھ سکتا تھا۔ پھر حرج ہی کیا ہے مضمون نہ لکھا گیا نہ سہی کتنے اور ضروری کام کرڈالے۔ کچھ دنوں بعد پھر جبراً قہراً لکھنے بیٹھتا ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہوتا کہ پہلے گرد وپیش کی جس طرح چول بٹھائی گئی تھی وہ بگڑ چکی ہے پھر سے درست کرنا چاہیے۔ دل کہتا یہ حرکت نامعقول ہے۔ مجبور ہو کر لکھنے پر آمادہ ہوتا۔ آس پاس کی چیزیں دعوت دینے لگتیں کہ ہم حسبِ معمول تمہاری توجہ کے مشتاق و محتاج ہیں۔ لکھنے کی ذمہ داری یہ کچوکے لگاتی کہ بہانہ ساز اور کام چور ہوں خواہ مخواہ کے بہانے تراشتا ہوں۔ خفیف ہو کر اس پر آمادہ ہوتا کہ کسی کے دو چار فقرے چوری کر کے لکھ دوں۔ کاش کوئی اچھا سا شعر یا فقرہ یاد آجاتا۔ یہاں تک کہ جتنے فقرے یا اشعار یاد آتے سب بے محل بے مزہ معلوم ہوتے لیکن کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا جس کا نہ سر ہوتا نہ پیر۔ سارا صفحہ ایسا نظر آنے لگتا جیسے ہتھیلی کی ریکھاؤں کا چربہ اتار رہا تھا۔ دوسرے صفحہ کا بھی یہی حشر ہوتا۔ یک لخت اٹھ کھڑا ہوتا کہ گولی مارو اس لکھنے پر آخر بندہ بشر ہوں کب تک سر کھپاؤں۔ مونگ پھلی والا کب سے آواز دے رہا ہے۔ موزے پہنتے پہنتے پاؤں دم بخت ہو گیا۔ اب مونگ پھلی کھائی جائے گی اور ننگے پاؤں ٹہلا جائے گا۔ مونگ پھلی کھاتے اور ننگے پیر ٹہلتے دیکھ کر غریب دل بھی صبر کر کے بیٹھ جاتا۔ اتنے میں باغ کی طرف توجہ مائل ہو جاتی۔ او ہو ہو آج تو خانساماں نے بھی صاف کپڑے پہن لیے۔ فلاں سوکھا گلاب پنپنے لگا۔ بھنگن نے خوب جھاڑو دی ہے۔ لان کس درجہ ہرا اور ہموار ہے۔ ذرا اس پر چل کر تو دیکھوں واہ وا۔ قالین بھی اس کا جواب نہیں۔ کیا خوب شعر کہا ہے۔ پھولا جو ڈھاک بن میں۔ وہ زمانہ آگیا جب بچپن میں اسکول جاتے ڈھاک کے جنگل سے گزرتا۔ جنگل سے گزرا ہی تھا کہ

بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

بھاگ کر اپنی کرسی پر آیا۔ لکھنا شروع کر دیا۔ جو باتیں حاشیۂ خیال میں بھی نہ آئی تھیں

وہ ذہن میں کبھی بھی کبھی آبشار کے مانند گرنے لگیں، خیالات قلم کی روانی سے آگے بڑھنے لگے۔ اس اندیشے سے کہ کہیں ان کو بھول نہ جاؤں کاغذ کے حاشیہ پر وقتاً فوقتاً نوٹ کرنے لگا۔ اس دوران میں کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا کہ لکھنا ملتوی کر کے گھاس کھودنی پڑتی یا کئی دن تک لکھنے کا موقع نہ ملتا تو کوئی حرج واقع نہ ہوتا۔ جب بیٹھتا خیالات کی روانی شروع ہوجاتی۔

میں نے بعض ایسے دوستوں، عزیزوں اور بزرگوں کی وفات پر بھی مضامین لکھے ہیں جن سے مجھ کو یا جن کو مجھ سے شغف تھا۔ ایسے مواقع پر کوئی دقت کبھی پیش نہ آئی۔ دوستوں اور عزیزوں کی تکلیف سے میں بہت متاثر ہوتا تھا۔ اور ان کی دائمی مفارقت مجھے یک لخت زیر و زبر کر دیتی تھی۔ لکھتے وقت محسوس کرتا کہ اس عزیز کے حضور میں اپنے جسم و جان اور ذہن و خیال کی بہترین متاع پیش کر رہا ہوں۔ اس حالت میں انشا پردازی کے لوازم اکثر نظر انداز ہوجاتے۔ ان مضامین میں الفاظ و عبارت، لب و لہجہ، انداز اسالیب نکلتے میرے ہی ذہن و قلم سے تھے لیکن آتے معلوم نہیں کہاں سے تھے۔

میں نے بچوں کے لیے بھی مضامین لکھے ہیں مجھے بچوں سے بڑی الفت تھی لیکن اسی وقت تک جب تک ان کے بچپن میں آورد نہیں آمد ہوتی تھی۔ بہت زیادہ نستعلیق اور تمیزدار بچے زیادہ پسند نہ تھے۔ بچوں کو زیادہ سمجھدار نہ ہونا چاہیے اور نہ خواہ مخواہ ان کو بہت زیادہ صاف ستھرا اور تیاری کا انگور بنانا چاہیے۔ یہ بات آگے چل کر ان میں عجیب و غریب نفسیاتی الجھنیں پیدا کرتی ہے۔ بچوں کو سدھارنے میں آج کل جتنا اہتمام کیا جاتا ہے، وہ ضرورت سے زیادہ ہے اور یقیناً اتنا مفید نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی چوتھائی کوشش بھی اگر بچے کے والدین اور اس کے گھریلو ماحول کے درست کرنے میں کی جائے تو نتیجہ زیادہ امید افزا ہوگا۔ بچہ اپنی عاقبت شاید ہی ساتھ لاتا ہو۔ اکثر و بیشتر اس کے والدین اپنی عاقبت بچے کے سر منڈھ دیتے ہیں یہ ایک سانحہ ہے جس کا لحاظ ہندوستان میں بہت کم کیا جاتا ہے جہاں سب سے زیادہ کرنا چاہیے

میں نے کثرت سے ہر طرح کے مضامین لکھے اور ترجمے کیے۔ دوسروں کی بیگاری

بھی کافی کی ہے۔ اکثر ایسا بھی اتفاق ہوا کہ ایک صاحب کو جو کچھ لکھ کر دیا دوسرے صاحب کی فرمائش پر اس کا جواب بھی لکھنا پڑا۔ جواب اور جواب الجواب کا یہ سلسلہ مدتوں قائم رہا۔ اس قسم کی حرکتوں سے مجھے اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ یہ کافر دماغ جو چاہے کر دکھائے خیر کو شر اور شر کو خیر ثابت کر دینا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔ اس مفسدہ پردازی کا اندازہ عام لوگ بالخصوص معصوم اور پر جوش نوجوان بالکل نہیں کر سکتے اور مارے جاتے ہیں۔

بے تکلف اور مخلص دوستوں کو خط لکھنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ ان خطوط میں مجھے سب کچھ لکھ دینے میں مطلق باک نہ ہوتا۔ یہ میرے اچھے برے خیالات اور جذبات کی سب سے اچھی ترجمانی کرتے ہیں یہاں تک کہ مجھے اس کا خیال آیا کرتا تھا کہ کہیں یہ منظر عام پر نہ آ جائیں چنانچہ ایک بار ایک عزیز دوست کی وفات کی خبر آئی تو بہت لمبا اور دشوار سفر کر کے جلد سے جلد پہنچا۔ مرحوم میرے خطوط سینت کر رکھتے تھے پہنچتے ہی کاغذات کا جائزہ لیا اور اپنے خطوط کا بنڈل قبضہ میں کر کے آگ کے حوالہ کر دیا۔ خدا کرے میرے اس قسم کے خطوط جن بزرگوں عزیزوں اور دوستوں کے پاس ہوں وہ ان کو تلف کر چکے ہوں وہ میرے اور ان کے درمیان پرائیویٹ گفتگو تھی جس کو مشتہر کرنا اخلاقی جرم ہے۔ فائدہ کوئی نہیں فتنے کا امکان زیادہ ہے میرے نزدیک اچھے خطوط بالعموم وہ ہوتے ہیں جن کو شائع نہ کیا جا سکے۔ مجھے لکھنے پر جو قدرت حاصل تھی اس کی واقعی خوشی اس وقت ہوتی تھی جب بے تکلف احباب مخلصوں اور عزیزوں کو خط لکھنے بیٹھتا۔

خطوط کا اصلی جوہر خلوص اور اعتماد ہے۔ اپنا خلوص اور دوسرے پر اعتماد خطوط میں قابلیت کا اظہار نہ کرنا چاہیے۔ شرافت، خوش طبعی اور خیر اندیشی سے کام لینا چاہیے بقول روسو علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے۔ خلوص کی کمی کبھی علم سے پوری نہیں ہوتی۔

میں نے بہت پڑھا لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ کیا پڑھا اس کے تاثرات البتہ قائم رہتے اور یہ محسوس کرتا کہ دماغ کے بعض نامعلوم سوتے کھل گئے ہیں اس کے بعد کچھ لکھنا شروع کرتا تو وہ کوئی ایسی بات ہوتی جو پہلے کبھی ذہن میں نہ آئی تھی لیکن اس کتاب میں بھی

یہ تھی جوڑ بھی تھی۔ میرے بعض مخلص دوست تھے جن کو شعوری یا غیر شعوری طور پر مدِنظر رکھ کر مضامین لکھتا کہ یہ بات دوست تک پہنچے گی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ اس نے پسند کیا تو پھر اس کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ خلق اللہ نے اسے پسند کیا یا نہیں۔ اگر اس مضمون کی دھوم مچ جاتی لیکن دوست مطمئن نہ ہوتا تو جیسے اپنی نظروں سے گر جاتا۔ میں ہندوستان کے اکثر بڑے آدمیوں سے ملا جو مذہب، سیاست، حکومت، شعر و ادب، فلسفہ و حکمت اور اس قسم کی دوسری باتوں میں ممتاز تھے۔ ملنے کے بعد اپنے اندر کوئی بہتر تبدیلی محسوس نہ کی۔ مایوسی اکثر ہوئی۔ سوا مخلص دوستوں کے جن سے مل کر ہمیشہ موجودہ سطح سے بلند ہونے کا ولولہ پیدا ہوا۔ میں ہر مذہب کا احترام کرتا تھا۔ مگر مذہبی آدمی کو بالعموم اچھا انسان نہ پایا۔ مذہبی آدمی اکثر عقاید کی خانہ پری کر کے اعمال کی طرف سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ بات نہیں سمجھنا چاہتے تھے کہ خدا نے اپنی نجات انسانوں کے سپرد نہیں کی ہے بلکہ انسانوں کی نجات انسانوں کے سپرد کی ہے۔ خدا نے عقاید و عبادت کو خدمتِ خلق کے راستے سے نازل کیا ہے اور اسی معیار سے وہ ان کو پرکھے گا۔ عقاید اور اعمال کو یہ لوگ علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا کا فرمان اور منشا علیحدہ خانوں میں نہیں بٹتا ہے۔ دنیا کیا چیز ہے۔ زندگی کا کیا مقصد ہے، انسان کیوں پیدا کیا گیا، مرنے کے بعد کیا ہوگا، ان باتوں نے مجھ میں نہ کبھی تجسس پیدا کیا نہ تشویش۔ شرافت، خوش دلی اور بہادری سے رہنا ان سب کا جواب ہے۔ انسان، انسان ہی نہیں خدا بھی ہے۔ اس کو دوسروں پر نہیں اپنے اوپر خدائی کرنے کے لیے خدا نے بھیجا ہے۔ اس لیے انسان مجبور نہیں ہے مختار ہے۔ مختار اس کو نہیں کہتے کہ جو چاہے کر ڈالے، مختار وہ ہے جو اپنی اچھی استعداد کو پورے طور پر اور آخر تک بروئے کار لاسکے۔ خواہ وہ استعداد معمولی ہو یا غیر معمولی۔ اس کے بعد ہر انجام انعام بن جاتا ہے۔ خواہ وہ المناک ہی کیوں نہ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان نے اس حد تک ترقی کر لی ہے کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر سکتا ہے۔

میرے زمانے میں ہندوستانی عورتیں اپنی اصلاح اور اپنے ترفع میں اتنی سرگرم نہ تھیں جتنی ان سے کچھ قبل ان کی پیش رو تھیں۔ یہ بڑے تعجب کی بات تھی وہ صحیح لیکن دشوار گزار

راستے کو چھوڑ کر اردگرد کی پگڈنڈیوں پر چلی گئی تھیں۔ جنگلی پھل پھول کے درمیان پکنک میں مصروف ہو گئی تھیں اور بالآخر پکنک ہی کو منزلِ مقصود قرار دے دیا۔ جس طرح اقبال نے ایک جگہ بتایا ہے کہ نماز میں سجدہ کرنے کی آزادی ملنے سے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کو آزادی نصیب ہو گئی ہے اسی طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عورتوں کو سینما اور ناچ گھر میں جو فروغ نصیب ہوا اور نوجوان شعرا اور ادیبوں نے عورتوں کو جس حیثیت سے نظموں اور افسانوں میں جگہ دی اس سے عورتیں سمجھنے لگیں کہ انھوں نے زندگی کی بازی پوری نہیں تو بڑی حد تک جیت لی۔ جنگ کی ہولناکیوں اور زندگی کے فشار میں عورت پر جو گزرتی ہے اس کا احساس وہ عجیب طور پر کرتی ہے۔ وہ اپنی مانگ بڑھنے کو اپنی بڑائی اور جیت سمجھتی تھی۔ میں نے جب دنیا کو چھوڑا اس وقت عورت کے ناموس کا خیال کم کیا جاتا تھا اس کی مدد کوئی نہیں کرتا تھا اس کو سب حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنی زندگی کی بتی کو دونوں سروں سے روشن کیے ہوئی تھی۔ روشنی یقیناً زیادہ ہو گئی تھی لیکن شمع جلد بجھنے والی تھی۔

اردو لکھنے والوں کی تعداد خاصی ترقی کر چکی تھی۔ ان میں ٹھکانے کے لکھنے والے بالعموم وہی لوگ تھے جو مغربی علوم اور طرزِ انشا سے واقف تھے۔ مغربی ادب کے مقابلے میں اردو ادب کا تذکرہ بے کار ہے۔ غزل کے علاوہ جو بدنام ہونے کے باوجود اردو شاعری کی آبرو تھی، اردو ادب کو مغربی ادب سے بہت کچھ نہیں بلکہ سب کچھ سیکھنا باقی تھا ہم جتنا چاہیں مغرب پر لعنت بھیجیں لیکن محض لعنت بھیجنے سے نہ کبھی کام بنا ہے نہ بنے گا۔ اگر اردو لکھنے والے یہ چاہتے ہیں کہ اچھے اور بڑے مصنفین کے پہلو میں جگہ ملے تو ان کو مستند مغربی مصنفین کا کثرت سے گہری نظر سے اور فراخدلی سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیا لکھنا چاہیے کہاں پہنچ کر لکھنا چاہیے اور کیسے لکھنا چاہیے، یہ باتیں مستند مغربی مصنفین کے ہاں ملیں گی لیکن یہاں ایک خطرے کا بھی اظہار کر دینا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ مغربی مصنفین کا مطالعہ ہی کافی نہیں ہے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ خود مطالعہ کرنے والا بھی سمجھدار اور معتبر ہے یا نہیں مغربی افکار کو اردو میں منتقل کرنے کا سلیقہ ہے یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ ہم کو جن مغربی مصنفین یا

ان کے اسالیب یا موضوع سے روشناس کر رہا ہے وہ ساقط الاعتبار ہوں۔

مجھے اچھا کھانے، اچھا پہننے اور تن آسانی کی زندگی پسند نہ تھی۔ یہ باتیں دراصل عورتوں اور بچوں کو زیب دیتی ہیں۔ میں سب سے کم وقت کھانا کھانے، کپڑا پہن لینے منہ ہاتھ دھونے، حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے یا سفر کے لیے آمادہ ہونے میں لیتا تھا مجھے اپنے اوپر وقت، دولت، راحت اور اس قبیل کی دوسری چیزیں صرف کرنا شاق ہوتا تھا۔ لیکن یہ چیزیں بجائے خود ناپسند نہ تھیں البتہ خواہش یہ رہتی تھی کہ اپنے بجائے ان کا فائدہ دوسروں کو پہنچاؤں۔ میری ایک کمزوری ایسی تھی جس کو میری زندگی میں شاید کسی نے نہیں پہچانا۔ وہ یہ کہ میں ڈرانے دھمکانے سے قابو میں نہیں آسکتا تھا کوئی ایسا کرتا تو نبرد آزمائی کے لیے مجھ میں بعض نامعقول خصائل اُبھرنے لگتے تھے۔ اس کا دوسرا پہلو بھی کچھ اچھا نہ تھا یعنی میں جس کو دوست سمجھتا یا جس کا مجھ پر احسان ہوتا یا جس کو میں مجبور و مظلوم سمجھتا تھا، اس کی حمایت میں خواہ وہ بے جا کیوں نہ ہو عقل اور اخلاق دونوں سے گزر جانے میں تامل نہ کرتا۔ الکشن وغیرہ میں ووٹ اپنے دوست ہی کو دیتا خواہ فریقِ مخالف آسمان ہی سے کیوں نہ اُترا ہو۔

مجھے زندگی میں ایک چیز کی بڑی تمنّا رہی جو میرے اطمینان کے مطابق پوری نہ ہوئی یعنی یا تو میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ میں حاجت مند کی اپنے حوصلے یا اطمینان کے مطابق مدد کرسکتا یا میرا ایسا کوئی دولت مند دوست ہوتا کہ جب کبھی اس قسم کی ضرورت پیش آتی تو وہ میری خاطر اسے پوری کر دیتا۔ میں خدا کی ناشکری نہ کروں گا۔ اس بارۂ خاص میں میرے دوستوں ہی نے نہیں بلکہ میری تحریک پر بعض اجنبیوں نے غیر متوقع طور پر مدد کی لیکن واقعہ یہی ہے کہ میری یہ تمنّا اس حد تک پوری نہ ہوئی جس حد تک میں اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں خدا سے انھیں ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد چاہتا ہوں میری زندگی کا کوئی راز ایسا نہیں ہے جس سے وہ لوگ واقف نہ ہوں جن کو اس راز سے واقف ہونے کا حق حاصل تھا۔ میں دوستی چھپا سکتا تھا، دشمنی کبھی نہ چھپا سکا۔ حماقتیں میں نے اکثر کی ہیں سازش کبھی نہیں کی۔ علی گڑھ میں رہ کر میری عادت ہوگئی تھی کہ ہر کام خواہ وہ کتنا ہی ضروری

کیوں نہ ہو اس وقت کیا جائے جب اس کام کا وقت بالکل ہی گزر جانے پر آ گیا ہو۔ کام ہمیشہ وقت ہی پر ہو کر رہا لیکن اس کے لیے جو بے تکی اور بے پناہ جدوجہد کرنا پڑتی تھی اس سے عہدہ برآ ہونے کا احساس بھی بڑے مزے کا ہوتا۔ اس سے مجھ میں وہ اعتماد پھر عود کر آتا جس کو میں کسی نہ کسی وجہ سے کھو چکا ہوتا تھا۔ اس سے میں اپنے آپ میں نوجوانوں کا حوصلہ اور تب و تاب محسوس کرنے لگتا۔ یہ وہ خود فریبی تھی جس نے مجھے دنیا کے آلام و مصائب کے مقابلہ میں مستعد اور مگن رکھا۔ میں کام اس وقت زیادہ کرتا تھا جب فرصت کم ہو، موسم خراب ہو اور طبیعت بھی اچھی نہ ہو۔ ایسے مواقع پر کام میں لگ جانا یوں مفید ہوتا کہ میرا ذہن تکلیف دہ اور ناسازگار حالات کی طرف منتقل نہیں ہوتا تھا۔ کام کرنا وہ نشہ ہے جس میں نہایت آسانی سے ہر طرح کے مصائب غرق کیے جا سکتے ہیں۔ جب موسم خوش گوار ہوتا اور طبیعت بحال ہوتی تو مجھے کام کرنا مطلق پسند نہ آتا۔ میری لغت میں تعطیل منانے کے یہ معنی نہ تھے کہ کسی کو مزے کا خط لکھا جائے، گھر سے باہر قدم نہ نکالا جائے، باغ میں کام کیا جائے، گھر کی صفائی کی جائے، ایک آدھ وقت کا کھانا ترک کر دیا جائے یا دو چار وقت کا کھا لیا جائے، بیوی بچوں کو بھی کوئی کام نہ کرنے دیا جائے، جو ملنے آئے اس سے اس طرح سے بچا جائے۔ غسل کرنے کا اہتمام نہ کیا جائے اور صرف ہاتھ پاؤں کو جھاڑ پونچھ لینے پر اکتفا کی جائے۔ بڑا قرض لے کر چھوٹے چھوٹے قرض ادا کیے جائیں اور جو بچ رہے اسے لے کر بازار چلا جائے اور بے ضرورت چیزیں خرید لائی جائیں۔ مجھے قرض لینے اور اس کے ادا کرنے کی خوشی ہوتی تھی۔ قرض کو فنونِ لطیفہ میں سمجھتا تھا کب لیا جائے، کس سے لیا جائے، کس طرح لیا جائے۔ اس سے کس طرح دوستی بڑھائی جائے اور دشمنی گھٹائی جائے۔ میرے ایک دوست تھے جو کبھی کبھی بے وجہ مجھ سے خفا یا اپنی بیوی کی طرف سے مغموم ہو جایا کرتے تھے۔ جب کبھی میں ان کو ایسی حالت میں پاتا کسی بہانے سے قرض مانگ بیٹھتا، وہ دے دیتے اور ہم دونوں کی خود اعتمادی بحال ہو جاتی۔

زیادہ سونا اور زیادہ کھانا میرے نزدیک نحوست اور بدتوفیقی تھا۔ یہ حرکتیں صرف مریضوں اور لیڈروں کے لیے روا رکھی جا سکتی ہیں۔ دنیا اور اس کے کاروبار اتنے دلکش

تھے اور ہر آن انسان کو بہتر و برتر بنانے میں اس درجہ معاون ہوتے تھے کہ میں سونے میں ان کو کھونا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ سونا محض سونے کی خاطر میرے نزدیک فعلِ عبث تھا دنیا کو دیکھنے اور برتنے میں جو لطف اور ذمہ داری ہے اس کو آدمی سمجھ لے تو میرا خیال ہے کہ وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی سونے پر آمادہ نہ ہو۔ سیاسی سرگرمیوں کی خاطر مجھے جیل خانہ جانا پسند تھا نہ جاہ و منزلت گوارا تھی۔ میں اس آدمی سے بہت خوش ہوتا تھا جو مجھ سے کم سے کم ملتا اور زیادہ سے زیادہ کام لیتا۔ مجھے درباردار ی سے سخت نفرت تھی۔ درباردار ی کے وہ لوگ محتاج ہوتے ہیں جو خود اپنی نظروں میں حقیر ہوتے ہیں اور اس ذہنی عذاب سے بچنے کے لیے دوسروں کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔ اپنا نفس لعنت بھیجتا ہے تو کرایہ کے قصیدہ خواں اپنے اردگرد جمع کر لیتے ہیں۔ طوائف سے ہمدردی بھی کی جا سکتی ہے، دربار دار پر صرف لعنت بھیجی جا سکتی ہے۔

میرے زمانے میں سینما کو بڑی ترقی اور اہمیت حاصل تھی۔ سب سے کم سینما دیکھنے والوں میں میرا بھی شمار تھا۔ میں تصویریں دیکھنا گناہ نہیں سمجھتا تھا لیکن مجھے اچھا مضمون لکھنے اور بیوی بچوں یا دوستوں اور دشمنوں میں بیٹھ کر نئی تصویریں بنانا زیادہ پسند تھا۔ ممکن ہے میں نے اچھے ہندوستانی فلم نہ دیکھے ہوں اسی سبب سے میری رائے یہ ہو کہ قدیم ہندوستانی تھیٹر اور موجودہ ہندوستانی فلم میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے دونوں کے اداکار قولنج یا ہسٹیریا میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ وہ اداکاری اور حرکاتِ میمونی میں بہت کم فرق کر سکتے تھے۔ میں نے سینما کے اداکاروں کو دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہے تھے لیکن رونے کے دوران میں گاتے اس اہتمام و مشاقی سے تھے کہ تال و سم میں ذرہ برابر فرق نہ آنے پاتا۔ یہ کیوں کر ممکن تھا۔ سینما کمپنیاں روپیہ کمانے کے فن میں طاق تھیں۔ وہ فن کے رموز سے بے بہرہ اور زندگی کے آداب سے لاعلم تھیں۔ ان کے ہاں زندگی عبارت تھی صرف حسن و عشق سے۔ عورتوں کا حسن اور عورتوں سے عشق۔ حسن و عشق کا یہی تصور اور اتنا ہی سا تصور غالباً جانوروں کا بھی ہوتا ہے۔ مجھے سینما سے اتنی دلچسپی ضرور تھی کہ جو باتیں دنیا کے پردے پر نظر نہ آتی تھیں وہ اکثر سینما کے پردے پر

نظر آجاتی تھیں۔

عورتوں کے بارے میں میری کچھ بھی رائے کیوں نہ ہو جنسی میلانات کو بڑی اچھی چیز سمجھتا تھا، اور جو ایسا نہیں سمجھتا تھا اس کو کسی جنس میں نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن جنسی میلانات کو بدوضعی کا بہانہ قرار نہیں دے سکتا تھا ان میلانات کی موجودگی مستحسن ہے ان کا مظاہرہ مذموم ہے۔ ہر انسانی فعل کا محرک جنسی میلان ہو سکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک جنسی میلان کا ارتکاب نہ کر لیا جائے اس وقت تک کوئی کام شروع نہ کیا جائے اور کوئی کام کام نہیں جب تک اس پر جنسی میلانات کی مثبت کاری نہ ملے۔ ہر بات خدا سے منسوب کی جاتی ہے لیکن محض اسی بنا پر کسی عدالت یا مولوی نے ملزم یا مجرم کو معاف نہیں کیا ہے میلان اور اعلان ہم قافیہ ہوں تو ہوں ہم معنی تو نہیں ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے بڑی بے اطمینانی تھی۔ ان میں مقتدی سے زیادہ امام پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ نماز کے اتنے قائل نہیں رہے تھے جتنے جا نماز کے۔ وہ بیماری کو علاج صبر و پرہیز سے دور کرنے کے بجائے اس کو پروپیگنڈا بنانا زیادہ مفید سمجھنے لگے تھے۔ وہ جنگ کے لیے کیل کانٹے سے تیار ہونے کے بجائے دشمن کو اکسانے پر زیادہ مائل تھے اس سے بڑھ کر ناعاقبت اندیشی اور کیا ہو سکتی تھی۔

میں جب دنیا سے گزرا ہوں تو ذہن میں یہ اندیشہ بھی جاگزیں تھا کہ مسلمان دشمن کو شاید ہزیمت دے دیں لیکن مالِ غنیمت سے ہزیمت یقیناً کھا جائیں گے۔

میرے زمانے میں ہندو مسلمان ایک دوسرے سے سخت بیزار تھے دونوں اس کے درپے تھے کہ کس طرح اور کتنے عناصر ایسے دریافت کیے جا سکتے تھے جو دونوں کو ایک دوسرے سے بیزار رکھنے میں معین ہو سکتے تھے۔ یہ فکر کسی کو نہ تھی کہ ایسی باتیں بھی دریافت کرنی چاہئیں جن پر تھوڑا بہت اتفاق ہو سکتا ہو۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ نہ کر سکتے تھے تو اچھے ہمسایہ کس طرح بن سکیں گے۔ ناخداؤں میں جنگ چھڑ چکی تھی مسافر سراسیمہ تھے اور طوفان کا سناٹا پھیلنے لگا تھا۔

خیال اور الفاظ میں کس کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ ایک دلچسپ لیکن مشکل مسئلہ

ہے۔ لکھنے کے دوران میں مجھے اس کی دقّت محسوس نہ ہوئی۔ آدمی سوچتا الفاظ ہی میں ہے اور سوچنے اور بات کے متعین کرنے میں الفاظ بڑے معاون ہوتے ہیں لیکن اکثر ایسا بھی محسوس کیا ہے جیسے دل میں کوئی بات بغیر الفاظ کے بھی آگئی ہو۔ اسے ذہنی کیفیت کہہ سکتے ہیں۔ یہ کیفیت یا تاثر "معنیِ بے لفظ" ہے۔ اس کو مختلف طور سے ظاہر کیا جا سکتا ہے لیکن بے کم وکاست بیان کر دینا ناممکن ہے جس کو "مکمّل اظہار" کہتے ہیں، میرے نزدیک وہ ناممکن الوقوع ہے۔ یہی سبب ہے کہ اظہارِ کیف و خیال میں آرٹسٹ کو بڑی کاوش کرنا پڑتی ہے۔ اس کاوش میں جس حد تک کامیابی ہوتی ہے اسی حد تک اور اسی معیار سے آرٹسٹ کے کمالِ فن کا درجہ متعیّن ہوتا ہے۔ خیال یا کیفیت کے اظہار کے لیے الفاظ آواز حرکت، رنگ وغیرہ کے سانچے بنے ہوئے ہیں ظاہر ہے ان سانچوں کا آرٹسٹ کے ہاں کیا درجہ ہوگا۔ سانچوں کا صحیح انتخاب ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ بڑے سے بڑے فن کار کے بس میں بھی پورے طور پر نہیں آتے۔ اس لیے کہ یہ سانچے یا وسائل محدود ہیں اور وارداتِ ذہنی لامحدود۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ اور باتوں سے قطع نظر شاعر تشبیہ و استعارے اختراع کرتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خیال کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن الفاظ کا درجہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ الفاظ کے استعمال میں اگر احتیاط ملحوظ رکھی جائے تو دنیا کا شور و فتن بڑی حد تک اعتدال پر لایا جا سکتا ہے۔ خیال کی آمد میں الفاظ کی آورد اگر سب کچھ نہیں تو بہت کچھ ہے۔

لکھنے میں ظاہر ہے ارادہ کو بھی دخل ہوتا ہے۔ میں خود بھی ارادہ کرتا تھا لیکن دراصل لکھنے میں میرے ارادہ کو اتنا نہیں جتنا ایک خاص لمحہ کو دخل ہوتا تھا۔ البتہ یہ کبھی نہ دریافت کر سکا کہ وہ لمحہ کب اور کیسے میسر آ سکتا تھا۔ میں لکھنے میں ابتدا، ارتقا اور عروج وغیرہ قسم کے مراحل و مراتب ملحوظ نہیں رکھتا تھا مخلصانہ اور بے تکلف گفتگو میں ان کی پابندی نہیں کی جا سکتی اور نہ کرنا چاہیے۔ مجھے مضمون نگاری کے مقرّرہ "آداب تسلیمات" بھی نہیں آتے تھے۔ میں قارئین کو اپنا اچھا اور بے تکلّف دوست سمجھ کر گفتگو کرنا شروع کرتا تھا۔ اچھا اور بے تکلّف دوست ہی نہیں بلکہ اچھا اور بے تکلّف خاندان بھی جس میں جوان،

بوڑھے، بیمار، تندرست، ملول، مسرور سبھی ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس حلقے میں ایک اچھے رفیق کی حیثیت سے پیش کرتا تھا۔ اچھی گفتگو پروگرام کے ماتحت نہیں ہوا کرتی۔ گفتگو کرنا ایک سفر کے مانند ہے جس میں مختلف مناظر، مختلف اشخاص اور مختلف حالات و حوادث سے سابقہ ہوتا ہے۔ اچھا آدمی ہم سفروں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے اور ان کے رنج و راحت کو اپنے رنج و راحت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اچھے آدمیوں ہی کی نہیں اچھے لکھنے والوں کی بھی پہچان ہے۔ لکھنے میں اور گفتگو کرنے میں بھی رونا گڑگڑانا، حکم چلانا یا قابلیت جتانا نااہلوں کا کام ہے۔ میرے مضامین غزل کی نوعیت کے ہوتے تھے مربوط اور مسلسل نظم کی مانند نہیں۔ ان مضامین میں جو باتیں غیر متعلق اور بہکی بہکی معلوم ہوتی ہیں وہ میرے فن کی شریعت کے مطابق تھیں۔ میں خود نہیں بہکتا تھا دوسروں کو بہکنے کی فرصت دیتا تھا۔ عقل کی باتیں دیر تک نہ سنی جا سکتی ہیں نہ سنائی جا سکتی ہیں۔

نئے اور پرانے کی آویزش ازل سے چلی آتی ہے لیکن جب میں نے سفرِ آخرت کیا ہے اس وقت بوڑھوں اور نوجوانوں میں اختلافات کی جو خلیج حائل ہو گئی تھی وہ ناقابلِ عبور حد تک عمیق اور گہری ہو گئی تھی جس کی مثال شاید ہی تاریخ میں ملتی ہو۔ نوجوانوں کا یہ سمجھنا کہ وہ کبھی بوڑھے نہ ہوں گے، سمجھ میں آنے کی بات تھی، البتہ یہ بات تعجب اور افسوس کی تھی کہ بوڑھے اپنی جوانی بھول چکے تھے ان کو جوانوں سے چڑ ہو گئی تھی۔ یہ بوڑھوں کی بھول تھی۔ بوڑھوں کا سابقہ دو عالم گیر جنگوں سے ہو چکا تھا لیکن وہ ان انقلابات کے مطالبات اور مطابات دونوں سے ناآشنا تھے۔ نوجوانوں سے مجھے ہمدردی تھی وہ ایک جنگ کی پیداوار تھے اور دوسری جنگ میں کام آ گئے تھے۔ وہ جنگ سے زیادہ اہم اور سنگین حادثہ یعنی صلح کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ جو بات سوچ سکتے تھے وہ یہ کہ نوجوان کے لیے ایک نئی دنیا بنائی جائے خواہ وہ انسانوں کے موافق آئے یا نہ آئے۔ وہ اپنی نجات بغاوت میں دیکھتے تھے۔ انانیت کی معراج شہادت میں اُن کو نظر نہ آتی تھی۔ ممکن ہے وہ ایک نئی دنیا پیدا کر سکیں

لیکن بعض معتبر قدروں کا احترام ان کے دلوں سے اٹھ چکا تھا۔ اس صورتِ حال کے پیدا کرنے میں بوڑھوں کو یقیناً دخل تھا۔ بوڑھوں نے گزشتہ کا سہارا پکڑا تھا۔ نوجوان شراب میں غم غلط کر رہے تھے۔

چارپائی

چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسہ، آفس، جیل خانے، کونسل یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں۔ دعا اور بھیک بھی مانگتے ہیں۔ کبھی فکرِ سخن کرتے ہیں اور کبھی فکرِ قوم، اکثر فاقہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا برطانیہ کو آئی سی ایس پر، شاعر کو قافیہ پر یا طالب علم کو غل غپاڑے پر۔

چارپائی کی پیڑھی دور چل کر دیوجانس کلبی کے خم سے جا ملتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تمام دنیا سے منہ موڑ کر دیوجانس ایک خم میں جا بیٹھا تھا۔ ہندوستانی تمام دنیا کو چارپائی کے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ ایک نے کثرت سے وحدت کی طرف رجوع کیا۔ دوسرے نے وحدت میں کثرت کو سمیٹ لیا۔

ہندوستانی ترقی کرتے کرتے تعلیم یافتہ جانور ہی کیوں نہ ہو جائے اس سے اس کی چارپائیت نہیں جدا کی جا سکتی۔ اس وقت ہندوستان کو دو معرکے درپیش ہیں۔ ایک سوراج کا دوسرا روشن خیال بیوی کا۔ دراصل سوراج اور روشن خیال بیوی دونوں ایک ہی مرض کی

دو علامتیں ہیں۔ دونوں چارپائیت میں مبتلا ہیں۔ سوراج تو وہ ایسا چاہتا ہے جس میں انگریز کو حکومت کرنے اور ہندوستانی کو گالی دینے کی آزادی ہو۔ اور بیوی ایسی چاہتا ہے جو گریجویٹ ہو لیکن گالی نہ دے۔

اس طور پر ہندوستانی شوہر اور تعلیم یافتہ بیوی کے درمیان جو کھینچ تان ملتی ہے اس کا سبب یہ بھی ہے کہ شوہر چارپائی پر سے حکومت کرنا چاہتا ہے اور بیوی ڈرائنگ روم سے کھنٹی بجاتی ہے۔ روشن خیال بیوی شہرت کی آرزومند ہوتی ہے۔ دوسری طرف شوہر یہ چاہتا ہے کہ بیوی تو صرف فردِ خاندان ہونے پر صبر کرے اور خود فخرِ خاندان نہیں بلکہ فخرِ کائنات قرار دیا جائے۔

موتی لال نہرو رپورٹ سے پہلے ہندوستانیوں پر دو مصیبتیں نازل تھیں۔ ایک ملیریا کی دوسری مس میو المعروف بہ مادرِ ہند کی۔ ملیریا کا انسداد کچھ تو کونین سے کیا گیا بقیہ کا کثرتِ اموات سے۔ مس میو کے تدارک میں ہندو مسلمان دونوں چارپائی پر سر بزانو اور حیرانوں پر دست دگریباں ہیں۔ نہرو رپورٹ اور مادرِ ہند دونوں میں ایک نسبت ہے ایک نے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کو اہمیت نہ دی۔ دوسری نے ہندوؤں کے معاشرتی رسوم و روایات کی توہین کی!

مادرِ ہند کے بارے میں چارپائی نشینوں کی یہ رائے ہے کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے ان کو ہندوستانیوں سے زیادہ مس میو کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع ملا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر سارے ہندوستان سے شمار و اعداد اور مواد اکٹھا کرنے کے بجائے موصوفہ نے صرف ہم ہندوستانیوں کی چارپائی کا جائزہ لیا ہوتا تو ان کی تصنیف اس سے زیادہ دلچسپ ہوتی جتنی کہ اب ہے۔

چارپائی ہندوستانیوں کی آخری جائے پناہ ہے۔ فتح ہو یا شکست وہ رخ کرے گا ہمیشہ چارپائی کی طرف۔

پھر وہ چارپائی پر لیٹ جائے گا۔ گائے گا، گالی دے گا یا مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات پڑھنا شروع کر دے گا۔

فنِ جنگ یا فنِ صحافت کی رو سے آج کل اس طرح کے وظائف ضروری اور نفع بخش خیال کیے جاتے ہیں جس طرح ہر مالدار شریف یا خوش نصیب نہیں ہوتا اسی طرح ہر چارپائی چارپائی نہیں ہوتی۔ کہنے کو تو پلنگ پلنگڑی، چھپر کھٹ مسہری، سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے لیکن سیاسی لیڈروں کے سیاسی اور مولویوں کے مذہبی تصور کے مانند چارپائی کا صحیح مفہوم اکثر متعین نہیں ہوتا۔

چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے اس لیے ہر کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ ایک ریاست میں کوئی صاحب "ولایت پاس" ہوکر آئے۔ ریاست میں کوئی آسامی نہ تھی جوان کو دی جا سکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے راجہ صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے مل کر آئے ہیں۔ راجہ صاحب ہی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ریاست میں ہل چل مچ گئی۔ اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رخصت پر گئے ہوئے تھے۔ یہ ان کی جگہ پر تعینات کر دیے گیے۔ کچھ دنوں بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجنیر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ ان کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے اور اپنے ولیعہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنوا دینے کی فکر میں تھے۔

یہی حالت چارپائی کی ہے فرق صرف یہ ہے کہ ان ملازم صاحب سے کہیں زیادہ کارآمد ہوتی ہے؛ فرض کیجیے آپ بیمار ہیں سفرِ آخرت کا سامان میسر ہو یا نہ ہو اگر چارپائی آپ کے پاس ہے تو آپ کو دنیا میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دوا کی پڑیہ تکیے کے نیچے۔ جوشاندہ کی دیگچی سرہانے رکھی ہوئی۔ بڑی بیوی طبیب چھوٹی بیوی خدمت گزار۔ چارپائی سے ملا ہوا ول و براز کا برتن۔ چارپائی کے نیچے میلے کپڑے۔ بچوں کے کھلونے جھاڑو۔ آتش جو۔ روئی کے پھائے۔ کاغذ کے ٹکڑے۔ مچھر، جھینگے گھر یا محلے کے دو ایک بچے جن میں ایک آدھ زکام خسرے میں مبتلا۔ اچھے ہو گئے تو بیوی نے چارپائی کھڑی کر کے غسل کرا دیا ورنہ آپ کے دشمن اسی چارپائی پر لبِ گور لائے گئے۔

ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو ڈرائنگ روم سونے کا کمرہ، غسلخانہ، قلعہ، خانقاہ۔

دواخانہ. صندوق. کتاب گھر. شفا خانہ. سب کی حیثیت کبھی کبھی بہ یک وقت ورنہ وقت وقت پر حاصل رہتی ہے. کوئی مہمان آیا. چارپائی نکالی گئی. اس پر ایک نئی دری بچھادی گئی جس کے تہ کے نشان ایسے معلوم ہوں گے جیسے کسی چھوٹی سی آراضی کو مینڈول اور نالیوں سے بہت سے مالکوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مہمان صاحب معہ اچکن. ٹوپی. بیگ بغچی کے بیٹھ گئے. اور تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہو گیا کہ مہمان بیوقوف ہے یا میزبان بدنصیب اچارپائی ہی پر ان کا منہ ہاتھ دھلوایا اور کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چارپائی پر یہ سو رہیں گے. سو جانے کے بعد ان پر سے مچھر مکھی اسی طرح اڑائی جائے گی جیسے کوئی پھیری والا اپنے خونچہ پر سے جھاڑ ہ نما مورچھل سے مکھیاں اڑا رہا ہو.

چارپائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلایا جائے گا. جس پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی والے بیگتی اور گالیاں سنتی رہیں گی. کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر چارپائی پر آلو چھیلے جائیں گے. ملازمت میں پنشن کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رخصت جمع ہوئی رہتی ہے اس کو لے کر ملازمت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں- اسی طرح چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی کال کوٹھری میں داخل کر دیتے ہیں اور اس پر سال بھر کا پیاز کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ہے. ایک دفعہ دیہات کے ایک میزبان نے پیاز ہٹا کر اس خاکسار کو ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چارپائی پر اسی کال کوٹھری میں بچھا دیا تھا اور پیاز کو چارپائی کے نیچے اکٹھا کر دیا گیا تھا. اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ہی طبق روشن ہو گئے تھے جتنے ساری پیازوں میں چھلکے تھے اور وہ یقیناً چودہ سے زیادہ تھے.

فراق اور وصال. بیماری و تندرستی. تصنیف و تالیف. سرقہ اور شاعری سب سے چارپائی ہی پر نپٹتے ہیں. بچے بوڑھے اور مریض اس کو بطور پاخانہ غسل خانہ کام میں لاتے ہیں. کبھی ادوان کٹ وہ کردی گئی کبھی بنا ہوا حصہ کاٹ دیا گیا اور کام بن گیا. بچتہ فرش پر گھسیٹیے تو معلوم ہو کوئی ملٹری ٹینک مہم پر جا رہا ہے یا بجلی کا تڑاقا ہو رہا ہے. کھٹملوں سے نجات پانے کے لیے جو تدبیریں کی جاتی ہیں اور جس جس آسن میں چارپائی نظر آتی ہے یا جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے ان پر غور کر لیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستانی بیوی کا تخیل ہندوستانیوں نے

چارپائی ہی سے لیا ہے۔

دو چارپائیاں اس طور پر کھڑی کر دیں کہ ان کے پائے آمنے سامنے ہو گئے، ان پر ایک کمبل، دری یا چادر ڈال دی کمرہ تیار ہو گیا۔ گھر میں بچوں کو اس طرح کا حجرہ بنانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ یہاں وہ ان تمام باتوں کی مشق کرتے ہیں جو ماں باپ کو کرتے دیکھتے ہیں۔ ایٹن اور ہیرو انگلستان کے دو مشہور پبلک اسکول ہیں۔ ان کے کھیل کے میدان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ واٹرلو کی جنگ یہیں جیتی گئی تھی۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ہندوستان کی ساری مہم ہم ہندوستانی چارپائی کے اسی گھروندے میں سر کر چکے ہوتے ہیں۔

برسات کی سڑی گرمی پڑ رہی ہو کسی گھریلو تقریب میں آپ دیکھیں گے کہ محلہ نہیں سارے قصبہ کی عورتیں خواہ وہ کسی سائز، عمر، مزاج یا مصرف کی ہوں، رونق افروز ہیں۔ اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر عورت کی گود میں دو ایک بچے اور زبان پر پانچ سات کلماتِ خیر ضرور ہوں گے۔ کتنی زیادہ عورتیں کتنی کم جگہ میں آجاتی ہیں، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا جب تک کہ چارپائی کے بعد کسی یکّہ اور تانگہ پر ان کو سفر کرتے نہ دیکھ چکا ہو۔ یہ اللہ کی مصلحت اور ایجاد کرنے والے کی پیش بینی ہے کہ ہانکنے والے اور گھوڑے دونوں کی پشت سواریوں کی طرف ہوتی ہے اگر کہیں یہ سواریوں کو دیکھتے ہوتے تو یقیناً غش کھا کر گر پڑتے۔

چارپائی ایک اچھے بکس کا بھی کام دیتی ہے۔ تکیہ کے نیچے ہر قسم کی گولیاں جن کے استعمال سے آپ کے سوا اور کوئی واقف نہیں ہوتا۔ ایک آدھ روپیہ، چند دھیلے پیسے، جنتری، کتابیں، رسالے، جاڑے کے کپڑے، تھوڑا بہت ناشتا، نقش سلیمانی، فہرست دواخانہ، ضمن جعلی دستاویز کے کچھ مسودے۔ یہ سب چارپائی میں آباد ملیں گے۔ میں ایک ایسے صاحب سے واقف ہوں جو چارپائی پر لیٹے لیٹے ان میں سے ہر ایک کو اجالا ہو یا اندھیرا اس صحت کے ساتھ آنکھیں بند کر کے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے جیسے حکیم نابینا صاحب مرحوم اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوائیں نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔

حکومت بھی چارپائی ہی پر سے ہوتی ہے۔ خاندان کے کرتا دھرتا، چارپائی ہی پر براجمان

ہوتے ہیں، وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور ہر گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔ آلاتِ سزا میں ہاتھ پاؤں۔ زبان کے علاوہ ڈنڈا۔ جوتا۔ تاملوٹ بھی ہیں جنھیں اکثر پھینک کر مارتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ توقّف کرنے میں غصّہ کا تاؤ مدّہم نہ پڑ جائے اور ان آلات کو مجرم پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے اوپر استعمال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہونے لگے۔

چارپائی ہی کھانے کا کمرہ بھی ہوتی ہے۔ باورچی خانہ سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانسات چھوٹے بڑے بچّے اتنی ہی مرغیاں۔ دو ایک کتّے۔ بلّی اور بے شمار مکھیّاں آپہنچیں۔ سب اپنے قرینے سے بیٹھ گئیں۔ صاحبِ خانہ صدرِ دسترخوان ہیں۔ ایک بچّہ زیادہ کھانے پر مار کھاتا ہے دوسرا بدتمیزی سے کھانے پر تیسرا کم کھانے پر چوتھا زیادہ کھانے پر اور بقیہ اس پر کہ ان کو مکھیّاں کھائے جاتی ہیں۔ دوسری طرف بیوی مکھّی اڑاتی جاتی ہے۔ اور شوہر کی بدزبانی سنتی اور بدتمیزی سہتی جاتی ہے۔ کھانا ختم ہوا۔ شوہر شاعر ہوئے تو ہاتھ دھوکر فکرِ سخن میں چارپائی ہی پر لیٹ گئے۔ کہیں دفتر میں ملازم ہوئے تو اس طرح جان لے کر بھاگے جیسے گھر میں آگ لگی ہے اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگے۔ بیوی بچے بدن دبانے اور بددعائیں سننے لگے۔

کوئی چیز خواہ کسی قسم کی ہو کہیں گم ہوئی ہو۔ ہندوستانی اس کی تلاش کی ابتدا چارپائی سے کرتا ہے۔ اس میں ہاتھی، سوئی، بیوی، بچے، موزے، مرغی چور کسی کی تخصیص نہیں۔ رات میں کھٹکا ہوا اس نے چارپائی کے نیچے نظر ڈالی، خطرہ بڑھا تو چارپائی کے نیچے پناہ لی۔ زندگی کی شاید ہی کوئی ایسی سرگرمی ہو جو چارپائی یا اس کے آس پاس نہ انجام پائی ہو۔

چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی مانند ڈھیلی ڈھالی شکستہ حال بے سر و سامان لیکن ہندوستانیوں کی طرح غالب اور حکمراں کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے کے لیے آمادہ۔ کوچ اور صوفے کے دلدادہ اور ڈرائنگ روم

کے اسیر اس راحت و عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو چار پائی پر میسر آتی ہے ۔ شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کرلی ہیں ۔ مثلاً سچے دوست ، شرافت ، فراغت اور گوشۂ چمن ۔ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے عیش و فراغت کی فہرست اس سے مختصر ہونی چاہیے ۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چار پائی ان تمام لوازم کو پورا کرسکتی ہے ۔

بانوں کی ٹوٹی ہوئی چار پائی ہے جسے مکا کے کھیت میں بطور مچان باندھ دیا گیا ہے ۔ ہر طرف جھومتے لہلہاتے کھیت ہیں ۔ بارش نے گرد و پیش کو شگفتہ و شاداب کردیا ہے دور دور جھیلیں چمکتی ، جھلکتی نظر آتی ہیں جن میں طرح طرح کے آبی جانور اپنی اپنی بولیوں سے برسات کی عمل داری اور مزیداری کا اعلان کرتے ہیں ۔

مچان پر بیٹھا ہوا کسان کھیت کی رکھوالی کر رہا ہے اس کے یہاں نہ آسائش ہے نہ آرائش ، نہ عشق و عاشقی ، نہ علم و فضل ، نہ دولت و اقتدار لیکن یہ سب چار پائی پر بیٹھے ہوئے اسی کسان کی محنت کا کرشمہ ہیں ۔ پھر ایک دن آئے گا جب اس کی پیداوار کو چور ، مہاجن یا زمیندار لوٹ لیں گے اور اسی چار پائی پر اس کو سانپ ڈس لے گا اور قصّہ پاک ہوجائے گا ۔

برسات ہی کا موسم ہے ۔ گاؤں میں آموں کا باغ ۔ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں ۔ کوئل کوکتی ہے ، ہوا لہکتی ہے ۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں دھوم مچا رہی ہیں ۔ کہیں کوئی پکا ہوا آم ڈال سے ٹوٹ کر گرتا ہے ۔ سب کے سب جھپٹتے ہیں ۔ جس کو مل گیا وہ ہیرو بن گیا جس کو نہ ملا اس پر سب نے ٹھٹھے لگائے ۔ یہی لڑکے لڑکیاں جو اس وقت کسی طرح قابلِ التفات نظر نہیں آتیں کسے معلوم آگے چل کر زمانہ اور زندگی کی کن نیرنگیوں کو اجاگر کریں گے ۔ کتنے فاتح کریں گے ، کتنے فاتح بنیں گے ، کتنے نامور اور نیک نام ، کتنے گمنام و نافرجام اور یہ خاکسار ایک کھری چار پائی پر اس باغ میں آرام فرما رہا ہے ۔ چار پائی باغبان کی ہے ۔ باغ کسی اور کا ہے ۔ لڑکے لڑکیاں گاؤں کی ہیں ۔ میرے حصّہ کا صرف آم ہے ۔ ایسے میں جو کچھ دماغ میں نہ آئے تھوڑا ہے ۔ یا جو تھوڑا دماغ میں ہے وہ بھی نکل جائے تو کیا تعجب !

پھر عالمِ تصوّر میں ایسی کائنات تعمیر کرنے لگتا ہوں جو صرف میرے لیے ہے جو میرے

ہی اشارے پر نبتی بگڑتی ہے مجھے خالق کا درجہ حاصل ہے. اپنے مخلوق ہونے کا وہم بھی نہیں گذرتا. نہ اس کا خیال کہ زمانہ کسے کہتے ہیں، نہ اس کی پرواکہ زندگی کیا ہے. دوسروں کو ان کا اسیر دیکھ کر چونک پڑتا ہوں. پھر یہ محسوس کر کے کہ میں ان لوگوں سے اور خود زمانہ اور زندگی سے علیحدہ بھی ہوں. کچھ دیر کے لیے اونگھنے لگتا ہوں. ممکن ہے اونگھنے میں پہلے سے مبتلا ہوں.

پاسبان

پنشن اور پاسبان نے غالب کی زندگی تلخ کردی تھی اور غالب کے پرستاروں نے بیماری۔ ایک صاحب فرماتے ہیں غالب قومی شاعر تھے۔ دوسرے کہتے ہیں حیوانِ ظریف تھے۔ تیسرے کا قول ہے مُلہمِ غیب تھے۔ چوتھے کا فیصلہ ہے فلسفی تھے پانچویں کا کہنا ہے مہمل تھے! ممتحن پوچھتا ہے کیا تھے؟ طلبہ جواب دیتے ہیں۔

شامتِ اعمالِ ما صورتِ "غالب" گرفت

خود غالب کی شامت پاسبان تھے۔ جیساکہ خود کہتے ہیں،

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

بایں ہمہ غالب شاعری کو نہیں سپہ گری کو ذریعۂ عزت سمجھتے تھے۔ شاعری کی تکمیل کے لیے ممکن ہے پانچویں پشت تک کی مدت کافی ہو۔ سپہ گری البتہ غالب سے آخری پشت میں نبھ نہ سکی۔ فرماتے ہیں،

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا!

بات یہ ہے کہ میں غالب نہ ہونے کے باوجود پاسبان کے سامنے اپنے آپ کو گداسا محسوس کرنے لگتا ہوں لیکن اس کے قدم لینے کی غلطی کبھی نہیں کی. آپ کسی ایسے شخص یا موقع کا تصور نہیں کر سکتے جو پاسبان سے خالی ہو. اس بیان پر ایک منطقی نے گرفت کی فرمایا دو چیزیں ایک جا ایک وقت میں کیسے موجود ہوسکتی ہیں عرض کیا کیوں نہیں جیسے علم اور حماقت فرمایا، کیسے ہیں نے کہا جیسے بعض منطقی ! اتنے میں ایک بزرگ بول اٹھے انجام کچھ بھی ہو ہندوستان کو پولیس یا پاسبان سے نجات نہیں منطقی نے کہا یہ بحث غیر متعلق ہے. ہندوستان کی نجات میں پولیس کا دخل کیسا ! ایک خاں صاحب شطرنج کھیل رہے تھے، بولے "برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا" یہ کہتے ہوئے مہرے کو دباکر آگے کھسکایا پھر بولے "برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا"

منطقی نے احتجاج کیا، خاں صاحب میرا آپ کا رشتہ وطن کا ہے خون کا نہیں آپ اپنا یہ بیان واپس لیں. دوسری طرف حریف شاطر ایک لالہ جی تھے انھوں نے اپنا مہرا بڑھاتے ہوئے کہا "برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا" اب خاں صاحب کی باری تھی انھوں نے چال چلتے ہوئے یہی فقرہ دہرایا. لالہ جی نے دوسری چال اور اسی فقرے سے جواب دیا. جیسی چال ہوتی یا موقع پڑتا اسی انداز سے دباکر اٹھاکر بسرعت یا باحتیاط تمام مہروں کو تکان دیتے اور اسی لب و لہجہ، جرأت، مسکنت، طنز یا ظرافت کے ساتھ برخوردار والا فقرہ دہرایا جاتا. ایک موقع ایسا آیا جب دونوں کے پیادے رخ اور فرزیں بننے کے لیے جلد جلد بڑھنے لگے. اس تیزی سے پورا فقرہ دہرایا نہیں جاسکتا تھا اس لیے صرف برخوردار پر اکتفا کر لیا گیا. لالہ جی کا فرزیں پہلے بنا. خان صاحب نے فرمایا برخوردار تم نے بے ایمانی کی لالہ جی نے کہا برخوردار اور بے ایمان پر تین حرف. دونوں نے مزید خانگی رشتے جوڑنے شروع کیے چنانچہ خان صاحب نے شطرنج کی بساط سے اور لالہ جی نے ناریل سے برخوردار کو بدل لیا. نتیجہ یہ ہوا کہ بساط منطقی کے سر پر، چلم کی آگ ہر ایک پر اور پولیس کا سپاہی حاضرین کے وسط میں تھا!

تھوڑی دیر بعد لالہ نے چلم سپاہی کو پیش کی. خاں صاحب نے سرپرستانہ پیچ پیچ

میں خوشامدانہ لہجے میں گفتگو شروع کردی۔ سپاہی نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو بدبختی یا بدشگونی یا دونوں کے آثار منطقی ہی میں پائے۔ ٹکسالی پوربی زبان اور لہجے میں بولا۔ "اے کون ہے" "ریہ کون ہے"، خاں صاحب بولے "ہم شطرنج کھیل رہے تھے اس نے منطقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، بکواس شروع کردی۔ بہتیرا سمجھایا بھائی پولیس قریب ہے" جملہ کاٹتے ہوئے منطقی نے کہا "حضرت آپ خانگی رشتے اور سماجی رشتے میں خلط بحث کر رہے ہیں"۔ اس سے قطع نظر نفسِ بحث سے پولیس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ سپاہی غرا کر بولا "موکو توای گاندھی کا چیلا جنات ہے تبے نا سرکار اور پولیس کا گریاوت ہے اپوے حجتی ہے ملا دسرن کا حجت حجت کہت ہے چل کتوالی"۔ اس اردوئے معلیٰ کی "ہندوستانی" یہ ہے "مجھے تو یہ گاندھی کا چیلا جان پڑتا ہے تبھی نہ سرکار اور پولیس کو گلیاتا ہے۔ آپ ہی حجتی ہے مگر دوسروں کو حجت حجت (حضرت) کہتا ہے چل کوتوالی" منطقی ہکا بکا کانسٹبل کے ساتھ ہولیا۔

خان صاحب نے کہا، منشی جی کہاں کے لفنگوں کو بلا لیتے ہو، بساط بچھاؤ کچھ دال دلیا اور رہو جائے۔ منشی جی بولے، بھئی علم قسم جو ہم نے بلایا ہو! حقہ بھرا گیا، بساط بچھائی گئی، ابتدائی پانسات چالوں کے بعد خان صاحب نے پکارا برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا لالہ جی نے چال چلنے میں کچھ دیر لگائی معاً کوئی اچھی چال سوجھی جھرجھری لے کر بولے، برخوردار پولیس سے سابقہ نہیں پڑا۔ گھڑی پھر چلنے لگی ٹک ٹک، گھر رگھر ر! ایک دن "حکامِ بالادست" کو سلام کرنے جانا پڑا۔ مجھے یہ شغل بڑا گراں گزرتا ہے اس لیے کہ ان کے خفیہ اور ان کے پاسبانوں کے علانیہ سلوک سے ڈرتا ہوں۔ یہ "حاکم لوگ" غلط اردو میں اظہارِ شفقت یا بے تکلفی فرماتے ہیں اور ان کے نوکر چپراسی صحیح اردو میں بخشش اینٹھتے ہیں لیکن کیا کرتا شب برات کی تقریب کپڑے نئے۔ ایسا موقع کب ملتا تھا چنانچہ کوٹھی کے احاطے میں قدم رکھا تھا کہ ایک ڈبلو کالے کتے نے لپک کر ایسے لہجے میں خوش آمدید کہا کہ یہ بات بالکل ذہن سے اتر گئی کہ نئے کپڑے اور نیا جوتا پہن کر بھاگنا وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ شیروانی کا دامن شرعی پیجامے کی مہریوں سے مائل بہ اختلاط ہو خطرے سے خالی نہیں! ایسے میں اکثر عمودی رفتار دفعتاً عجیب و غریب افقی حرکات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور فطرت نے

ہندوستان کو جیسے عجیب الطرفین چرمی کھدر میں ملبوس کیا ہے وہ کہنی گھٹنے اور ٹھوڑی سے غائب ہوجاتا ہے، بقول غالب "یہ نسخہ دیگر"

"کہنیاں" "دگار اپنی" "گھٹنا" "خوں چکاں اپنا!

قصہ مختصر، میں کتوں سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتا۔ مجبور ہوتا ہوں تو مصلح کرلیتا ہوں۔ چنانچہ میں نے کالے کتے سے یہی کیا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ اس نے دب کر صلح کرنے والے کا یقین کرلیا۔ واپس آکر ایک عزیز دوست سے کہا ایک صاحب تمھارا کتا خریدنا چاہتے ہیں آدمی ساتھ کردو خریدار کو دکھلا لاؤں۔ انھوں نے اپنے پہلوان کتے اور مریض نوکر کو ساتھ کردیا اطمینان سے جائے فرار پر واپس آیا۔ دوست نے مجھے دیکھا معلوم نہیں میرے مسکرانے پر وہ غرائے یا ان کے غرانے پر میں مسکرایا۔ ان کو اس کی خبر نہ تھی کہ اس وقت ان کا مقابلہ لپسر نوح اور اصحابِ کہف دونوں سے تھا۔ انھوں نے حبت کرکے معانقہ کرنا چاہا لیکن بجائے اس کے کہ میرا گلہ اور ان کے دندانِ مبارک ہوتے خود ان کا ٹینٹوا میرے ساتھی کے منہ میں تھا جو میرے پیچھے گلزارِ نسیم بنے کھڑے تھے۔

دانت اس کے تھے گورکن قضا کے

دو نیتھنے رہِ عدم کے ناکے

نوکر پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔ میں نے دوستوں کو تخلیے میں "بحث و تکرار" اسٹیج کرتے چھوڑا اور کوٹھی کی طرف بڑھا۔

یہاں کا نقشہ ہی جدا تھا۔ بیرے خانساماں بھنگن اور ان کی اولاد ٹپاخے چھوڑ رہے تھے اور ایسا شور مچ رہا تھا کہ کتوں کی آواز بھی ماند پڑگئی تھی۔ دیکھا کہ کوئی مخاطب نہیں ہوتا تو ٹپاخے اور چھچھوندر کی زد سے بچتا ہوا ان کے قریب آیا۔ ان میں بعض ایسے فربہ تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ شاید ایک نہیں کئی ایک ہوں اور ان کے اطراف میں کئی ہاتھ اور کئی منہ ہوں۔ ایک صاحب ٹہلتے ہوئے تشریف لائے اور بولے صاحب آرام کررہے ہیں۔ دیکھیے شور نہ ہونے پائے۔ دوسرا بولا حلوا وغیرہ دن چھپے تقسیم ہوگا۔ میں نے کہا صاحب کی نیند میں تو خلل نہ آئے گا ممکن ہے آپ کی آتش بازی کی سرگرمیوں میں مخل ہوا ہوں۔ حلوے والے مسئلے کو پیچ و تاب کھا کر گول

کر گیا۔ کرتا بھی کیا۔ اس ستم ظریف نے جیب سے پڑیا نکالی تمبا کو پھانک لی۔ کان پر سے دو انچ لمبی گھسی ہوئی پنسل اتاری اور میلے ملگجے کاغذ کو سامنے لاکر بولا نام لکھ جائیے۔ میں نے اس ہدیہ کو اس طور پر قبول کیا جیسے وائسرائے سپاس نامہ کا خریطہ قبول فرماتے ہیں۔ اور لکھا۔ "شب برات میں آتش بازی اس لیے منع کی گئی ہے کہ بزرگوں کی روح اپنے عزیزوں سے ملنے اور حلوا کھانے آتی ہے تو بغیر حلوا کھائے اور بشارت دیے واپس جاتی ہے انشاء اللہ آئندہ سال" (بشارت ناتمام)

سنہ ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ کالج آیا قدم قدم پر اتو رہے اور سلطان محمد خاں سے سابقہ۔ چپے چپے پر سلام علیکم سے دوچار۔ پکی بارک کا ایک کمرہ کالج کے پرنسپل ٹول صاحب کا آفس تھا جو تن تنہا داخلے کے سارے کام انجام دیتے تھے۔ باہر دروازے پر امیدواروں کا ماگھ میلا لگا ہوا تھا۔ برسات کی امس، آٹھ بجے سے دن کے دو بج گئے۔ بھوک پیاس سے بدحواس پسینے میں شرابور۔ باریابی ہوئی تو شکل سے یونہی "اردو مڈل" معلوم ہو رہا تھا۔ ٹول صاحب کی گول گول آنکھیں اور نصف بریدہ انگلی دیکھ کر کلکٹر صاحب یاد آ گئے۔ فرمایا کہاں سے آ رہے ہو۔ بولا کچی بارک سے۔ ٹول صاحب کا مطلب تھا وطن کہاں ہے میں نے جواب دیا کچی بارک میں رہنا چاہتا ہوں۔ ٹول صاحب مسکرائے وہ مسکراہٹ جس کے بارے میں کسی کو کبھی کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ عتاب کا پیش خیمہ تھا یا التفات کا نتیجہ!

داخلے کا صرف ایک فارم تھا۔ اسی پر سارے اندراجات کر دیے گئے۔ وہاں سے ٹول صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ بابو رفیع اللہ خاں (شاہجہاں پوری) کے پاس پہنچا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کسی محدث دہلوی یا پنشنر تحصیل دار کا سامنا ہو۔ آنکھ اور عینک کے درمیان تقریباً چار انگل کا فاصلہ، پیشانی پر جھرّیاں چند ساعت میرے سراپا اور سج دھج کا جائزہ لیا اس کے بعد پان کی پیک کو منہ میں تولتے ہوئے ڈپٹ کر بولے، لہجہ سے معلوم ہوتا تھا عراق عرب میں افواجِ برطانیہ کے ساتھ رہ چکے ہیں۔ تمہارے باپ کا کیا نام ہے، کہاں کے رہنے والے ہو، کیا کاروبار ہے۔ جونپور کی امرتیاں لائے ہو۔ اب یقین ہو گیا کہ گورنمنٹ کے ملازم رہ چکے ہیں۔ بغرض گلو خلاصی ہوئی۔ کچی بارک آیا نورٌ علیٰ نور!

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جس کی چہارم آسماں ہے

کچی بارک (گل منزل) وہ مقام ہے جس کے بارے میں بہت کہا اور لکھا گیا ہے یہاں صرف اتنا اشارہ کر دینا مقصود ہے کہ اس عہد کی طالب علمانہ زندگی میں کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے پہننے اوڑھنے نماز روزہ کھیل کود ہنسی مذاق سبھی پر پاسبان مسلط تھے کہنے کو تو آج بھی نہ آستانوں کی کمی ہے نہ پاسبانوں کی لیکن یہ فرق ضرور ہے کہ اس زمانے میں پاسبان خارج ہی نہ تھے ان کا احساس ہمارے دلوں میں بھی موجود تھا۔ ان پاسبانوں کی ایسی کڑی گرفت تھی کہ خود سری اور بے راہ روی کے امکانات تقریباً ختم ہو گئے تھے۔

ایک بار دور دراز کا سفر کرنا پڑا۔ پیسے کم سفر طویل۔ اس فکر میں ہوا کہ سفر کس طرح مختصر کیا جائے یا اخراجات کے لیے روپے کی کیا سبیل ہو۔ دونوں میں سے ایک بھی نہ کر پایا۔ عادت یہ ہے کہ کام شروع کر دینے کے بعد اس کا پروگرام بناتا ہوں اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اکثر کام پورا ہو جاتا ہے اور پروگرام بنانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔

سفر شروع ہوا۔ راستے میں ایک درگاہ پڑتی تھی، زیارت کے لیے اتر پڑا۔ اسباب سرائے میں رکھ کر درگاہ پہنچا۔ جو توقعات بن دیکھے قائم کی تھیں، ان میں مایوسی ہوئی اور وہاں کے پاسبانوں کو دیکھ کر جان و مال کا اتنا نہیں تو آبرو جانے کا اندیشہ ضرور ہوا۔ لمبی چوڑی عمارت گندگی، گداگر، تنومند ترش رو مجاور، ہر طرف کہنگی اور زوال کے آثار۔ سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ خیال آیا قوالی سے کام لوں لیکن نہ اشعار یاد، نہ گانے سے واقفیت۔ تالی بجانے کی مشق کالج میں کی تھی لیکن کالج کی تالی اور مزار کی تالی میں بڑا فرق تھا۔ اور اس فرق کو خادموں اور مجاوروں نے محسوس کر لیا تو یہاں کوئی ایسا تو ہے نہیں جو اس کا قائل ہو کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بج سکتی ہے۔ ممکن ہے یہاں تالی کا پرچہ ترکیبِ استعمال کچھ اور رہی ہو مثلاً ایک ہی ہاتھ سے بجائی جاتی ہو لیکن قوالی کی ایک چیز آتی ہے یعنی

"اسے ہے وائے!"

چنانچہ کچھ سوچتا کچھ گنگناتا بہت کچھ ڈرتا ہوا داخلِ عمارت ہوا۔ پاسبان نے ایسی باٹ دار آواز میں للکارا کہ ساری عمارت گونج گئی اور میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔" قدمِ درویشاں ردِّ بلا" پھر نہایت لجاجت سے فیس داخلۂ طلب کی۔ بات سمجھ میں نہ آئی اس لیے کہ میرے قدم ردِّ بلا تھے تو اس کی فیس کیسی اور کسی دوسرے کے تھے تو اس کا اعلان مجھے دیکھ کر کیوں! پھر سوچنے لگا کہ ممکن ہے شکل کے اعتبار سے میں درویش ہوں قدم کے اعتبار سے یہ لوگ یا کوئی اور بزرگ ردِّ بلا ہوں۔ عرض کیا جناب پیسے ہوتے تو وطن ہی کیوں چھوڑتا۔ اس امید پر حاضر ہوا ہوں کہ حضرت کے فیض سے کچھ پیسے مل جائیں گے۔

فرمایا آپ بڑے آدمی ہیں اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔ عرض کیا یہ آپ کا حسنِ ظن ہے لیکن رائے صحیح نہیں قائم فرمائی۔ میں مفلس عیال دار ہوں، اسی اعتبار سے مقروض اور مریض بھی۔ کہنے لگے بجا۔ لیکن جب تک کچھ خیر خیرات نہ کیجیے گا حضرت کی خوشنودی کیوں کر حاصل ہوگی۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ دبی زبان سے عرض کیا جناب یہ مزار شریف ہے یا امپیریل بنک! پاسبان نے کچھ اس طرح گھور کر دیکھا کہ مارے خوف کے دل سینے میں اور چونی جیب میں لرزنے لگی۔ چونی دربان کی خدمت میں پیش کی اور اسے دعائیں دیتا ہوا چار سورماؤں کی حفاظت یا حراست میں آگے بڑھا۔ ایک مقام پر طائفہ کھڑا ہوگیا۔ حکم ہوا حضرت نے یہاں وضو کیا تھا۔ اکنی رکھ دو اکنی کے ساتھ ایک بزرگ بھی تخفیف میں آگئے۔ دوسری منزل پر بتایا گیا کہ حضرت نے یہاں چلہ کھینچا تھا۔ آٹھ آنے نذر کے پیش کرو۔ وہ بھی پیش کردیے ایک صاحب اور کم ہوئے۔ ایک مقام پر پہنچے ارشاد ہوا بارہ آنے رکھ دو حضور نے یہاں دعا مانگی تھی۔ تم بھی دعا مانگ لو۔ پوچھا کیا آپ بتا سکتے ہیں حضور نے کیا دعا مانگی تھی کہنے لگے یہی مانگی ہوگی کہ خدا مسلمانوں کو جملہ آفات و بلیّات سے محفوظ رکھے۔ میں نے کہا اسے دوائے، وہ دعا کب مقبول ہوئی کہ میں بھی مانگوں۔ اس پر دوست بہت برہم ہوئے اور کچھ تعجب نہ ہوتا اگر نقضِ امن کی نوبت آجاتی۔ میں نے مطلوبہ رقم ان کے ہاتھ پر رکھ دی جس کا کرشمہ یہ تھا کہ ان کا ولولۂ جہاد مزاج شریف اور دعائے لطیف پر ختم ہوگیا۔

پوچھنے لگے حضرت کا آنا کہاں سے ہوا۔ عرض کیا علیگڑھ سے فرمایا وہاں مزارات ہیں؟ کہا

جہاں کہیں مسلمان ہوں گے، مزارات بھی ہوں گے۔ پوچھا متولی اور سجادہ نشین کون ہیں۔ کہا فی الحال تو یہ خاکسار ہی ہے اور اس وقت مزارات کے مسائل پر تحقیقات کرنے ہندوستان آیا ہے۔ پوچھا اوقاف کی آمدنی کیسی ہے؟ جواب دیا کافی سے زائد ہے۔ کہنے لگے اگر میری خدمت کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں، یہاں کی حالت تو نہایت زار ہے۔ متولی صاحب پر ایک عورت اور ایک انگریز کا بڑا اثر ہے۔ مزار شریف کی آمدنی انھیں پر صرف ہوتی ہے۔ ہم خدام تو بس اسی روکھی پھیکی پر بسر کرتے ہیں جو آپ لوگوں سے مل جاتی ہے۔ عرض کیا، کیا کیجیے گا انگریز اور عورت سے کسے اور کہاں مفر ہے۔

ایک دوسرے خادم کے ہمراہ آگے بڑھا اور ایک کھڑکی کے قریب پہنچا ساتھی نے کہا ایک روپیہ نذر کیجیے اور اس کھڑکی میں منہ ڈال کر دعا مانگیے قبول ہوگی۔ عرض کیا یہ ایک روپیہ حاضر ہے۔ دعا مانگنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کہنے لگے نہیں جناب یہ یہاں کا دستور ہے آپ مزار شریف کی توہین کررہے ہیں۔ میں نے کہا یہ بات نہیں ہے۔ حواس پر قابو نہیں الٹی سیدھی دعا مانگ گیا تو کیا ہوگا۔ کہنے لگے دعا مانگنی پڑے گی۔ اس آستانے سے کوئی محروم نہیں گیا۔ مجبوراً کھڑا ہوگیا۔ رفیق نے للکارا دعا مانگو اور ہم سے کیا پردہ با آواز بلند مانگو۔ عرض کیا اس سے ممکن ہے صاحب مزار کے آرام میں خلل پڑے فرمایا اس کا خیال نہ کرو ہم سنبھال لیں گے۔ میں نے دعا مانگی۔

"اے برگزیدہ روح دعا فرمایئے کہ اس گنہ گار اور بدبخت کو آج سے پھر کسی مزار یا مجاور سے سابقہ نہ پڑے۔"

یاد نہیں آتا کہ کھڑکی کے اندر سے خود گردن باہر نکالی یا اس کے لیے اپنے رفیق کا احسان مند ہونا پڑا۔ اسے وائے کرتا مزار شریف سے تنہا باہر آیا۔ بعض فقرا اور مساکین نے ہمدردی کرنا چاہی لیکن آخری کرم فرمانے وہیں سے للکارا "خبردار وہابی ہے!" سرائے پہنچا تو سامان غائب! اے ہے والے!

تجسس عورت کی فطرت ہے اور پاسبانی اس کی عادت۔ ان کا سدّ راہ نہ پردہ ہے نہ پہاڑ۔ اسے یہ فکر نہیں کہ مرد روپیہ کیسے کماتا ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ خرچ کہاں یا کیوں کرتا ہے۔

اس کا خرچ کرنے کا تصور وہی ہے جو آئی۔ سی ایس کا برطانوی اقتدار کا ہے۔ یعنی ہر وہ فعل جو آئی۔ سی۔ ایس کا ہو برطانوی اقتدار میں معین اور ہر وہ فعل جو کسی ہندوستانی سے عمل میں آئے برطانوی اقتدار کے منافی ہے! وہ مرد کے مخلص دوست کو اپنے نکھٹو رشتے دار سے فروتر سمجھتی ہے اور مسلسل جتاتی رہے گی کہ آپ سے شادی کرنے میں اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور بے سود قربانی کی ہے۔ ثبوت میں یہ کہے گی کہ فلاں بیوی کے ہاں نبدر اور بھالو پلے ہوئے ہیں اس کو یہ میسر نہیں۔ اس کی زندگی ایک مسلسل تفتیش تذبذب اور بدگمانی ہے۔ جس طرح حکومتیں اور تاجر دن رات اس ٹوہ میں رہتے ہیں کہ کسی اور حکومت کا رسوخ یا کسی دوسرے کی مصنوعات کی مانگ تو نہیں بڑھ رہی ہے اسی طرح عورتیں فکر میں مبتلا رہتی ہیں کہ کسی دوسری عورت کو تو نہیں فروغ ہو رہا ہے۔ عورت نے آج تک نہ اپنی غلطی تسلیم کی نہ اپنی شکست! عورتوں کا دشمن عورتوں سے زیادہ کوئی نہیں اس لیے کہ ہر عورت دوسری کو اپنا ازلی حریف سمجھتی ہے!

عورت سے محبت کرنا ہمیشہ سے ہر قوم، ہر ادب اور ہر زمانے میں مقبول رہا ہے۔ جیل خانہ ہسپتال، پاگل خانے، شہادت، وصیت نامے، بے قید نظمیں سب میں اسی کی جلوہ گری ملتی ہے!

مئی کا مہینہ دن کے ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ دھوپ گرمی گرد اور لو کا زور ہے۔ یونیورسٹی کے کاموں سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تھا۔ یہاں بھی دو چار مونٹی سوری قسم کے مسائل درپیش تھے۔ اتنے میں باہر ہنگامہ بلند ہوا۔ ملازم نے اطلاع دی کہ ایک صاحب تشریف لائے ہیں جن کی لمبی داڑھی ہے اور ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔ روکے نہ جاتے تو گھر میں گھس آتے۔ پانی مانگ رہے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ اس اطلاع اور آمد سے جو کوفت ہوئی اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں۔ ارادہ کر کے نکلا کہ کورٹ کے ممبر یا ان کے اقربا میں سے کوئی نہ ہوا تو جا

من و گرز و میدان و افراسیاب!

دیکھتا کیا ہوں صحن کے وسط میں دھواں دھار داڑھی اور جریب زیتونی الشکل لاٹھی چابک، سمیت حاجی بلغ العلا محمد فاروق صاحب ایم۔ ایس سی علیگ اکڑے سگریٹ سلگا رہے ہیں۔ فرمایا ۲۲ لاکھ گنے بیل ڈالے گئے، چار لاکھ کی شکر تیار ہوگئی۔ عرض کیا حاجی صاحب کھانا کھاتے

جارہا تھا فرمایا "کلوا واشربوا ولاتقنطوا"

کہنے لگے برخوردار کو جانتے ہو۔ ایک دن عورت اور محبت کا مسئلہ چھیڑ کر کہنے لگے!
ابا آپ بوڑھے ہوگئے لیکن نئے سرے سے دنیا جوان ہو رہی ہے اسلام کا نظریۂ نکاح مشتبہ ہے۔
اتنا بیان دے کر حاجی صاحب نے داڑھی کو اس طرح تکان دی کہ ایک ایک بال باہمہ و بے ہمہ ہوگیا۔ پیشانی پر شکنیں پڑنی شروع ہوئیں تو کرہ سر کے خط استوا پر جاکر ختم ہوئیں اور آنکھیں فردوسی کا شاہ نامہ بن گئیں۔ میں نے کہا صاحبزادے کے کہنے پر نہ جایئے انھوں نے خیالات و جذبات کی تشکیل و تہذیب میں کتابوں کے مطالعہ سے زیادہ کام لیا ہے، زندگی کے واقعات اور مشاہدات کو اہمیت نہیں دی ہے، ان سے سابقہ پڑے گا تو جان لیں گے کہ کتابی باتیں زندگی کے نت نئے تقاضوں کا ساتھ دور تک نہیں دے سکتیں۔

حاجی صاحب پر میرے اس خطبۂ صدارت کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ اکتا کر بولے کھڑکی کھولو۔ اور اقبال (میرا بڑا لڑکا) کو بلاؤ۔ لونڈا مجھ کو ببلول ابا کہتا ہے۔ عرض کیا حاجی صاحب کن مصیبتوں سے کمرے میں بند کر آیا ہوں، دھوپ میں کہاں بلاؤں، لو لگ گئی تو بڑی پریشانی ہوگی۔ بولے تو میرے لڑکے پر کیوں اعتراض کرتا ہے۔ اسے بھی بچپن میں لو سے بچایا گیا اب ذرا سی گرمی میں تلے اوپر ہونے لگتا ہے۔ میں نے پوچھا حاجی صاحب اعتراض کیا تھا۔ فرمایا دیکھو مسخرے کو کہتا ہے اگر مرد کو چار عورتیں روا ہیں تو عورتوں کو چار مرد کیوں نہیں، محبت کا انجام شادی ہے اس لیے ہندوستانی طریقۂ شادی ناقص ہے، کیونکہ یہاں محبت شروع ہونے سے پہلے شادی کردی جاتی ہے!

میں نے کہا حاجی صاحب بات دراصل یہ ہے کہ میں نے ایک مضمون لکھنا شروع کیا ہے۔ ایک جگہ گاڑی آٹک گئی ہے صاحبزادے کو کیا جواب دیا تھا بتا دیجیے تو میں اسے سرقہ کی زد یا الزام سے بچا کر اپنے مطلب کا بنا لوں۔ فرمایا یہ کیوں کر، عرض کیا آرٹ یا ریسرچ کے بہانے! یعنی کسی نے کہا کہ عریاں یا فحش ہے تو کہہ دوں گا آرٹ ہے اور جاہل یا سرقہ بتایا تو عرض کروں گا کہ ریسرچ میں ایسا ہی ہوتا ہے!

حاجی صاحب ڈنڈا لے کر کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے پھر گنگنانے لگے۔ حاجی صاحب

کاداد دینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ فرمایا اجی وہی حماقت کی بات تھی۔ یعنی چار نکاح، محبت کا آغاز و انجام، عورت کا انتقام وغیرہ۔ عرض کیا ذرا تفصیل سے سناد یجیے تو کرم ہوگا۔ فرمایا۔ کہتا تھا عورت چار نکاح کیوں نہ کرے۔ میں نے جواب دیا اور تم بھی سن لو۔ تمھاری کتنی اولاد ہے۔ میں نے کہا۔

زمین شش شد و آسماں گشت ہشت!

فرمایا یہ قطعہ ولادت ہے یا مصرع طرح۔ میں نے کہا دونوں۔ فرمایا بیویاں کتنی ہیں۔ میں نے کہا حاجی صاحب ذرا زبان سنبھال کر۔ حاجی صاحب نے صرف داڑھی سنبھال کر کہا اگر چار بیویاں ہوتیں تو چوبیس گھنٹے اولاد ہوتی یا نہیں۔ میں نے کہا تو پھر۔ کہنے لگے عورت چار نہیں چوبیس نکاح کرے اولاد تو ایک ہی ہوگی۔ اس لیے نسل کی بقا یا افزائش کے لیے تم ہی بتاؤ مسئلہ کے کس رخ کو زیادہ اہمیت دینا چاہیے۔ میں نے کہا حاجی صاحب بات تو نامعقول کہی ہے لیکن چوں کہ گھاگ ہو اس لیے کوئی کچھ نہیں کرسکتا مگر شادی کا مقصد توالد و تناسل ہی تو نہیں ہے محبت بھی تو کوئی چیز ہے۔ فرمایا مسخرے بھی ہو لونڈے بھی، محبت کا انجام شادی نہیں ہے یہ محبت کا کالجی تصور ہے۔ محبت کی ابتدا شادی کے بعد ہوتی ہے۔ اور یہ برگزیدگی کا تصور ہے۔

میں نے کہا اور پاسبان، فرمایا اب وقت ضائع مت کرو ابھی مجھے ایک اور جگہ جانا ہے۔ شکر سازی کی ایک مشین ایجاد کی ہے کسی ماہر سے مل کر حساب لگانا ہے کہ شیرہ اور شکر کا تناسب کیا ہونا چاہیے اور کیا شیرہ کا عنصر حذف کیا جاسکتا ہے۔ تم جاکر آرام کرو۔ میں نے کہا حاجی صاحب گرمی کی شدت، بچوں کی چیخ پکار، ادھر ادھر کی مکروہات آرام کب لینے دیں گے۔ کہنے لگے بیوی پاسبان ہے توامن و امان ہے۔ بھاگ جاؤ!

علی گڑھ میگزین میں اس مضمون کی دو قسطیں جاچکی ہیں۔ چاہتا ہوں کہ یہ آخری ہو۔ یاد نہیں اس سے پہلے کیا لکھ چکا ہوں اس سلسلے میں نیل کنٹھ مہادیو کا بھی ذکر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ نہیں معلوم کہ نیل کنٹھ مہادیو ہیں یا مہادیو، نیل کنٹھ۔

ان کا حلیہ کچھ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ پاسبانوں کا ہوتا ہے اس لیے کہ سنتے ہیں کہ خالقِ موجودات کو نیل کنٹھ مہادیو کو پیدا کرنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ کام دیو نابالغ بھی تھے نابینا بھی۔ چنانچہ ان پر نیل کنٹھ مہادیو کا پہرہ مقرر کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ تک مہادیو کا بڑا دور دورہ رہا جیسا کہ نابالغ رؤسا کے منیجر یا مزارات کے متولیوں کا رہتا ہے لیکن نابالغ اور نابینا کی پاسبانی یا پاسداری ہر وقت نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ کام دیو اور نیل کنٹھ مہادیو میں اختلافات پیدا ہونے لگے۔ عشق اور عقل نے "تیشۂ فرہاد" اور "فتنۂ پرویز" کی صورت اختیار کی۔ عشق کو عقل کی پاسبانی کا شکوہ اور عقل کو عشق کی بے راہ روی کا گلہ قریب تھا کہ فریقین ہندو مسلم قسم کی حرکت کرنے پر آمادہ ہوں کہ راؤنڈ ٹیبل کا مصرعہ ذہن میں آ گیا۔ ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں ایک شاعر ایک فلسفی اور ایک مولوی کا انتخاب کیا گیا اخراجاتِ سفر ہندوستان پر ڈالے گئے اور یہ اصحابِ ثلاثہ عالمِ بالا کے سفر پر روانہ ہوئے۔

حجابات طے ہونے لگے۔ شاعر بے فکر، فلسفی متحیر، مولوی خائف و خفیف! یہاں تک کہ وہ منزل آئی جہاں راہبر نے بتایا کہ قیام کیا جائے گا۔ معزز مہمان تھے جائے اقامت کا انتخاب بھی انھیں کو دیا گیا۔ مولوی نے جنّت کا رخ کیا۔ فلسفی نے کہا جب تک ہر جائے قیام کا کچھ حال نہ معلوم ہو مقام کا انتخاب کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ مولوی نے کہا جنّت سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ فلسفی نے کہا یہ تو ظاہر ہے لیکن جہاں صرف تمھارے ہی جیسے لوگوں سے سابقہ ہو اسے جنّت کیوں کہیے، جامع مسجد یا درگاہ کیوں نہیں۔ دوزخ اس لیے نہیں جانا چاہتا کہ دنیا میں ہمیشہ اس کی دھمکی دیتے رہے، جنّت میں حوروں سے کہو گے کہ دیکھو فلسفی کو جہنّم رسید کر دیا! میں برزخ میں قیام کروں گا اس لیے کہ اس کے سوا اور کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں مولوی اور ملحد دونوں سے نجات ہو!

اب شاعر کی باری تھی۔ راہبر نے پوچھا آپ کا کیا ارادہ ہے۔ شاعر بولا جنّت پر تو مولوی نے قبضہ کر لیا۔ برزخ فلسفی کے حصّہ میں آیا، مجھے جہنّم لے چلو۔ اس میں شک نہیں کہ مولوی اور فلسفی کے نکل جانے سے اب دنیا بھی رہنے کے قابل جگہ ہو گئی ہے لیکن یہ بھی دیکھنا ہے کہ جہنّم

اور دنیا دونوں میں کون قابلِ ترجیح ہے دوسرے یہ کہ جس کے مہمان آئے ہیں اس نے جائے قیام کے انتخاب کا اختیار دے دیا ہے تو یقین ہے کہ جنّت دوزخ اور برزخ سب یکساں ہوں گی۔

جائے قیام پر پہنچ کر شاعر نے محسوس کیا کہ جگہ تو خاصی ہے، بدمذاقوں نے بدنام کر رکھا ہے ورنہ بیش سبھی کچھ ہے۔ چنانچہ ایک فضا اپنے لیے منتخب کر لی۔ مالک نے پوچھا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے، شاعر نے جواب دیا تمھاری تو بڑی تعریف سنتے تھے لیکن معلوم ہوا کہ تمھارے عقل ہے نہ ایمان۔ مردِ خدا، ضرورت تو جنّتیوں کو ہوتی ہے، حور و قصور کو شہد و سلسبیل کی۔ ہم کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو یہاں کیوں آتے۔ ضرورت حاجت مندوں اور سائلوں کو ہوتی ہے۔ ہماری ضرورت تو ان کو ہے جنھوں نے بے ضرورت کسی چیز کو نہیں پیدا کیا۔ مجھ کو میری حالت پر چھوڑ دیجیے۔ مالک نے کہا تم عجیب آدمی ہو نہ دوزخ سے خائف نہ بہشت کے خواہش مند! شاعر نے کہا تم عجیب تر فرشتہ ہو کہ چون و چرا بھی کرتے ہو، بارگاہِ کبریا سے اتنے قریب ہو کر اس کی مصلحتوں سے اتنے ناآشنا ہو! جنّت اور دوزخ کی حاجت ہم کو ہے یا ان کو؟ سزا اور جزا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو مظلوم نہ سمجھنے پائے۔ یہ باتیں تمھاری سمجھ میں نہ آئیں گی۔ ہو سکے تو کچھ دنوں کے لیے میرے ساتھ دنیا تک چلے چلو وہاں یہ باتیں خود بخود تم پر منکشف ہو جائیں گی۔

مالک نے پوچھا آخر آپ آئے کیوں ہیں۔ شاعر نے کہا کہ تم نے بے ہودہ تکا سوال کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے تم پر فضل کیا اور تلاش و تجسّس کا مادّہ بھی ودیعت کر دیا۔ پوچھتے ہو کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں، ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انسان نے دنیا میں رہ کر آخرت کے وجود کا ثبوت دے دیا۔ لیکن اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اس میں تمھاری دوزخ یا بہشت کو بھی دخل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوزخ اور بہشت کی موجودگی نے انسانیت کی تکمیل میں بڑی رکاوٹیں پیدا کر رکھی ہیں۔

مالک نے کہا کیا تمھارا جنّت، دوزخ یا ملائکہ پر ایمان نہیں ہے۔ شاعر نے جواب دیا کہ یہ سوال تم کو قبر میں مُردوں سے کرنا چاہیے، میں نہ مردہ ہوں، نہ قبر میں۔ جس طرح تم کو فرشتہ مان لینے کے بعد تمھارے سوالات پر درگزر کیا جا سکتا ہے، اسی طرح خدا کو خدا مان لینے کے

بعد جنت دوزخ کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ خدا کا مقصد نہ جنت دوزخ ہے نہ ہم نہ تم۔ وہ خود مقصد ہے۔ مالک نے کہا تمھاری باتیں کچھ عجیب سی ہیں اچھا اب آرام کرو اس سلسلے کو پھر کبھی چھیڑیں گے۔ شاعر نے کہا تمھارے یہاں آرام کہاں یہاں کی یکسانیت تو مجھے پاگل بنا دے گی شاعر کے دل میں آیا کہ دیکھوں دونوں ساتھی کہاں اور کس حال میں ہیں۔ پہلے مولوی سے ملا۔ پوچھا کیسی گزری جنت میں، کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہے۔ کہنے لگے تکلیف تو کوئی نہیں لیکن کبھی کبھی کسی چیز کا بہت اچھا اور بہت زیادہ ہونا بھی تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔

شاعر نے کہا تم کو معلوم ہے ہم لوگ کیوں اور کس حیثیت سے آئے ہیں گفت و شنید کے لیے تم کہاں تک تیار ہو۔ مولوی نے کہا یوں تو تم جانتے ہو بحث مباحثہ ہمارا دلچسپ مشغلہ رہا ہے لیکن یہاں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ یہ جگہ بحث مباحثہ کے بجائے عیش و نشاط کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ شاعر مولوی سے رخصت ہو کر فلسفی کے ہاں پہنچا قبل اس کے کہ شاعر کوئی سوال کرتا فلسفی نے کہا دیکھو تم ذرا جلد باز ہو۔ یہاں بھی جلد بازی نہ کرنا میں سوچتا ہوں کہ :

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے !

صرف الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ کبھی کبھی شاعر کی نارسائی فلسفہ کے دامن میں پناہ لیتی ہے۔ شاعر نے جواب دیا لیکن ایک صورت وہ بھی تو ہوتی ہے جب فلسفہ شاعری کی آڑ پکڑنا چاہتا ہے اور فلسفہ اور شاعری دونوں صداقت کے علم بردار ہونے کے متمنی ہوتے ہیں، دوسری طرف فلسفہ اور شاعری دونوں سے صداقت بیزار ہوتی ہے۔ فلسفی نے کہا صداقت کوئی میراث نہیں ہے جو کسی ایک ہی شخص یا جماعت یا فن کے حصے میں آئی ہو۔ شاعر نے جواب دیا یہ صحیح ہے لیکن اشخاص جماعت یا فن اس کے محتاج ضرور ہیں۔ مگر ہم دونوں یہاں فلسفہ اور شاعری کا الکشن لڑانے نہیں آئے ہیں مشکل یہ ہے کہ تم دنیا میں بھی برزخ ہی میں رہے اور یہاں بھی تم نے اس کا انتخاب کیا۔ اس لیے مجھے امید کم ہے کہ اب تک کسی نتیجے پر پہنچ سکے ہو گے۔

فلسفی نے کہا اگر عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے تو پھر قطعیت کیسی اور کہاں۔ شاعر نے

جواب دیا فلسفہ کی گمرہی کو آپ شاعری کی محرومی سمجھتے ہیں۔ فلسفی بولا گمرہی اور محرومی پر آخرت میں بحث کرنا کوئی مفید مشغلہ نہیں ہے شاعر نے جواب دیا لیکن اس کے دلچسپ ہونے میں کیا کلام ہے۔ تم الفاظ کی گرفت کر کے حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہو۔ حقیقت صرف ایک ہے الفاظ اور فلسفیوں کی تعداد بے شمار۔ بحث حقیقت سے کرنا پڑے گی یہاں جس سے سابقہ ہے اس نے صرف حقیقت کی ذمہ داری لی ہے الفاظ کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک حد تک ہماری نارسائیوں کے مظہر ہیں۔

فلسفی نے جواب دیا دیکھو جلد بازی کا میں ہمیشہ مخالف رہا ہوں اور اس سے زیادہ قطعیت کا۔ اگر تم کو ان پر اصرار ہے تو مولوی سے رجوع کرو۔ شاعر نے کہا مولوی تو جنّت پہنچ گیا اس نے حقیقت کو ہمیشہ جنّت سے تعبیر کیا اس لیے اس کی پرواز ختم ہو چکی ہے اس کا عشق اور اس کی عقل دونوں اس سے اور وہ ان دونوں سے بے نیاز ہو چکے ہیں تم قطعیت سے گریز کرتے ہو چنانچہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں تم دونوں کو تمھارے حال پر چھوڑ دوں۔

شاعر نے جہنم پہنچ کر مالک سے پوچھا اگر مصالح کے خلاف نہ ہو تو میں شیطان سے مل لوں دنیا میں وہ آخرت کے پیچھے بدنام رہا۔ اب دیکھنا چاہتا ہوں کہ آخرت میں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ مالک نے کہا اپنی ذمہ داری پر مل سکتے ہو۔

ملاقات ہوئی۔ شیطان نے کہا خوب آئے اچھا کیا کہ فلسفی اور مولوی کو ساتھ نہ رکھا ورنہ جہنم کی ساری معنویت ختم ہو جاتی۔ تمھارا وفد دنیا کی ایک گتھی سلجھانے آیا ہے یعنی عقل اور عشق کی پاسبانی یا کارفرمائی۔ شاعر نے کہا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہے جتنا لوگوں نے بنا رکھا ہے۔ شیطان نے کہا ٹھیک ہے لیکن اتنا معمولی بھی نہیں ہے جتنا شعراء نے سمجھ رکھا ہے۔ شاعر بولا عشق بتلانے کے بعد عقل پر غور کرنا فضول ہے۔ شیطان نے جواب دیا اس قسم کے فقرے وہ استعمال کرتے ہیں جو حقائق کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتے انسان اپنی نارسائی کو چھپانے کے لیے فقروں کی آڑ پکڑتا ہے اسے خود فریبی بھی کہہ سکتے ہیں میں کسی ایسی چیز کا قائل نہیں جس کا فیصلہ نقابت سے ہو تم عشق اور آخرت کے قائل ہو میں عقل اور دنیا کو اہم سمجھتا

ہوں۔ تم کو یہ نہیں معلوم کہ تم ہم سے جتنے بیزار ہو اس سے زیادہ خدا ہم کو قابلِ اعتماد سمجھتا ہے۔ تم ہم کو دشمن سمجھتے ہو اس لیے کہ خدا کے بیوقوف دوست ہو اور میں اس لیے اسے عزیز ہوں کہ اس کا عقلمند دشمن ہوں۔ تمھارے جذباتی ہونے پر تم سے ہمدردی کر سکتا ہوں لیکن تمھارا قائل نہیں ہو سکتا۔ عشق عبودیت ہے اور عبودیت پر فخر کرنے والے کمزور ہوتے ہیں یا سادہ لوح۔ عقل اصل ہے۔ مشیت نے اس کی تقسیم میں احتیاط ملحوظ رکھی ہے اور یہ زیادہ مقدار میں تقسیم کی جاتی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ ذہن میں ہزاروں طرح کے خیال آتے ہیں لیکن ہر خیال کا تحمل ہر ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا بارِ گراں ہے جو بجائے خود اپنا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اس بار اس نے جہاں تم پر گرانی کی تم نے آڑ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص آلام کو "غرقِ مے ناب" کرنے پر آمادہ ہو جائے جس کا اعتراف غالب نے کیا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

غالب کی پہلی کمزوری تو یہ تھی کہ انھوں نے نشاط کو برا کہا۔ نشاط بری چیز نہیں ہے بلکہ نشاط سے مغلوب یا اس کا محتاج ہونا بزدلی اور کم مائگی ہے۔ دوسری غلطی کا اعتراف انھوں نے یوں کیا ہے کہ وہ شراب میں پناہ لینا نشاط کی ذمہ داری سے زیادہ سہل سمجھتے ہیں۔ شاعر نے کہا لیکن شیطنت بھی اسی کو کہتے ہیں۔ شیطان بولا کہنے کو جو چاہے کہہ لو آخر انسان ہو اور شاعر بھی۔ شاعری اگر تمھارے خیال سے حسن اور حقیقت کے اظہار کا نام ہے تو میرے خیال میں شیطنت تکمیلِ حسن ہے۔ گو میرا خیال ہے کہ بیشتر اردو شعرا حسن اور حقیقت کو ایک سمجھنے کی استعداد بھی نہیں رکھتے۔ شاعری کو مذہب کیوں بنا رکھا ہے، شیطنت شجرِ ممنوعہ اور ارضِ ممنوعہ کی قائل نہیں یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ عشق سے زیادہ حسین کوئی اور تصور نہیں ہو سکتا۔ تم نے انسان اور اس کرۂ ارض کو سب سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ یہ عشق اور عبودیت کی خسروی و کوتاہی ہے۔ تمھارا عشق ایک حالت یا ایک نظریہ ہے میری عقل مزاج ہے اور اصول۔ لیکن تم غیر ذمہ دار ہو اور اپنی ہر غیر ذمہ داری کو اس طور پر سراہتے ہو گویا وہ تکمیلِ اصول کے مختلف مراتب یا زینے ہیں۔ تم کو نہیں معلوم کہ شیطان ہر چیز کا قائل ہے الا غیر ذمہ داری۔

اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ غیر ذمہ داری قول سے متعلق ہو یا فعل سے، کمزوروں اور بے وقوفوں کی آخری جائے پناہ ہے۔

شاعر نے کہا تم واقعی شیطان نکلے شیطان بولا اگر تم نے حقیقت کا اظہار یا اقرار کیا ہے تو میں خوش ہوں لیکن اگر اس لفظ کو اس لیے استعمال کیا ہے کہ میری توہین ہو اور تمھارے انسان ہونے کے پندار کو تقویت پہنچے تو میں تم سے ہمدردی کرتا ہوں۔ تمھاری سادہ لوحی یہ ہے کہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتے ہو۔ اشرف المخلوقات ہونا کوئی فخر کی بات نہیں۔ مخلوق ہونا ہی کون سا شرف ہے جس پر آپ "اشرف" کا اضافہ کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ایک چیز اشرفِ موجودات بھی ہے۔ شاعر بولا مثلاً خدا شیطان نے جھنجلا کر کہا دہی مولویوں کی سی باتیں شروع کر دیں! میں نے مولویوں سے بڑھ کر کسی کو ایسا نہ دیکھا جو جلد سے جلد غلط نتیجہ پر پہنچتا ہو جو چیز سمجھ میں نہ آئی اسے خدا کہہ دیا جس سے خفا ہوئے اسے شیطان قرار دے دیا۔ انہی کے پھیر میں تم نے اپنی عقل اور دوسروں کی عافیت کھوئی اپنی حماقت پر غور کرو کہ عقل و عشق کے مسائل سمجھنے یا طے کرنے کے لیے دنیا چھوڑ کر یہاں آئے۔ زمین کا تصفیہ زمین ہی پر طے کیا جاتا ہے۔ عقل اور عشق سمجھنے کی چیزیں ہیں یا برتنے کی؟ شاعر بولا تم نے بحث اشرفِ موجودات کی اٹھائی تھی اسے پہلے طے کر لو شیطان نے کہا اشرفِ موجودات کا تصور اس شخص کے ذہن سے بالاتر ہے جو شیطان کے تصور کا تحمل نہیں کر سکتا!

شاعر نے ہنس کر کہا، گویا اشرف کا مفہوم شیطان کی ذات سے بھی وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ شیطان بولا تم کو ہنسنے کا حق نہیں کیونکہ ہنستے ہنستے رونے بھی لگتے ہو مجھے دیکھو آج تک ہنسا نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ جب کائنات میں سب ہنس چکیں گے اس کے بعد میں سوچوں گا کہ میرے ہنسنے کا وقت آیا یا نہیں!

شاعر کچھ عرصہ تک دم بخود رہا پھر بولا گتھی سلجھنے لگی ہے لیکن انجام واضح نظر نہیں آتا۔ شیطان نے کہا تم تو جہاں سے چلے تھے پھر وہیں پہنچ گئے کیسی گتھی کہاں کا انجام تم انسان بھی عجیب شے ہو اور کیوں نہ ہو جس نے قرنہا قرن ان دیکھی ہستی پر ایمان رکھا ہو وہ ایک خلے میں اس سارے طلسم کو کیوں کر سمجھ سکتا ہے۔ تم اس کے منتظر رہتے ہو کہ تائید

ایزدی ہو جائے اور گھر بیٹھے سب کچھ مل جائے جو شخص مانگنے کا خوگر رہا وہ حقیقت کو کب پاسکا ہے. جسم و جان کی درماندگی کا نام تم نے عشق رکھ لیا ہے.

شاعر بولا اس دور میں جب ہر کس و ناکس کے قول و فعل پر سے محاسبہ اٹھا لیا گیا ہے. کس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ انسان تائیدِ ایزدی کا منتظر رہتا ہے. شیطان بولا جو خدا اور مذہب کا نہیں قائل وہ شیطان اور شیطنت کا کب قائل ہو گا! خدا اور مذہب کا انسان قائل نہ ہو نہ سہی شیطان اور شیطنت کا پرستار ہو یہ بھی نہ سہی لیکن پرستش سے وہ باز نہیں آتا. وہ خداوند تراشتا رہتا ہے. جس چیز کو وہ آزادیِ مقال کہتا ہے وہ صرف ایک حیلہ ہے. پہلے لوگ خدا اور مذہب کے نام پر ظلم اور حماقت کے مرتکب ہوتے تھے اب آزادی اور آرٹ کا نام لے کر ظلم اور حماقت کرتے ہیں. پہلے گمراہ تھے اب راہ زن ہیں!

شاعر نے کہا تم شاعر ہوتے تو میں تم پر ایمان لاتا.

شیطان نے کہا اور تم شیطان ہوتے تو میں تم پر فرشتہ ہوتا. شاعر نے کہا اچھا شاعری اور شیطنت دونوں داخلِ دفتر یہ تو بتاؤ. تمہارا ایمان کس پر ہے. شیطان اس سوال کے لیے تیار نہیں معلوم ہوتا تھا. خاموش و غمگین ہو گیا اور ایک طرف کو چل دیا! وفد جیسا گیا تھا ویسا ہی واپس آیا.

شاعر نے دنیا میں پہنچ کر ایک مصرعہ موزوں کیا.

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے!

ارہر کا کھیت!

دیہات میں ارہر کے کھیت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ہائیڈ پارک کو لندن میں ہے دیہات اور دیہاتیوں کے سارے منصبی فرائض، فطری حوائج اور دوسرے حوادث یہیں پیش آتے ہیں۔ ہائیڈ پارک کی خوش فعلیاں آرٹ یا اس کی عریانیوں پر ختم ہو جاتی ہیں، ارہر کے کھیت کی خوش فعلیاں اکثر واٹرلو پر تمام ہوتی ہیں۔ یورپ کی عورتوں کو حقوق طلبی کا خیال بہت بعد میں پیدا ہوا لیکن ارہر کے کھیت میں کتنی گاؤں والیاں مسز پنکھرسٹ سے پہلے یہ مہم سر کر چکی ہیں۔ یہ دیہاتوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہوتا ہے جتنا ہندوستانیوں کو اسمبلی یا کونسل میں دونوں بولتے ہیں ضد کرتے ہیں جھگڑتے ہیں روتے بسورتے ہیں اور اپنے اپنے گھر کا راستہ لیتے ہیں۔ دیہاتی عورتیں اور بچے کچھ اور مفید کام کر جاتے ہیں جن سے ان کو اور کھیت دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے ارکان حکومت وہ کرتے ہیں جس سے وہ خود فائدہ اٹھاتے ہیں، دوسرے نقصان۔

شام کا دھندلکا اور گاؤں کا دھواں پھیلنے لگتا ہے کتے بھونکنے لگتے ہیں، کسان

اوران کے تھکے ہوئے مویشی ایک دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے دیہات کو واپس ہوتے ہیں دونوں کے ذہن میں ایک ہی بات ہے۔ یعنی گھر پہنچ کر کھانا ملے گا سونے کو ملے گا اور عافیت ملے گی۔ مویشی اور مالک دونوں کا خاندان ایک ہی ہوتا ہے۔ کسان کی بیوی اس کے بچے بچیاں اور اس کا بوسیدہ جھونپڑا کسان کے لیے اتنے ہی عزیز اور کارآمد ہوتے ہیں جتنے خود مویشی کے لیے۔ کسان اور مویشی دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اس لیے زندگی کی تکالیف کو خاطر میں نہیں لاتے کسان کتنا ہی فلاکت زدہ کیوں نہ ہو روشن خیال میاں بیویوں سے زیادہ جری اور پر امید رہتا ہے۔

گاؤں کے قریب کنویں کے سامنے سے ایک راستہ کھیت کی سمت گیا ہے ایک طرف گڑھا ہے جس میں کھاد جمع ہے دوسری طرف ببول کا پرانا کھوکھلا درخت ہے جیسے کوئی کہن سال و تمغہ یافتہ فوجی۔ جس پر دو ایک شب بیدار بزرگ اس طور سے بیٹھے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوتے ہیں جیسے پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر یورپ کے سورما تاسخ زریں پر بیٹھے ہوئے گردوپیش اور نزدیک و دور قبضہ جمانے کی فکر میں ہوں۔ عورتوں کی کچھ تعداد جمع ہوئی تھوڑی دیر تک مزید کمک کا انتظار کیا گیا۔ ان میں جو جوان تھیں کنویں کی جگت پر بیٹھیں پاؤں لٹکاتے ہوئے گنگناتی ہنستی بوڑھیوں کو برہمی و بیزاری کی دعوت دیتی ہوئی کچھ بوڑھیاں تھیں جو جگت کے نیچے بیٹھی کراہ رہی تھیں، کبھی گالیاں دیتیں کبھی کھانسنے لگتیں۔ ایک ٹولی اور آپہنچی۔ اور سب ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگیں۔ جسم کو تولتے ہوئے نوجوان لڑکھڑاتیں تو ایک ہلکی سی چیخ اور بلند قہقہہ کے ساتھ سنبھل جاتیں۔ بوڑھیوں کا قدم ڈگمگاتا تو زمیندار، وہ کسان جس کا کھیت حاشیہ پر ہوتا، موسم، پاس کے لڑکا لڑکی یا خوش خرام نوجوان عورتوں کو گالیاں دینے لگتا۔ چلتے چلتے قافلہ ایک تاریک ناقابل عبور فصیل کے سامنے رک گیا۔ یہ دیہاتی بلجیم کے قلعے تھے۔

ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ لشکر کس مہم پر روانہ ہوا تھا۔ یہاں وہ سب کچھ ہوگا جس کے لیے ہم چورن یا مار کھاتے ہیں۔ یہیں سے شاعری کا اختتام اور تعزیرات ہند کا

آغاز ہوتا ہے اور خفقان محبت کے طرح طرح کے جراثیم کا انکشاف ہوتا ہے۔ کچھ منچلے یا مظلوم پہلے سے پہنچ چکے ہیں اور کسی سے وعدۂ دیدو کے مزید کا قول و قرار ہے، وہ سراپا شوق چلا آرہا ہے اور کسی کا گدھا کھو گیا ہے وہ بھی بھٹکتا ہوا آپہنچا ہے۔ یہ ارہر کے کھیت کا کرشمہ ہے کہ بچھڑے یہاں ضرور ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی گدھے والے کا ہاتھ عشاق کی گردن پر ہوتا ہے یا خود گدھا کسی محبوب کے پہلو میں۔ کبھی یورپ میں ماسکوریڈ (جشنِ نقاب پوشی) منایا جاتا تھا ہندوستان میں اس کا سماں اکثر ارہر کے کھیت میں نظر آجاتا ہے!

جوانی کھونے کے ہندوستان میں دو بڑے جانے پہچانے مقام تھے شہر کی گلیاں اور ارہر کے کھیت! اب ان میں یونیورسٹیوں اور کارخانوں کا بھی اضافہ کر لیا گیا ہے یہاں کے بھٹکے یا راندہ درراندہ یا تو شفا خانے پہنچتے ہیں یا جیل خانے! ہسپتال سے زندگی اور جیل خانے سے موت گھبراتی ہے۔ شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا بے مرچ کا سالن یا بے تمباکو کا پان مانا کہ مرچ اور تمباکو صحت کے لیے مضر ہیں لیکن تندرستی کا مصرف تندرستی کو ہر قیمت پر قائم رکھنا ہی نہیں ہے۔ اس سے لطف اٹھانا بھی ہے شباب میں بڑھاپے کا لطف، اگر اسے لطف کہہ سکتے ہیں، اٹھانا ممکن ہے لیکن بڑھاپے میں شباب کا کیف کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شباب اور پیری دونوں حالات منتظرہ ہیں۔ ایک کا مقصود انتظار، "دشمن ایمان و آگہی" یا "رہزنِ تمکین و ہوش" بنے اور ہمیشہ عقل سے شرمسار ہونے پر اصرار ہے۔ دوسری طرف پیری ہے جو عقل ہی نہیں ہر حواس سے شرمسار رہتی ہے!

ارہر کے کھیت میں عقل سے شرمساری کی نوبت آتی ہے تو گاؤں والے بسولے سے کام لیتے ہیں اور عدالت رندے سے خبر لیتی ہے کسی منچلے شہری کا ارہر کے کھیت میں دیہاتیوں کے ہاتھ سے مار کھانا اتنا ہی دلچسپ منظر ہے جتنا کسی پبلک مشاعرے میں بھلے مانس شاعر کا اپنا کلام سنانا۔

کسان سمجھتا ہے کہ جب تک زمیندار اور پٹواری موجود ہیں اس کی ساری ملکیت منقولہ ہے الا عورت۔ شہری اس کا قائل ہے کہ جب تک یورپ اور دولت کی کارفرمائی ہے اس وقت تک سب کچھ غیر منقولہ ہے لیکن عورت۔ دیہات کا آدمی، عورت کو مایۂ عزت سمجھتا ہے، شہری وسیلۂ تفریح دیہاتی کے نزدیک عورت کا تصور یہ ہے کہ وہ اس کا مکان ہے جب ا

وہ ہنستا ہے، بولتا ہے، آرام کرتا ہے، پناہ لیتا ہے اور فشارِ حیات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تازہ دم ہوکر نکلتا ہے۔ تعلیم یافتہ کے نزدیک عورت ایک جنسی تقاضہ ہے یا ایک وسیلۂ تفنن جس کے لیے اس نے چوپائی اور ایا لو تعمیر کر لیا ہے۔ کسان پناہ اور آرام چاہتا ہے شہری عیاشی و ہوسناکی کے درپے رہتا ہے۔ گاؤں میں محنت، دیانت اور عورت ہے۔ شہری عورت کا طالب رہتا ہے لیکن محبت کے لیے نہیں لذت کے لیے!

ارہر کا کھیت دیہات کی زنانہ پارلیمنٹ ہے۔ کونسل اور اسمبلی کا تصور یہیں سے لیا گیا ہے، گاؤں کا چھوٹا بڑا واقعہ یہاں معرضِ بحث میں آتا ہے۔ فلاں کی شادی کب اور کہاں ہوئی ہے۔ داروغہ جی کیوں آئے اور کیا لے کر گئے۔ پٹواری کی بیوی نے اس سال کون کون سے نئے زیور بنوائے۔ رکمنیا کے بچے کیوں نہیں پیدا ہوتے اور سکھیا کے حمل کیسے ٹھیرا۔ ایک نے کہا میری گائے کے بچھیا ہوگی۔ دوسری بولی پہلوٹھی کی بچھیا ہو چکی ہے اب کے بچھوا ہوگا۔ اس پر اختلافِ آرا ہوا اور ہمارے لیڈروں کی طرح دونوں بھول گئیں کہ دراصل کس شغل میں مصروف تھیں اور اب کیا ہو رہا تھا۔ ایک غوغا بلند ہوا۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کھیت کے چاروں طرف سے مرد عورت بچے، گیدڑ، کتے، لومڑی، بن بلاؤ نکلنے بھاگنے لگے، جیسے اسمبلی میں بم گرا ہو!

ایک روز مقررہ وقت سے نصف گھنٹہ پہلے کلاس پہنچ گیا معلم کی حیثیت سے کلاس میں تنہا پایا جانا 'پانے والوں کے لیے بڑی دلچسپی کا موجب ہوتا ہے۔ جیسے کسی غیر متوقع مقام پر کسی نادر الوجود جانور کا ڈھانچہ مل جانا۔ ایسی صورت میں ہر اس گزر جانے والے کو مخاطب کرنا اور اس سے اظہارِ برتری کرنا ضروری ہو جاتا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہماری ہیئتِ کذائی پر سوچنے کا اہل ہے۔ اس اثنا میں ایک کتا سامنے سے گزرا اور ہم نے اس طرح سے للکارا اور آمادۂ "نقضِ امن" ہوئے گویا اردو پڑھانے کے علاوہ یونیورسٹی نے ہم کو کتوں کے دفعیہ کے لیے تھانہ دار بنا دیا تھا۔ پھر ایک بہشتی سامنے آ گیا۔ ہم نے انتہائی سرپرستانہ لہجہ میں پوچھا کیوں، اس طرف کا دروازہ کھل جانے سے تم لوگوں کو آنے جانے میں بڑی آسانی ہوگئی ہوگی؟ اس نے نہایت انکسار اور متشکرانہ انداز میں ہامی بھری۔ ابھی یہ تکلفات ختم نہیں ہوئے تھے کہ ایک خوانچہ والا دکھائی دیا۔ بولا میاں اس دروازے کی کنجی آپ ہی کے پاس رہتی ہے

دروازہ کھلنے سے بڑا آرام ہوگیا۔ رخوانچہ کے اندر جو سر پہ رکھا ہوا تھا کچھ ٹٹولتے ہوئے، خدا آپ کو سلامت رکھے یہ لیجیے بریلی کا بڑا تحفہ امرود ہے۔ اب سمجھ میں آیا کہ یونیورسٹی نے معلمین کے لیے کس مصلحت کی بنا پر گاؤن پہننا ضروری قرار دیا ہے۔ اتنے میں ایک طرف سے حاجی بلغ العلا اس طور پر جھپٹتے ہوئے نکلے گویا کملی اور داڑھی کے علاوہ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

حاجی صاحب کا عربی نام " بلغ العلے " اور فارسی " جریب زیتونی " ہے کچھ لوگ " سابق دیوانہ ہمدرد " حال ابوالجنون " کہتے ہیں۔ کچھ دنوں "خشت البنزاہ" پہ مزدور لگاتے ہوئے ان دنوں " قانون مسعودی " کا ترجمہ کر رہے ہیں۔

ملتے ہی فرمانے لگے جلدی سناؤ جلدی۔ میں نے کہا کیا؟ فرمایا کوئی اچھا سا شعر۔ میں نے کہا مثلاً۔

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے
یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی!

گردن ہلا کر " بجلوہ ریزیٔ کملی و " بہ پریشانیٔ ریش سکوتِ سخن شناس " کا اظہار کیا میں نے کہا کوئی موضوع بتایئے تو مضمون لکھوں۔ فرمایا۔

" ارہر کا کھیت "

دریافت کیا کیوں جناب اس شعر کا یہ معاوضہ، سخن فہمی کی داد دیتا ہوں، کملی کو حاجی صاحب نے جناب " کراماً کے سر سے اٹھا کر " کاتبین " پر ڈال دیا ہے میں نے سہولت کی خاطر ان " تمہ با " بزرگوں کے نام علیحدہ کر دیے ہیں) اگر کوئی صاحب ان کے نام و نشان، حسب نسب وطن اور مشاغل کی بابت اپنا ذخیرۂ معلومات وسیع کرنا چاہتے ہوں تو نیاز صاحب سے رجوع کریں۔ امید ہے کہ نیاز صاحب باب الاستفسار کے جون نمبر میں اس پر اظہار خیال فرمائیں گے۔ فرمایا نواب صاحب کہاں ملیں گے۔ میں نے کہا نواب مزمل اللہ خاں صاحب کو یہ شعر سنایئے گا۔ کہنے لگے نہیں جی وائس چانسلر صاحب، نواب مسعود یار جنگ صاحب بہادر۔ میں نے کہا ان کو سنانا ہے تو یہ سنایئے گا۔

ترا کہ زور بباز و ئے تیغ زن باقیست ۔۔۔۔۔ بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقیست

فرمایا یہ کیا، میں نے کہا اس لیے کہ

من آں علم و ہنر را با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را!

حاجی صاحب قبلہ نے کچھ اکتا کر، کچھ بے اختیار ہو کر فرمایا ارے میاں یہ سب تو ہوا۔ کلاس میں بیٹھ کر تمہارا لکچر سنوں گا۔ میں نے کہا اور کلاس کی ڈسپلن کا کون ذمہ دار ہوگا۔ فرمایا، السلام علیکم!

گواہ

گواہ قربِ قیامت کی دلیل ہے. عدالت سے قیامت تک جس سے مفر نہیں وہ گواہ ہے. عدالت مختصر نمونۂ قیامت ہے اور قیامت وسیع پیمانہ پر نمونۂ عدالت. فرق یہ ہے کہ عدالت کے گواہ انسان ہوتے ہیں اور قیامت کے گواہ فرشتے جو ہمارے اعمال لکھتے ہیں اور خدا کی عبادت کرتے ہیں.

عدالت کو قیامت اور قیامت کو عدالت کی جو حیثیت حاصل ہے، وہ گواہ کے دم سے ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے آرٹ کو عورت سے ہے، گواہ عینی ہو یا سماعی، روایتی ہو یا پیشہ ور ہر حال میں گواہ ہے اس لیے ہر حال میں خطرناک. گواہ جھوٹا ہو یا سچا عدالت کے لیے اس کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا برطانوی اقتدار کے لیے ہندوستان کی دولت اور ہندوستانیوں کی عبادت!

غالب نے انسان کو محشرِ خیال قرار دیا ہے. ممکن ہے اس کے اسباب میں وہ گواہ بھی ہوں جن کے بیان پر غالب کو اپنے عہدِ شاعری کا کچھ زمانہ جیل خانہ میں گزارنا پڑا تھا! گواہ کے تصور کے ساتھ ہمارے ذہن سے کتنے حالات و حوادث گزر جاتے ہیں. گاؤں، تھانہ، بے آبروئی، کچہری، جیل خانہ، جن کے مجموعے کا نام باغیوں نے ہندوستان اور وفا شعاروں نے

جحکومت رکھا ہے۔

اصول یہ رکھا گیا ہے کہ ہر انسان پیدائشی جھوٹا اور ہر گواہ اصولاً سچا واقعہ کچھ ہو جب تک کوئی گواہ نہ ہو اس کا عدم یا وجود یکساں ہے۔ باعتبارِ واقعہ ممکن ہے کسی حادثہ کا گواہ نہ ہو لیکن جس طرح فطرت خلا محض سے متنفر ہے اسی طور پر ضابطہ فوجداری سے متعلق جتنے واقعات ہو سکتے ہیں ان کو بھی تنہائی محض سے بیر ہے۔ جس طرح ہر خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوا یا اس کے بعض متعلقات دوڑ پڑتے ہیں اسی طرح ہر موقعِ واردات پر پولیس اور اس کے گواہوں کا پہنچ جانا لازمی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ واردات سے پہلے گواہ پہنچ گئے، جیسے کبھی کبھی پولیس واردات کے بعد جائے وقوع پر پہنچنا بہتر سمجھتی ہے۔ قومی تنزل کی مانند گواہ بھی ہر جگہ ملتا ہے۔ اگر قومی تنزل کے انکشاف کے لیے ایک لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے تو گواہ پیدا کرنے کے لیے کسی تھانے دار یا وکیل کا ہونا ضروری ہے۔

بعض مولوی وعظ کہنے سے پہلے "کلوا واشربوا" کی خوش آئند توقعات کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اسی طرح ایک تھانے دار یا وکیل کسی واقعہ یا حادثے کی تفتیش شروع کرنے سے پہلے گواہ کے ملنے یا نہ ملنے کے امکان پر غور کرتا ہے اور ان کے لیے گواہ پیدا کر لینا اکثر اتنا ہی آسان ہوتا ہے جتنا بعضوں کے لیے اولاد پیدا کرنا۔ اولاد کی پرورش یا نگہداشت کی مانند گواہ کا نباہ اور رکھ رکھاؤ بھی بڑا کٹھن کام ہے۔ کھانا، پینا، لباس، تعلیم و تربیت دونوں کے لیے لازمی ہے حادثے کی اہمیت تمام تر گواہ پر منحصر ہے۔ ایک گواہ قتلِ عمد کو حفاظتِ خود اختیاری میں اسی آسانی سے تبدیل کرا سکتا ہے جس سے کوئی تنقید نگار بے حیائی کو آرٹ میں۔ ضرورت اس کی ہے کہ مدعی ذی حیثیت ہو اور حاکمِ عدالت خطابات کا متمنی اور نوروز یا ملک معظم کی سالگرہ کا منتظر۔

پہلی عالمی جنگ میں دولِ متحارب کا مقولہ تھا کہ آدمی اور سامانِ جنگ فراہم کر دو ہم دشمن کی دھجیاں بکھیر دیں گے۔ جیسے یہ کوئی بہت بڑا راز تھا جس کا انکشاف کیا گیا تھا۔ ان کے پیش رو ایک بزرگ ارشمیدس نامی گزرے ہیں ان کا کہنا یہ تھا کہ فلکرم مل جائے تو میں زمین کا تختہ الٹ دوں۔ لیکن ان دونوں کے مقوم علیہ اعظم پولیس والوں کا دعویٰ ہے کہ گواہ فراہم

گردد تو ہندوستان میں نہ ہم کو کین فروش رہنے دیں گے نہ نان کو۔ آپ پڑھ ہر بلندی پر پرائیں جیک ہو گا اور ہر پستی پر سلام علیک!

کسی بات کے حسن و قبح کا مدار زیادہ تر اسی عہد کے ارباب اقتدار کی پسند یا ناپسند پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی مانند مقتدر شخص کسی غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ شاید اسی لیے کہ اس پر جرم ثابت کرنے کے لیے گواہ نہیں مل سکتے! ایسا ممکن بھی ہوا تو پھر اس کو جرم کا مرتکب نہیں آرٹ اور کلچر کا مفسر یا محسن قرار دیں گے۔ پولیس کا کسی کو چالان کر دینا ہی ثبوتِ جرم کے لیے کافی ہے ہندوستانی عدالت پولیس اور اس کے گواہوں کو وہی اہمیت دیتی ہے جو ہندوستانی عوام ملّاؤں اور سیاسیوں کو دیتے ہیں یعنی دونوں معصوم بھی ہیں برگزیدہ بھی۔

ہر یوریشین پیدائشی فاتح ہے اور ہر ہندوستانی سرکاری گواہ یا اقراری ملزم۔ اس طرح کے گواہ اس مصنف کی مانند ہوتے ہیں جو نازیبا خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے لیکن اس بنا پر قابلِ مواخذہ قرار نہیں دیا جاتا بلکہ لائقِ تحسین سمجھا جاتا ہے کہ اس نے حقیقت کی ترجمانی کی یا ہندوستان اور ہندوستانیوں کی توہین! سرکاری گواہ کے بارے میں تو آپ جانتے ہوں گے کہ اکثر وہ ایسا مجرم ہوتا ہے جس کے بیان پر دوسرے سزا پاتے ہیں اور خود وہ رہائی پاتا ہے!

جس طرح ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے صرف ایک قوم بنائی گئی ہے اسی طرح گواہ بننے کی صلاحیت ایک طبقے میں خاص طور پر پائی جاتی ہے۔ یعنی پٹواری جس کو گاؤں کا غیر متشدد آمر (ڈکٹیٹر) کہنا بجا ہوگا۔ انگریز کیک کھاتا ہے اور غراتا ہے، پٹواری گالی کھاتا ہے نذرانے لیتا ہے اور جو چاہتا ہے درج رجسٹر کرتا رہتا ہے۔ اس کو گاؤں میں وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو وکیلوں کو عدالت یا کلرکوں کو دفتر میں ہوتی ہے یعنی یہ سب جو چاہیں کر سکتے ہیں بشرطیکہ یہ جو چاہیں وہ ان کو ملتا رہے!

گواہ کی حیثیت سے پٹواری کی اہمیت نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ اگر مثل صحیح ہے کہ بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی تو یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ پٹواری کی توہین نہیں کی جا سکتی۔ پٹواری اس راز سے خوب واقف ہے اس کے بعد قومی لیڈر ہی اب تک جان

سکا ہے کہ جب تک حلوا مانڈہ ملتا رہے تو ہین اور توقیر بے معنی الفاظ ہیں۔ جس طرح ہندستانی کے لیے شادی اور فاقہ کشی ناگزیر ہے، پٹواری کے لیے گواہ بننا مقدر ہے۔ اس لیے وہ اپنے مسلے بستے کے بہی کھاتوں میں ایسے اندراجات کرتا رہتا ہے۔ "جو بوقت ضرورت کام آویں" صوفیانہ کلام یا سیاسی دستاویزات کی مانند اس کے اندراجات ایسے ہوتے ہیں کہ جو چاہے جس طرح تعبیر کرے مواخذے سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے اور مواخذے میں آ بھی سکتا ہے!

لالہ چرونجی لال گاؤں کے پٹواری اور گنگا دین ایک غریب کسان تھا۔ ایک مقدمے میں گنگا دین کو لالہ جی کی گواہی کی ضرورت پیش آئی۔ گنگا دین کی ساری پونجی ایک گرا پڑا جھونپڑا تھا جس کی پردہ پوشی کاشی پھل اور کدو کی ہری ہری بیل، ان کے زرد اور سفید پھول اور صبح شام کی سنہری کرنیں تھیں۔ ایک طرف اُپلوں کا منڈپ تھا۔ دوسری سمت کھاد اور کوڑے کرکٹ کا گڈھا۔ چھپر کے پیچھے کھیت تھا اور سامنے ساگ پات کی کچھ کیاریاں۔ زمیندار کسانوں پر اتنا ہی جری تھا جتنا لالہ چرونجی لال سے خائف۔ گنگا دین کے پاس کچھ مویشیان بھی تھے جس میں گائے بیل بھیڑ بکری کے ساتھ اس کی بیوی بچے بھی شامل تھے۔

ہندوستانی کسانوں کو دیکھتے ہوئے یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کے بال بچے مویشیان ہیں یا مویشیان اس کے بال بچے۔ جب سے مقدمہ شروع ہوا تھا ساری معاش و ملکیت لالہ جی کے لیے وقف تھی۔ دودھ، دہی، ترکاری ان کی رسوئی میں جاتی گنگا دین چلم بھرتا تھا اس کی بیوی للائن کی خدمت گار تھی۔ لڑکے لڑکیاں لالہ جی کے بچوں کو کھلاتے بہلاتے۔ یوں تو ہر پٹواری عدالت کا کیڑا ہوتا ہے جب تک وہ عدالت کی زیارت نہ کرلے اس کی زندگی بے کیف و معنی رہتی ہے لیکن جب سے گنگوا کا مقدمہ شروع ہوا تھا لالہ جی نے عدالت کا ذکر و فکر کم کر دیا تھا۔ گنگوا جب کبھی اس معاملہ کو چھیڑتا تو کہتے بھائی دن بڑے ہیں۔ تھانہ عدالت سے دور ہی رہنا اچھا۔ پتا جی کا حال تو جانتے ہو سچی بات پر جیل خانہ کاٹنا پڑا کوئی سسرا کام نہ آیا۔ گنگا دین لالہ کے پاؤں پکڑ لیتا گڑگڑانا شروع کرتا اور جلد جلد ان کے پاؤں دبانے لگتا تو لالہ جی پاؤں ڈھیلے رکھتے لیکن زبان سے ہائیں ہائیں کہتے جس طور پر ڈاکٹر یا وکیل فیس کے لیے جیب ڈھیلی کرتا جاتا ہے لیکن زبان سے کہتا رہتا ہے ارے آپ یہ کیا کر رہے ہیں یا اس کی کیا ضرورت

تھی۔ لالہ کی نگاہیں گنگوا کی زمین چھپر اور مویشیوں پر تھیں اور گنگوا کی نظروں میں بیوی بچوں کی تباہی کا نقشہ پھر رہا تھا۔ بالآخر لالہ کی فتح ہوئی اور گنگوا دستاویزی غلام بنا مقدمہ کی تاریخ آئی اور دونوں کچہری کو روانہ ہوئے۔

کچہری کا راستہ شہر سے گزرتا تھا۔ چلتے چلتے یکایک لالہ کے قدم سست پڑنے لگے، سامنے جوتے والے کی دکان تھی۔ لالہ جی کھڑے ہو گئے۔ فرمایا جوتا ٹوٹ گیا ہے چلنا پھرنا دوبھر ہے۔ مہنگے سمے روز روز شہر آنا نہیں ہو سکتا۔ گنگوا سمجھ گیا۔ اس نے دام ادا کیے لالہ جی نے جوتے قبضے میں کیے۔ دونوں آگے بڑھے۔ کچھ دور چلے تھے کہ بزاز کی دکان آگئی۔ لالہ جی اس طرح رک گئے جیسے جوتے میں کنکری آگئی ہو جسے اطمینان سے نکالنا چاہتے ہوں۔ بولے بھائی گنگوا اس پھٹی پرانی پگڑی میں عدالت کے سامنے گئے تو حاکم جلاد ہے کھڑے کھڑے عدالت سے باہر نکلوا دے گا۔ تمھارا کام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔ گنگوا گھبرایا کہنے لگا لالہ دیر ہو رہی ہے عدالت میں پکار ہونے لگی ہوگی۔ ہرج کیا ہے واپسی میں لے لینا۔

لالہ نے تیوری بدل کر کہا اچھی کہی۔ تمھاری کوڑیوں کی خاطر اپنی لاکھ روپے کی آبرو پر پانی پھر جانے دوں۔ جاؤ نہیں جاتے۔ ڈاکٹر گوکل پرشاد سے سارٹیفیکیٹ لکھوا کر داخل کر دیں گے کہ مسمی لالہ چیرونجی لال کو ہیضہ ہو گیا اس لیے حاضرِ عدالت نہ ہو سکا۔ گنگوا ہیضے کے امکان پر ابھی اچھی طرح خوش نہیں ہو پایا تھا کہ لالہ جی بزاز کی دکان کے سامنے تختے پر اس طرح لیٹ گئے جیسے ہیضے میں مبتلا ہو جانے کا اعلان یا انتظار کر رہے ہوں۔ بالآخر پگڑی کا کپڑا خرید لیا گیا!

کچھ اور آگے بڑھے تھے کہ حلوائی کی دکان سامنے آئی۔ لالہ کچھ اس طرح رکے جیسے کوئی ضروری بات دفعتاً یاد آگئی ہو۔ فرمایا گنگا دین دیکھو کیسی چوک ہوئی جا رہی تھی درگا جی کی پرشاد لینا بھول گئے۔ کسان تو تم پرست ہوتا ہے جیسے ہم آپ مطلب پرست۔ ایک طرف اس کی آنکھوں میں پورے کنبہ کی تباہی کا نقشہ پھر گیا دوسری طرف مقدمے کے انجام کا منظر سامنے آیا۔ کچھ نہیں بولا۔ لالہ جی کو سیر بھر جلیبی دلوادی۔ یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ دونوں کچھ دیر تک خاموش چلتے رہے۔ گنگوا اس فکر میں مبتلا کہ لالہ کی سخت گیری کا یہی حال رہا تو دوپہر کے

جینے کے لیے بھی پیسے نہ بچیں گے۔ لالہ اس پھیر میں کہ گنگوا کو اور کس طرح نچوڑا جائے۔

معلوم نہیں گنگوا امید یا ناامیدی کی کس منزل میں تھا۔ لالہ کے ذہنِ رسا نے جلد ہی کمان وکمیں دونوں متعین کر لیے۔ بولے اس پُروَیا نے ناک میں دم کر رکھا ہے مہینے بھر سے گٹھیا کا زور ہے تمھارا بیچ نہ ہوتا تو پٹیشر جاتے اس حال میں کبھی گھر دوار نہ چھوڑتا۔ یہ کہتے کہتے ایک سایہ دار درخت کے نیچے انگوچھا بچھا کر لیٹ رہے اور اس چلم کا انتظار کرنے لگے جو ایک خوانچہ والا پیے جا رہا تھا۔ خوانچہ والے نے معزز مہمان کی توجہ کو اپنے لڈّو اور مرمروں کی طرف مائل کرانا چاہا۔ بولا لالہ کچھ جل کھا وا ہو جائے۔ ایسے نے کدھر آنکلے ذرا دم لے لو۔

گنگوا کا یہ حال کہ بس چلتا تو لالہ جی خوانچہ والا اور خوانچہ سب کو پاس کے کنوئیں میں ڈھکیل کر خود بھی کود پڑتا لیکن بے بسی وہ بلا ہے جو ہر طرح کے غم، غصّے اور غرور کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ گنگوا نے کہا لالہ جی ہم پر دیا کرو سورج دیوتا کہاں آئے۔ عدالت کب تک پہنچیں گے لالہ نے کراہ کر بے رخی سے جواب دیا۔ بھیّا اپنے آپ کی سیوا نہ کریں تو کون بھڑوا بال بچّوں کو دیکھے گا۔ تم عدالت جاؤ ہمار تو پران نکلا جات ہے۔ ارے باپ رے۔

خوانچہ والا بولا، لالہ دھیرج دھرو۔ یہ لو چلم پیو۔ کچھ کھا پی لو، عدالت میں بیان حلفی داخل کر دینا۔ اس دوران میں ایک خالی یکہ گزرا۔ خوانچہ والا بولا ارے بھائی لالہ جی کا جی اچھا نہیں ہے یکّے میں کیوں نہیں بٹھا لیتا۔ یکّہ والا رک گیا۔ لالہ جی نے کروٹ بدلی۔ خوانچہ والے نے لالہ کو لڈّو اور مرمرے کھانے اور ٹھنڈا پانی پینے کی دعوت دی یہ کہتے ہوئے کہ عدالت کا معاملہ ہے معلوم نہیں کب کھانے پینے کی نوبت آئے۔ گنگوا نے چند آنے خوانچہ والے کو نذر کیے لالہ جی یکّے والے کی دعوت پہلے سے قبول کر چکے تھے۔ ایک کراہتا دوسرا کوستا دونوں یکّے میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

عدالت میں پکار ہوئی۔ لالہ نے پگڑی اور بستہ سنبھالا۔ چپراسی لالہ جی کا آشنا نکلا۔ گردن میں ہاتھ دے کر ایک دشنام زیرلبی کے ساتھ جھونکا دیا تو لالہ جی گواہوں کے کٹہرے میں داخل تھے۔ شام تک سوال جواب ہوتے رہے۔ لالہ جی نے موافقت میں گواہی دی نہ مخالفت میں اس دوران میں عدالت، وکلا، فریقین، چپراسی، حاضرین سب نے باری باری

لالہ جی کو انہی اپنی پسند کی گالیاں دیں. طرح طرح سے ڈراتے دھمکاتے رہے لیکن لالہ کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی.

کچہری برخاست ہوئی. لالہ باہر نکلے. یکّہ والوں کا ہجوم تھا کسی پر ایک سواری تھی وہ دوادر کی فکر میں تھا کسی پر دو تھیں وہ ایک کا متلاشی تھا. اس دھر پکڑ میں لالہ وارد ہوئے. سر پر نئی پگڑی، پاؤں میں نیا جوتا. ہاتھ میں دن بھر کا سمیٹا ہوا مالِ غنیمت. بغل میں غیر فانی لیکن ناشدنی بستہ، چاروں طرف سے چابک بدست لنگوٹی بند یکّہ والوں نے گھیر لیا. ایک نے بستہ چھین کر اپنے یکّہ پر رکھ لیا. دوسرے نے گٹھری اپنے قبضے میں کی. تیسرے نے خود لالہ کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا اور کچھ دور تک گھسیٹتا ہوا لے بھی گیا اس رستاخیز میں پگڑی نے سر سے اور جوتے نے پاؤں سے مفارقت کی جن کو دوسرے یکّہ بانوں نے تبرکاً اپنے اپنے یکوں پر رکھ لیا. یہ سب آنکھ جھپکاتے ہو گیا.

اب جو دیکھتے ہیں تو میدان صاف تھا. سارے یکّے والے چل دیے تھے اور لالہ جی بیک بینی و دوگوش اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ دنیا کا آئندہ آشوب کون ہو گا۔ یکّہ بان یا پٹواری.

شیطان کی آنت

میں اکثر غور کرتا رہا ہوں کہ آخر شعرا دردِ گردہ میں کیوں نہیں مبتلا ہوتے۔ اور مبتلا ہوئے تو انھوں نے اس کا ذکر اپنے کلام میں کیوں نہیں کیا؟ یہ احساس اس وقت خاص طور پر ہوا جب میں اس درد کے دورے یا ان کے کلام کے مطالعہ میں مبتلا ہوا۔ یہ شعرار اعضاء رئیسہ کی ہر قسم کی بیماری میں مبتلا پائے گئے جن میں دل و جگر خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اس قسم کے شاعرانہ امراض اور ان کے اثرات شعرائے لکھنؤ کے کلام میں زیادہ ملتے ہیں چنانچہ اس دفعہ بیمار پڑا تو اطبائے لکھنؤ سے رجوع کرنے کے لیے علی گڑھ سے روانہ ہو گیا۔

ہر مرض کی ایک حد ہونی چاہیے۔ ورنہ مریض کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ حد سے گزر جائے جس طور پر ہمیشہ تندرست رہنا بد مذاقی ہے اسی طرح ہر وقت بیمار رہنا بد توفیقی ہے۔ چونکہ یہ دورِ ترقی کا زیادہ تہذیب کا کم ہے یعنی تم جو چاہو کر سکو یا نہیں تمہاری بیویاں کر سکتی ہیں، میں نے گردے کی مدتوں تالیفِ قلب کی لیکن جب دیکھا کہ میری چشم پوشی یا درگزر کو یہ روشن خیال بیوی کی مانند میری نیازمندی پر محمول کرنے لگے ہیں تو پھر اس اندیشہ سے

کر شوہر کے بجائے کہیں مہذب ہی نہ رہ جاؤں ایک دن گردے کو نوٹس دے دیا کہ میرا سلوک اب تک تمھارے ساتھ شریفانہ رہا اور میں نے تمھاری زیادتیوں پر چشم پوشی کی اس لیے آخری بار تنبیہ کرتا ہوں کہ اپنی حرکات سے باز آجاؤ ورنہ میں وہی کروں گا جو عاجز آکر ایک جاہل شریف آدمی کیا کرتا ہے۔

اس نوٹس کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا بلکہ گردے نے اور ہاتھ پاؤں پھیلائے اور نہایت بے باکی کے ساتھ اپنا اقتدار جگر اور معدے کے حدود میں پھیلانے لگا لیکن اطبائے نے یہ تشخیص کیا کہ یہ کرتوت جگر اور معدے کا ہے، گردہ صرف بدنام ہے بحیثیت ایک جدید الخیال حکمراں کے جو صرف ماہرین فن کے فتاوئی پر حکومت کرتا ہے میں ان وفا شعاروں سے بدظن ہوگیا۔ بادشاہ کی بدظنی کے معنی جنگ اور خونریزی کے ہیں۔ چنانچہ ان کے خلاف معجون عرقیات جوشاندہ سفوف وحبوب کے حربے استعمال کیے گئے۔ ان غریبوں نے واویلا شروع کردی کہ یہ سب گردے کی بالشوزم یا شہنشاہیت تھی وہ بجائے خود ازل سے وفادار و خیر اندیش برطانوی رعایائے ہند ہیں۔ چنانچہ ایک رات جب زلفِ شب گردہ تک پہنچ چکی تھی علی گڑھ سے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگیا۔

کئی دن تک جھنوائی ٹولہ میں محبّ مکرم حکیم عبداللطیف صاحب کا مہمان رہا اس دوران میں حکیم صاحب کی شہ پاکر کھانے پینے میں جی بھر کے بدپرہیزی کرتا اور ان کے تانگے پر تمام دن میڈیکل کالج ہسپتال کا گز بنا رہتا۔ ایک بار خیال آیا کہ اطبائے جھنوائی ٹولہ کو بھی کیوں نہ دکھاؤں ایسا کیا بھی لیکن کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ اور ایسی ایسی ثقیل زبان میں مرض کی تشخیص کرتے رہے کہ اس کی تفصیل پوچھنے کی ہمت نہ پڑی کہ خدانخواستہ کوئی اتنا ہی جبر ثقیل مرض نہ ہو۔

یہاں حکیم صاحب کے تانگے اور گھوڑے کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے اس تانگے میں سوار ہونے سے بہت سی پرانی تکالیف زائل اور اتنی ہی نئی پیدا ہوجائیں گی گھوڑا جبشی خواجہ سرا ہے یعنی منتکی اور آخته! آپ سوار ہونے کا ارادہ کریں گے۔ یہ چل دے گا۔ حکیم صاحب نے اس کی اطلاع پہلے سے دے دی تھی لیکن مجھے کوئی تردد نہیں ہوا اس لیے کہ آپ دوسرے دوست سید محمد عبدالجلیل صاحب پراکٹر مسلم یونیورسٹی کے تانگے پر بیٹھ چکا تھا

جو سیلف اسٹارٹر اور رنگ اسٹارٹر دونوں تھا۔

حکیم صاحب کے تانگے پر بیٹھ کر کوئی شخص نہ اپنے آپ کو محفوظ خیال کر سکتا تھا نہ دوسروں کو جو سڑک پر چل رہے ہوں یا دکان پر بیٹھے ہوں۔ چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ تیور جیسے کسی دیہاتی تھانے کا تھانیدار۔ کسی کو نہیں معلوم کس وقت یہ سڑک چھوڑ کر کسی دکان میں داخل ہو جائے گا یا تانگے سمیت بالاخانے پر چڑھ جائے گا۔ گومتی سے متصل سڑک پر اس بے پناہ رفتار سے چلا جا رہا تھا جیسے رفتار کا ریکارڈ قائم کرنے کے لیے کوئی شخص سمندر کے کنارے ریت پر موٹر چلا رہا ہو۔ جادۂ مستقیم سے ذرا انحراف ہو جائے تو یہ تانگہ اپنی مشمولات کے ساتھ دریا میں جا رہا ہے۔ لکھنؤ میونسپل بورڈ نے سڑک اور دریا کے درمیان کوئی آڑ نہیں قائم کی ہے اس فروگذاشت کا جو شخص ذمہ دار ہو اسے حکیم صاحب کے اس تانگے پر سوار کر کے ریور بنک روڈ کی طرف ہانک دینا چاہیے۔

برف حکیم صاحب کی ایسی ایک کمزوری ہے جس پر وہ نہ کبھی قابو پا سکے۔ گرمی کے موسم میں برف نہ دستیاب ہو اور یہ معلوم ہو کہ صرف قطب شمالی پر مل سکتی ہے تو وہ اپنے تانگے پر قطب شمالی کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ ایک دن ہم دونوں اس تانگے پر ہسپتال گئے۔ مختلف مقامات پر آتے جاتے اور زینوں پر چڑھتے اترتے دوپہر ہو گئی۔ دھوپ کی شدت لو کے تھپیڑے دفعتاً حکیم صاحب پر پیاس کا غلبہ ہوا مجھے ساتھ لے تانگے پر بیٹھ چوک کے لیے روانہ ہو گئے۔ تانگہ چوک میں اس طرح داخل ہوا جیسے کوئی بھونچال آ گیا ہو۔ کسی دکان کے پرے سے الجھا کسی کا سائن بورڈ سربسجود ہو گیا کتنے برف والوں کی دکانیں راستے سے گزر گئیں کتنے اپنے اپنے اعضا کی خیر مناتے، ہم کو گھورتے یا گالی دیتے ہوئے۔ ادھر ادھر کترا گئے۔ میرا بیٹھنے اور چوکنا رہنے کا انداز ان جاکیوں کا تھا جو ریس میں گھوڑوں کی پشت پر نظر آتے ہیں۔ گھوڑے نے ایسے مقام پر جا کر دم لیا جس کے ایک طرف کارگاہ شیشہ گراں دوسری سمت مٹی کے رنگین کھلونے بیچنے والوں کی دکان اور بالاخانوں پر

"ڈھونڈنے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس!"

ہم دونوں تانگے سے اتر پڑے اور اسے بہ وقت تمام ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا گیا

جس کے سامنے ایک طویل سائبان جیسی عمارت تھی۔ ہم شربت پینے کی مہم پر روانہ ہوگئے۔ ابھی گلاس ختم نہیں کر پائے تھے کہ اک "شورِ مردم خیز" اٹھا جاکر دیکھتے ہیں تو گھوڑا تانگے سمیت سائبان میں داخل ہے اور سامنے کی دیوار پر چڑھ جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ گھوڑا تانگہ کوچوان، تماشائی سب کے سب "دست افشاں پائے کوباں نعرہ زناں" لڑکے تالی بجا رہے تھے، عورتیں چیخ رہی تھیں بوڑھے لعنت بھیج رہے تھے، کچھ نوجوان بے فکرے ہماری مدد کر رہے تھے اور کچھ گھوڑے تانگے کو شہ دے رہے تھے غرض کسی نہ کسی طرح تانگہ نکالا گیا اور ہم وہاں سے واپس ہوئے۔

چاہا تھا کہ آپریشن کی خبر عام نہ ہو پائے۔ لیکن ہوا یہ کہ یہ سب کو معلوم ہوگیا بزرگوں، عزیزوں، دوستوں کی آمد شروع ہوگئی محبت اور شفقت کی کیسی کیسی باتیں سننے اور کیسے مظاہرے دیکھنے میں آئے۔ جہاں تک ہوسکتا تھا کچھ اپنی طرف سے بہت کچھ خدا کی طرف سے کبھی ان کو کبھی اپنے کو اطمینان دلاتا تھا۔ جو ہونے والا تھا ٹھیک تھا۔ اس لیے اور بھی کہ بیماری کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہوچکی تھی!

بالآخر یورپین وارڈ کے ایک کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا! کشادہ، ستھرا، روشن، خوب صورت کمرہ آرام دہ نرم سفید بستر، صاف شفاف غسلخانہ، مستعد خدمت گزار، خوب صورت نرسیں۔ لیکن ان تمام خوبیوں سے مرصّع یا مسلّح چیر پھاڑ اور مرہم پٹی کا وہ سامان تھا جو ایک طرف میز پر ہماری پذیرائی کے لیے چشم براہ تھا، جن کو دیکھ کر آرزوؤں کے بہت سے غنچے کھلنے سے پہلے مرجھانے لگے۔ کھانے پینے کی اچھی سے اچھی چیزیں فراہم کی جانے لگیں۔ مقررہ اوقات میں احباب واعزا آتے اور اپنے خلوص ومحبت سے شادماں وشاد کام کر جاتے۔

اس کے ساتھ ہسپتال کے جتنے متعلقہ ڈاکٹر یا طالب علم تھے جب جی چاہتا اس عجوبۂ روزگار مریض کو کبھی تنہا کبھی گروپ میں آکر دیکھ جاتے طرح طرح سے بیان لیتے اور جرح کرتے۔ دوسری طرف آپریشن کی تیاری کے سلسلے میں مریض کے ساتھ جتنے نرم گرم سلوک کیے جانے تھے وہ سب کیے جانے لگے۔ دو ہی ایک دن میں وہ سارے حوصلے پست ہوگئے

جو یہاں پہنچ کر پہلے دن ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔ مرض کی داستاں سناتے سناتے اور آپریشن کے خیر مقدم میں بعض نامعقول آداب بجالاتے لاتے ادھ موا ہو گیا۔ ایسا نہ کیا جائے تو شاید یورپین وارڈ کی عیش سامانی اور فضا مریض کو ہسپتال کی ڈسپلن میں طرح طرح سے مخل ہونے پر مختار بھی کردے اور مجبور بھی!

آپریشن سے ایک دن پہلے سب نے دلاسا دیا۔ ڈاکٹروں نے اپنے طور پر نرسوں نے اپنے انداز سے عزیزوں اور دوستوں نے اور طریقوں سے۔ بالآخر وہ صبح آئی جب نوٹس ملا کہ پندرہ منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ۔ میں نے وضو کیا دو رکعت نفل ادا کی۔ اور دعا مانگی خدایا جو کچھ پیش آرہا ہے وہ بالکل درست ہے اب تک تو نے مجھ پر جو احسان کیا ہے تو علیم ہے مجھے اس کا کیسا اقرار ہے اور تیرا کتنا شکر گزار ہوں۔ ایک تمنا یہ ہے کہ اگر آخر وقت آگیا ہے تو میری یاد کو مجھ سے محبت کرنے والوں کے لیے آسان کردے۔ زندگی میں میں نے تجھے اکثر بھلایا ہے اس کے گواہ بہت ملیں گے لیکن اس وقت صرف تجھے یاد کر رہا ہوں۔ اس کا گواہ صرف تو ہے۔ اس کے بعد ایک ڈاکٹر نے مورفیا کا انجکشن دیا اور دو خدمت گاروں نے بیماروں کی کرسی پر بٹھا کر آپریشن تھیٹر پہنچا دیا۔

کرسی سے اتر کر آپریشن تھیٹر میں داخل ہوا۔ جو میز بتائی گئی اس پر لیٹ گیا۔ سرہانے سے ایک ڈاکٹر نے کلوروفارم دینا شروع کیا۔ خیال آیا دیکھوں کلوروفارم کا اثر کس طور پر ہوتا ہے اس لیے ارادہ کر لیا کہ ہو سکے تو بیہوش ہو جانے میں عجلت سے کام نہ لوں بلکہ کلوروفارم کے اثر کی مدافعت کروں نتیجہ یہ ہوا کہ دیر تک کلوروفارم دیتے رہے لیکن بے ہوشی طاری نہ ہوئی البتہ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چیز حلق میں رہ رہ کر اٹکتی اور سوزش پیدا کرتی ہے۔ یہ تجربہ تکلیف دہ ثابت ہوا اس لیے مدافعت ترک کر دی چند ہی سکنڈ میں ایسا معلوم ہوا جیسے دماغ دھنی ہوئی روئی کے مانند تھا جس کو آگ دے دی گئی ہو، پھر خبر نہیں کیا ہوا۔

آنکھ کھلی تو کمرے میں تکیوں کے سہارے لیٹا ہوا پایا۔ سر پر بھیگا ہوا تولیہ لپٹا ہوا تھا۔ نہ آپریشن کی کوئی تکلیف تھی اور نہ کلوروفارم کا کوئی اثر۔ کمزوری معلوم ہوتی تھی پرائیوٹ نرسیں رکھ لی تھیں۔ پوچھا کیسا آپریشن رہا۔ جواب دیا نہایت کامیاب لیکن خاموش رہو۔ مجھ پر بھی کچھ تکان سی غالب تھی تھوڑی دیر میں

نیند آگئی سہ پہر میں آنکھ کھلی تو چھوٹے بھائی کو جنہیں ہمہ وقت ساتھ رکھنے کی اجازت لے لی گئی تھی قریب پایا کچھ دیر تک آپریشن کا حال پوچھتا رہا۔ پیاس کا غلبہ تھا۔ سنترے کا تھوڑا سا عرق پیا پھر سو رہا۔ رات ہوئی اور تکالیف کا آغاز ہوا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے گردہ کی مضافات کی رگیں آتشِ سیّال بن گئی ہوں اور دردِ گردہ پوری شدّت سے عود کر آیا ہو کیسی بھیانک تکلیف تھی۔ ڈاکٹر نے آکر مورفیا کا انجکشن دے دیا اور صبح تک کے لیے غافل ہو گیا۔ یہ حالت شب میں تین چار روز رہی اور مورفیا کا انجکشن دیا جاتا رہا۔ لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ نیند لانے کے لیے منوّم دواؤں کا محتاج ہونا اچھا نہیں۔ کوشش کرو کہ نیند خود آجایا کرے۔ چنانچہ انجکشن کا سلسلہ بند کر دیا گیا اور کچھ دنوں بعد نیند حسبِ معمول آنے لگی۔

مگر چند راتیں جس کرب سے گزریں وہ بھی نہ بھولیں گی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ یہ سب اعصاب کا کرشمہ ہے۔ چونکہ گردہ نکالا گیا ہے اس لیے متعلق جتنے اعصاب ہیں ان میں کرب پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کیفیت عارضی ہے خود بخود جاتی رہے گی۔ لیکن اس سمجھانے کے باوجود کچھ دنوں آہ و بکا و اظہارِ مایوسی و درماندگی کا مظاہرہ اس طرح کرتا رہا کہ تیماردار پریشان ہو گئے اور نرسوں اور ڈاکٹروں نے درشت لہجے میں میری خبر بھی لی۔ چار پانچ دن بعد تکالیف میں تخفیف شروع ہو گئی۔ ساتویں دن ٹانکے کاٹ دیے گئے اور سہارے سے اٹھنے بیٹھنے لگا۔

اب تاکید کی جانے لگی کہ "کھاؤ پیو اور ٹہلو۔" موسم گرما اور خربوزے دونوں شباب پر تھے لکھنؤ میں قیام کر کے لکھنؤ کے خربوزے کبھی نہیں کھائے تھے۔ اس کا بھی لطف اٹھایا۔ لکھنؤ ہی میں صبح و شام کے تازے اور باسی خربوزوں کی لطافت اور لذت میں فرق آجاتا ہے چہ جائیکہ نقل و حمل کے مختار سے گزار کر ان کو باہر لے جایا جائے اور پھر کھانے کی نوبت آئے۔ اہلِ لکھنؤ کا تو یہاں تک خیال ہے کہ فالیز پر جا کر کھانے اور گھر پر لا کر کھانے سے لذت و خوشبو میں فرق آجاتا ہے۔

آج کل طرح طرح کے علاج دنیا میں رائج ہیں۔ غذا سے، پانی سے، دودھ سے، روشنی سے، نمک سے، جھاڑ پھونک سے۔ غالباً وہ دن بھی دور نہیں جب خربوزے سے بھی علاج کیا جانے لگے گا۔ مثلاً مایوس العلاج کا علاج لکھنؤ کے خربوزوں سے اور بقیہ کا دوسرے مقامات

کے خربوزے سے البتہ بہرحال میں پر ہیز علی گڑھ کے خربوزے بتایا جائے گا۔ لکھنؤ کے پھلوں میں جہاں ذائقے لطافت، خوشبو کے نازک سے نازک مدارج ملیں گے، علی گڑھ کے پھلوں میں صورتِ حال بالکل برعکس ہوگی۔ اس تن و توش کے بدمزہ اور بے مزہ خربوزے شاید ہی کہیں اور ملیں۔ ان میں سب سے غنیمت وہ ہوگا جو بے مزہ ہوگا۔ اگر مساوات کے تقاضوں کی بنا پر ان کو بھی دوا کے مصرف میں لانا ضروری ہو تو پھر ان کو حسبِ تاکید و تدہین کی شکل میں استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔ وہ بھی کسی خرپز (خربوزوں سے علاج کرنے کا ماہر) کی براہِ راست نگرانی میں!

آموں کی بھی فصل شروع ہو چکی تھی۔ آموں کی بعض اقسام لکھنؤ سے بہتر کہیں اور نہ ملیں گی۔ ان کے حسب و نسب پر اظہارِ خیال کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ دوستوں اور عزیزوں نے ان پھلوں کے علاوہ لکھنؤ کی مشہور مٹھائیوں، کھانوں اور دوسری اچھی چیزوں سے جس میں ان کی محبت سب پر غالب تھی جس جس طرح مجھے نوازا وہ بھی بھول نہیں سکتا۔ تعجب ہے لکھنؤ کی ان نعمتوں اور نفاستوں کا اثر سب پر خاطر خواہ پڑا سوا وہاں کی شاعری کے بہرحال اپنے مرض اور لکھنؤ کا میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر استطاعت ہو تو مریض کو اپنا علاج خربوزہ اور آموں کی فصل میں لکھنؤ میڈیکل کالج کے ہسپتال میں یورپین وارڈ میں رہ کر کرانا چاہیے۔

ہسپتال کا ماحول طبیعت پر افسردگی طاری کر دیتا ہے ہر سمت قدم قدم پر مرض، تکلیف اور بے بسی کا احساس ملتا ہے۔ جس کو تندرست ڈاکٹر اور تندرست نرسوں کی مستعدی، مصروفیت اور مسلسل آمد و رفت اور زیادہ وحشت انگیز بنا دیتی ہے۔ صفائی اور باقاعدگی بڑی اچھی چیزیں ہیں، لیکن ہسپتال اور جیل خانے کی صفائی اور باقاعدگی مجھ پر وہ خوش گوار اثر نہیں ڈالتی جتنی کہیں اور کی۔ لیکن اس تصویر کا دوسرا رخ اتنا ہی روشن بھی ہے۔ عرفی کو آستانۂ محبوب سے

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم!

کہتے ہوئے واپس آنا پڑا تھا لیکن اچھے ہسپتالوں میں مریض مایوس آتا ہے اور بالعموم شادکام واپس آ جاتا ہے۔ اردو شعرا درد اور دوا دونوں کے لیے کوچۂ محبوب میں آمد و رفت رکھتے ہیں اس لیے شعر بھی اسی قسم کے کہتے ہیں۔ چونکہ داخلِ ہسپتال بہت کم ہوتے ہیں اس لیے

"ہمہ درد آمدہ بودم ہمہ نغمہ رفتم" کے انداز کے شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوتا۔

سائنس، ایجادات اور مشق و مہارت نے فنِ جراحت کو کس درجہ حیرت انگیز بنا دیا ہے۔ مشکل تصور میں آسکتا ہے۔ لکھنؤ میڈیکل کالج اور ہسپتال کے سرجن ڈاکٹر آر۔ این بھاٹیہ نے میرا آپریشن کیا تھا۔ انھوں نے جتنی جلد اور جس وثوق سے مرض کی تشخیص کی وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ پھر جس دلنشیں انداز سے مرض کی نوعیت اور آپریشن کی ضرورت بتائی وہ بھی کم ڈاکٹروں کے حصّے میں آیا ہوگا۔ میں نے کسی قدر فکر مند ہوکر دریافت کیا اور آپریشن کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے کے بارے میں پوچھا تو فرمایا جسم میں سوئی چبھنا بھی خطرے سے خالی نہیں لیکن تردّد کی بات نہیں ہے کوئی دقّت یا نزاکت پیش نہ آئے گی۔

آپریشن ہوگیا اور جتنی تکالیف تھیں وہ گردے کے ساتھ اب لکھنؤ میڈیکل کالج کے عجائب خانے میں منتقل ہوچکی تھیں۔ جسم کے ماؤف حصّے کو اس طور پر کاٹ کر پھینک دینا یا اس کی اصلاح کر دینا کہ نظامِ جسمانی میں کوئی خلل نہ آئے اور وجہ آزار دور ہوجائے کتنا بڑا اور مشکل کام ہے جسے انسان کے حوصلے، عقل، محنت اور محبت نے پورا کر دکھایا ہے۔ پھر اس خیال سے کتنی راحت اور تقویت محسوس ہوتی ہے کہ زمانہ کی ترقّی کے ساتھ انسان بیماری، مفلسی، جہالت اور خوف کے کیسے کیسے عذابوں سے نجات پا جائے گا اور آسودگی، صلح اور آرزومندی کی زندگی بسر کرنے لگے گا۔ آج سے پہلے جب بلا اور بیماری کو دور کرنے کی تدابیر انسان کے قابو میں نہیں آئی تھیں کیسی کیسی عزیز جانیں کس عذاب اور بے بسی سے تلف ہوئیں، ان کا خیال آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحمید صدیقی ہاؤس سرجن تھے اور میری دیکھ بھال ان کے سپرد تھی۔ کتنے محنتی محبتی اور اپنے فن میں طاق ہیں۔ کسی وقت سرجری میں وہ اپنے استاد ڈاکٹر بھاٹیا کے ہمسر بن جائیں گے۔ اس میں اتنا عرصہ لگے گا جتنا "فتنہ" کو "قیامت" ہونے میں لگتا ہے۔ ایک دن بیمار ہوکر پاس کے کمرے میں آگئے۔ ملیریا کی گرفت میں تھے لیکن جس طرح سے انھوں نے ملیریا کی توہین کی تھی، اس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ مرض پھر کبھی ان سے اختلاط پیدا نہ کرے گا۔ ڈاکٹر ظریف ہاؤس فزیشین تھے۔ اکثر آجایا کرتے تھے۔ علی گڑھ کے گنہ گاروں میں

ہیں۔ وہی خلوص یگانگت اور بے تکلفی جو علی گڑھ والوں میں ملتی ہے۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو علی گڑھ میں طالب علمانہ زندگی نہیں بسر کر سکے ہیں۔ کسی علی گڑھ والے کے سامنے علی گڑھ کا نام لیجیے پھر دیکھیے وہ کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اپنے مصائب اور مناصب سب بھول جائے گا۔ اس کا تصور زمان و مکان سے آزاد کر کے اس کو کالج کی آغوش میں پہنچا دے گا۔ وہی کمرے وہی ڈائننگ ہال، وہی مسجد وہی یونین، وہی کچی بارک وہی کرکٹ فیلڈ، وہی شرارتیں صحبتیں اور سرگرمیاں جن سے وہ اب دور اور محروم ہے!

جب کبھی علی گڑھ سے باہر گیا اور کسی علی گڑھ کے طالب علم سے ملاقات ہوئی تو ایسا معلوم ہوا جیسے کالج ہی میں ہوں۔ اجنبی یا غریب الدیار محسوس کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کسی تکلف یا تصنع کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی اپنے اعزا سے بھی تکلف سے ملنا پڑتا ہے لیکن علی گڑھ اتنا بڑا خاندان ہوتے ہوئے ایسا خاندان ہے جس کے کسی فرد سے ملنے میں کسی طرح کی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ جیسے فریقین کے پاس ایک دوسرے سے چھپانے کی کوئی بات نہ ہو۔ اگر ایک وائسرائے ہے اور دوسرا صرف ایک کلرک لیکن دونوں پروردۂ علی گڑھ ہیں تو اس طور پر ملیں گے گویا دونوں ایک سطح پر ہیں۔ وہ سطح جو علی گڑھ نے قائم کی ہے اور جس پر خود علی گڑھ قائم ہوا۔

ایک بار کسولی (مضافات شملہ) کا سفر کر رہا تھا۔ انبالہ کے اسٹیشن پر آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ نقدی کا بٹوا تکیہ کے نیچے سے غائب ہے۔ علی گڑھ سے دور اجنبی مقام پر جب کہ سفر کا کافی حصہ باقی تھا اس حادثے کے پیش آ جانے سے پریشانی ہوئی۔ کالکا پر اتنی دیر ٹھہر بھی نہیں سکتا تھا کہ روپے کے لیے علی گڑھ تار دیتا۔ خیال آیا کہ دیکھوں کوئی علی گڑھ کا آدمی تو نہیں سفر کر رہا ہے۔ پلیٹ فارم پر تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک صاحب میری طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ سلام کیا میں نے جواب دیا اور پوچھا مجھ سے واقف ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ علی گڑھ کے طالب علم ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں اس لیے ملنے آ گئے تھے۔ میں نے کہا میرے روپے چوری ہو گئے اگر آپ کے پاس کافی روپے ہوں تو کچھ مجھے قرض دے دیں۔ انھوں نے دے دیے۔ وہ شملہ جا رہے تھے میں نے علی گڑھ خط لکھ دیا کہ اتنے روپے شملہ کے پتے پر بھیج دیے جائیں۔ چند منٹ کے اندر ساری تشویش ختم ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد یہ بات ذہن میں بیٹھ گئی کہ اگر کبھی کوئی جرم

کر کے علی گڑھ سے مفرور ہونے کی صورت پیش آئی تو غالباً دوسرے یا تیسرے اسٹیشن پر پکڑ لیا جاؤں گا اس لیے کہ دور افتادہ مقامات پر بھی میری ملاقات کسی نہ کسی علی گڑھ والے سے ضرور ہو گی۔ یہ کچھ بھی پر منحصر نہیں ہے علی گڑھ کے ہر طالب علم کو اگر وہ کچھ دن رہ چکا ہے، یہ حادثہ پیش آئے گا!

مریضوں کی ہمہ وقت دیکھ بھال نرسوں سسٹر اور میٹرن کے سپرد ہوتی ہے جو اپنے فرائض بڑی خوبی، مستعدی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔ مریض کی بہتری کے لیے ان کو سخت سے سخت اور ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی کبھی عار نہیں ہوتا۔ اس کی صحت اور عافیت کے مقابلے میں اپنی صحت و عافیت کا خیال نہیں کرتیں۔ ان میں یورپین، اینگلو انڈین عیسائی، ہندوستانی سبھی ہیں۔ اول الذکر دو اپنے فرائض نسبتاً زیادہ مستعدی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں۔ ان کی ڈیوٹی ۸ بجے دن سے ۸ بجے رات تک ہوتی اس دوران میں کھانے پینے کے سلسلے میں شاید تھوڑی دیر تک ساکن رہتی ہوں ورنہ مسلسل مصروف رہتی ہیں۔ اندازہ یہ ہے کہ اور کاموں کے علاوہ کچھ اور نہیں تو اس بارہ گھنٹے میں یہ پانچ چھ میل کی پیادہ پا مسافت طے کر لیتی ہوں گی۔

یہاں ایک خاص نرس کا تذکرہ کروں گا۔ اس کی ڈیوٹی بالعموم رات کی ہوا کرتی تھی۔ مجھے یقین ہے دوا دینے، ٹمپریچر لینے اور عام دیکھ بھال کا جو مقررہ پروگرام تھا اس کو پورا کرنے میں شاید ہی کبھی دو چار منٹ کی دیر یا سویر سے کام لیا ہو۔ ہر کام کو بڑی خوشدلی سے انجام دیتی تھی اس کو کبھی تھکا ہارا بیزار یا سرگرجبیں نہیں پایا۔ آپریشن کے بعد کی چند راتیں بڑی سخت گزریں، گھنٹی کی ہر آواز پر پہنچ جاتی اور تکلیف دور کرنے کی طرح طرح کی تدبیر اختیار کرتی کچھ دن بعد جب تکالیف کی شدت ختم ہو چکی تھی حسب معمول ۶ بجے رات کو ٹمپریچر لینے آئی پوچھا کیسے ہو میں نے جواب دیا یوں تو اچھا ہوں لیکن پڑے پڑے اپنے آپ کو بیوقوف سا ہونس کرنے لگا ہوں۔ کہا سو جاؤ یہ احساس بھی جاتا رہے گا۔ میں نے نے کہا پھر دوسرے احمق سمجھنے لگیں گے۔ بولی یہ صورت پہلے سے بہتر ہے!

ہسپتال میں مریضوں سے ملنے کے اوقات مقرر ہوتے ہیں، مثلاً دن میں پانچ بجے سے سات بجے تک۔ اس کے علاوہ اوقات میں ملنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے لیکن ہم ہندوستانی

اس طرح کی پابندی کا بہت کم لحاظ کرتے ہیں۔ اسکول کے ایک آشنا لکھنؤ میں مل گئے شکل صورت اچھی نہ تھی لیکن ہمیشہ اس ارمان میں رہے کہ کوئی دولت مند حسینہ ان پر عاشق ہو جائے۔ طرح طرح کے لباس پہنتے تھے اور عمر کبھی نہیں بتاتے تھے۔ ممنوعہ اوقات میں ملنے آتے اور ان کی مڈبھیڑ اس نرس سے ہو جاتی جو انھیں کی طرح بقول مولانا سہیل "باصرہ خراش تھی" جسے مزاج اور تیور کی درشتی نے اور زیادہ ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا ان دوست کو نرسوں سے دلچسپی تھی۔ اکثر ان سے سلجھنے یا الجھنے کی کوشش فرماتے۔ اس وقت خاص لطف آتا جب یہ گھبرا کر یا غلط انگریزی بولنے کی رو میں، یس سر یا نو سر فرمایا کرتے تھے۔ جس نرس کا اوپر ذکر آیا اس سے خائف رہتے تھے۔ آتے ہی پوچھتے کیوں جی اس کا تو کہیں آنے کا وقت نہیں ہے۔

ان کو میرے کمرے کا غسلخانہ پسند آ گیا تھا۔ سپید صاف کشادہ ٹب کو پانی سے لبریز دیکھ کر سوچ میں پڑ جاتے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ یہ غسل کرنے کا ٹب ہے۔ ایک دن اس کا پرچۂ ترکیب استعمال دریافت فرمانے لگے۔ میں نے کہا اس میں نہانے کی مشق ہونی چاہیے۔ ورنہ داخل ہو کر نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ناواقفی میں بعض جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ پوچھا اس کے ایک سرے پر پیتل کی لمبی لمبی سلاخیں کیسی ہیں۔ جواب دیا اس میں ایک لمبی رسی باندھ لیتے ہیں جس کو نہاتے وقت پکڑے رہتے ہیں پھر اطمینان سے ڈبکیاں لگاتے اور دھوم مچاتے رہتے ہیں۔ بولے آخر مریض کیسے نہاتے ہیں میں نے کہا یہ ربر کا حلقہ رکھا ہوا ہے یہ لائف بلیٹ (LIFE BELT) ہے۔ اس سے مدد لیتے ہیں۔

دراصل ربر کا یہ حلقہ جس کے اندر ہوا بھر دی جاتی ہے ان مریضوں کے بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے ہوتا ہے جو عرصہ سے صاحب فراش ہوں یا جن کے بارے میں ایسا اندیشہ ہوتا ہے تاکہ ان کی پیٹھ یا کمر مجروح نہ ہونے پائے۔ فرمایا ایک دن اس غسلخانہ میں نہانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ضرور ادراابھی کیوں نہیں۔ کہنے لگے برہنہ نہانا تو شرعاً منع ہے میں نے کہا قمیص سے تہبند کا کام لو۔ نہانے کے بعد دھلی ہوئی قمیص میرے بکس سے نکال کر پہن لینا چنانچہ قمیص اور ربر کا حلقہ لے کر غسلخانہ میں داخل ہو گئے۔

اندر پہنچ کر آواز دی وہ رسی کہاں ہے میں نے جواب دیا رسی تو شاید نہ مل سکے۔ میں تو

کمر بند سے کام لے لیا کرتا ہوں۔ ترکیب سن کر مطمئن ہو گئے۔ میں نے کہا غسلخانہ کا کواڑ اندر سے بند نہ کرنا شاید کوئی ضرورت پیش آجائے۔ اب انھوں نے نہانا اور گنگنانا شروع کیا۔ یہ معلوم ہوا جیسے ٹب میں دو مگرمچھ ایک دوسرے سے اختلاف یا اختلاط کر رہے ہوں۔ تھوڑی دیر میں اسی نرس کے پاؤں کی چاپ سنی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ میں سوتا بن گیا۔ معزز خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا اور باہر سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ بند نہیں ہے۔ موصوفہ بے تکلف غسلخانہ میں داخل ہو گئیں۔ ساتھ ہی دو چیخیں سنائی دیں۔

اس دورِ ابتلا میں مجھ پر جو گذر گئی اور احباب، اعزّا اور بزرگوں نے اضطراب اور دوا دوش کے جیسے دن رات گزارے اس کا حال کیا بتاؤں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ محبت کی یہ متاعِ گراں مایہ کبھی کبھی کسی بے بضاعت کو کتنی کم قیمت پر مل جاتی ہے۔

ماتا بدل

بستی کی بوڑھیاں اس پر متفق ہیں کہ ماتا بدل کا صحیفۂ حیات بالکل کورا ہے۔ دکلا، مقدمہ باز حتیٰ کہ افیونیوں کا بھی جن کی عمر کا تعین مشکل ہے ان کے بارے میں یہی خیال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ موجودہ نسل میں ایسا کوئی نہیں ملتا جو ماتا بدل کی زندگی کے ابتدائی ۳۰۔۴۰ سال میں ان کا ساتھی رہا ہو۔ یہ مزدوری کرتے ہیں اور حقّہ پیتے ہیں۔ حیات کا ثبوت ان کی محنت مزدوری اور حسن حیات کا حقّہ نوشی ہے۔ یہ اکثر و بیشتر انھیں دو مشاغل میں مصروف پائے جاتے ہیں جب یہ متحرک ہوتے ہیں ان کے سر پر ٹوکری ہوتی ہے۔ حالت سکون میں حقّہ سے ہم آویز ہوتے ہیں۔ مزدوری میں ان کا محبوب مشغلہ سفالہ پوش مکانوں کی مرمّت ہے لیکن کام کی نوعیت کچھ ہی ہو، کوئی موقع و محل ہو، ان کی یکسوئی میں فرق نہیں آتا۔ شکل و صورت دیکھ کر ذہن لارڈ ولزلی کی اس تصویر کی جانب منتقل ہوتا ہے جو ابتدائی درجوں کی بعض تاریخ ہندوستان میں نظر آتی ہے۔ وہی آنکھیں وہی پلکیں وہی چہرے کی جھرّیاں وہی تیور وہی سب کچھ۔

قصبے میں کوئی مکان ایسا نہیں جس کے بنانے بگاڑنے یا مرمّت کرنے میں ماتا بدل کی

خدمات سے کسی نہ کسی وقت فائدہ نہ اٹھایا گیا ہو اور شاید ہی کوئی خاندان ایسا ہو جس کے زندہ یا مردہ افراد سے ماتا بدل واقف نہ ہوں ہر مکان کے تفصیلی جغرافیے۔ یہ آشنا ہیں ماتا بدل کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی خدمات کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوگی مثلاً ٹوکری، بیلچہ، رسی، سیڑھی، گھڑا، پھاوڑا اور وہ مکان کے کس حصے میں رکھے ملیں گی یا موجود نہیں تو کہاں سے عارضیاً حاصل کی جاسکتی ہیں یوں تو ماتا بدل کی زندگی ایک کلاک سے بھی زیادہ یکساں اور بےجوڑ ہے لیکن ان کے نزدیک زندگی کا ایک مقصد "احتیاط" بھی ہے۔ یہی ایک چیز ہے جس کی طرف سے ان کو کبھی اطمینان نہیں حاصل ہوا۔ بولتے بہت کم ہیں الّا ایسی حالت میں جب ان کے نزدیک خاموشی منافیِ احتیاط ہو۔ دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے تو ان کا فرض اکثر اپنے ساتھیوں کو حقّہ یا پانی پلانا ہوتا ہے ایسے اوقات میں کسی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وقتِ معینہ سے پہلے یہ کبھی ان چیزوں کی طرف مائل نہیں ہوتے اور نہ کسی کی فرمائش پر مخاطب ہوتے ہیں۔ مٹی کھلانے کے یہ ماہرِ خصوصی ہیں۔ جب تک اس مشغلہ سے فرصت نہیں پا لیتے کسی اور طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کے اصرار پر بھی اپنے مشغلے سے باز آجائیں اور تعمیر کے لیے مٹی حوالہ کر دیں۔ بعض امراض کے مانند ان کے یہاں بھی ہر مشغلہ کا ایک کورس (دور) ہے جس کو پورا کیے بغیر چارہ نہیں! اگر کسی ناواقف نے ایسا کیا تو اس کا جواب ماتا بدل کے یہاں صرف اپنی آنکھوں کو پوری طور پر کھول دینا اور مٹی کو اور زیادہ انہماک یا طیش کے ساتھ پامال کرنا ہوتا ہے۔ ماتا بدل کا بوجھ لے کر سیڑھی پر چڑھنا بھی خاص طور پر قابلِ لحاظ ہوتا ہے۔ ہر درجہ پر یہی معلوم ہو گا گویا ان کو کسی غنیم کے مقابلہ میں ایک نہایت مستحکم محاذ قائم کرنا منظور ہے اور کسی شاندار پیش قدمی یا اس سے زیادہ شاندار پسپائی کا ارادہ نہیں ہے۔ دوپہر میں جب کام روک دینے کا وقت آتا ہے کسی ساتھی کی یہ ہمت نہیں ہوتی کہ وہ خود کام بند کر دے۔ سب کی نظریں ماتا بدل کی سمت اٹھتی ہیں جو کمر پر ہاتھ باندھے سر جھکائے مٹی کھلاتے ہوتے ہیں اور مزدور سمجھ لیتے ہیں کہ ابھی ماتا بدل اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوئے کہ اگر سورج مہاراج کو خدانخواستہ گر پڑنا نصیب ہو تو یہ احتیاط کے ساتھ اپنی ایک پیچ والی پگڑی کے عین وسط

پر روک لیں گے اور سورج ان کی مٹی کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا سکے گا۔ چونکہ زمین گھومتی رہتی ہے اس لیے یہ اپنے محدود حلقہ میں اس کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کسی طور پر ان کا سر آفتاب کے ساتھ خط عمودی قائم کر سکے۔ اس کوشش میں کامیاب ہو جانے کی یہ علامت ہے کہ ماتا بدل سر سے پگڑی کھول دیتے ہیں اور دیوار کے سائے میں جہاں اُپلے کا ایک ٹکڑا سلگتا ہوتا ہے پگڑی کو بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ گویا کمر کھول دینے کا اذنِ عام ہوتا ہے۔ سارے مزدوران کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ سب سے کم عمر مزدور کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حقّہ چڑھا کر پیش کرے۔ ماتا بدل دو ہی چار کش لے کر سکوت اور دلجمعی کا مجسمہ بن جاتے ہیں جس کا ایک نامکمّل سا نمونہ اکثر اس اشتہار میں دیکھا گیا ہے جس میں ایک نہایت فربہ اندام بزرگ سگار کا ایک کونہ لبوں سے دبائے نیم باز آنکھوں اور کسی قدر تبسّم زیرِ لب سے لوگوں کی توجہ اور سگار کے دھوئیں کو جذب کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں اور نیچے لکھا ہوتا ہے، "آسودگیِ کامل"

کام ختم کرنے کے بعد شام کو مزدور رخصت ہوتے ہیں۔ یہ ماتا بدل کی انتہائی مشغولیت کا وقت ہوتا ہے۔ مزدوروں سے دن کے کام کا جائزہ لیتے ہیں جن چیزوں سے کام لیا گیا ہے مثلاً کدال پھاوڑا، ٹوکری گھڑا ان سب کو اس طور اس کی جگہ سے اٹھاتے ہیں کہ کسی متلاشیِ آثارِ قدیمہ کو بھی ان کے احتیاط و اہتمام پر رشک آ سکتا ہے۔ مالک مکان نے ان کو مکان چابی کی اجازت دے دی ہے لیکن ہر چیز کو اکٹھا کر لینے اور دروازے کو مقفّل کر دینے کے بعد بھی یہ مطمئن نہیں ہوتے۔ جاتے وقت کوئی موجود نہ بھی ہو تو یہ خود بخود کہتے جائیں گے کہ تمام چیزیں ٹھکانے سے رکھ دی گئی ہیں۔ ٹوکری کونے میں ہے، کدال اس کے نیچے اور رسّی کھونٹی پر ہے، وغیرہ۔ ابھی چند قدم بھی آگے نہ بڑھے ہوں گے کہ لوٹ آئیں گے۔

"کیوں ماتا بدل کیسے پلٹ آئے۔"

ماتا بدل۔ "معلوم ناہین گھڑوا کہن اہے" (معلوم نہیں گھڑا کہاں ہے) اندر جا کر سب دیکھ بھال آئے اور خیریت بول کر آگے بڑھے تھوڑی دور جا کر دوبارہ پلٹے۔

"کیوں اب کیا رہا۔"

ماتا بدل — سرکار دوپہر واکے جون روپیوا دیے دہن اور ان کے پیسوا سیج ہے رہن کہ

ناہین" (دوپہر کو جو روپیہ سرکار نے دیا تھا اس کے پیسوں کو سنبھال لیا تھا کہ نہیں)

"ہاں ہاں گن لیا تھا اب تم بے فکر ہو کر مکان جاؤ"

ماتا بدل کچھ دور جا کر پھر پلٹے اور سیدھے مکان کی طرف بڑھے

"کیوں - ؟"

ماتا بدل: کچھوتا ہیں، تنی دیکھے کے رہا کہ تلوا لاگل ہے کہ ناہین" (کچھ نہیں ذرا دیکھا تھا کہ تالا لگا ہوا ہے کہ نہیں)

ایک بار ماتا بدل کو ایک ایسے مکان میں کام کرنا پڑا جس کی ہمسایہ "برق تھی مرمر تھی یا زلزلہ" کا مصداق تھی جس گلی سے گزر ہوتا لوگ سہم جاتے۔ اس کی گالی گلوج اور بدمزاجی سے ساری بستی پناہ مانگتی تھی جس دکان پر سودا خریدنے پہنچ جاتی تمام بھیڑ چھنٹ جاتی اور دکاندار سارا کام چھوڑ کر چہتیا کی طرف متوجہ ہو جاتا بستی کے شریر اور جھگڑالو لڑکے اور کتے اس کو دیکھ کر راستے سے کترا جاتے تھے بارش کیچڑ، سردی کہر، دھوپ، لو تک اس کے غیظ و غضب اور سب و شتم سے محفوظ نہ تھی۔ روایت تو یہاں تک ہے کہ چہتیا کی شادی ایک ایسے مرد معقول سے ہوئی تھی جو آج کل ہوتے تو ان پر یورپ کے مکمل ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان کا دھوکہ ہوتا۔ بیوی اور شوہر کے روابط اور ازدواجی زندگی کے اظہار و اعلان کا وسیلہ اکثر و بیشتر چہتیا کی جوتی ہوتی جسے وہ وقت بے وقت سلسلہ تفریح یا ورزش بے تکلف بر سر کار لاتی اور شوہر نامدار مصلحت وقت یا مشیت الٰہی سمجھ کر انگیز کیا کرتے تھے۔ مکان کے اندر انار کا درخت تھا جیسے کسی جن نے اپنا نشیمن بنا لیا تھا شوہر اس حقیقت سے باخبر تھے اور امید لگائے بیٹھے تھے کہ کبھی وہ جن چہتیا کی خبر لے گا لیکن جن کتنا ہی جن کیوں نہ ہو میاں بیوی کے جھگڑوں میں پڑنے سے گریز کرتا ہے بالخصوص جہاں بیوی چہتیا ہو۔

ایک دن بیوی سے سفر کی اجازت طلب کی اور کہا کہ پردیس جا کر کچھ کھانے کمانے کی فکر کرنا چاہیے۔ ممکن ہے زراعت کے جتنے دن اب تک بسر ہوئے وہ آئندہ میسر نہ آئیں۔ چہتیا نے سوال کیا کہ پھر وہ جوتیاں کس پر آزمایا کرے گی۔ شوہر نے جواب دیا میں جلد ہی واپس

آؤں گا۔ میری عدم موجودگی میں اس انار کے درخت پر اپنے شوق پورے کرنا۔ غرض تھوڑی ردو قدح کے بعد جس میں کچھ الوداعی جوتی بیزار کو بھی دخل تھا، شوہر صاحب پردیس کو سدھارے۔ کچھ دنوں بعد کسی شہر میں ایک مہاجن کے یہاں نوکر ہو گئے اور اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ اتفاق سے مہاجن کی لڑکی پر آسیب کا دخل ہوا۔ ہر طرح کی دوا دارو، جھاڑ پھونک سے مایوس ہوکر مہاجن نے اعلان کیا کہ جو شخص لڑکی کو اس آفت سے نجات دلائے گا صلے میں اسی سے لڑکی کی شادی کر دی جائے گی۔ یہ بے چارے بھی حق نمک خواری ادا کرنے کے لیے آمادہ ہوئے لیکن آدمی تھے تجربہ کار اور دور اندیش صلے کی شرط مسترد کرالی۔ لڑکی کے پاس پہنچے تو وطن کے دوست کو پہچان لیا۔

جنات سے بہت کچھ منت سماجت کی کہ لڑکی کی جان چھوڑ دیں لیکن کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بالآخر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور جنات کے شدید اصرار کے باوجود گریہ وزاری کا سبب نہ بتایا۔ بالآخر جنات نے کہا۔

"اگر تم کو رونا ہی ہے تو کہیں دوسری جگہ جاکر رو، یہاں آخر اس کا کیا موقع ہے؟"

شوہر۔ "کیا کروں مجھے تو آپ کی خوش نصیبی پر رشک آتا ہے۔ ایک میں ہوں کہ جس مصیبت کے باعث آوارہ وطن ہوا ہر قسم کی صعوبتیں اٹھائیں وہ اب معلوم ہوا کہ میرے خمیر میں ہے۔"

جنات۔ "آخر وہ کیا مصیبت پیش آئی کہ زندگی سے بیزار نظر آتے ہو۔"

شوہر۔ "آپ سے کیا پردہ مجھے بھی اپنا سا بنا لیجیے۔ دنیا میں جنات بن کر رہنا بھی کیسی خوش بختی ہے۔"

جنات۔ "سنوں بھی تو معاملہ کیا ہے۔"

شوہر۔ (ہکلاتے ہوئے) "...... وہی"

جنات۔ "کون وہی؟"

شوہر۔ "چہ...... چہ......"

جنات۔ (چونکنا ہوکر) ...... کیا؟

شوہر— چھ... چھت... چھتیا!

جنات— کون ؟

شوہر— ہاں وہی۔

جنات— (بدحواس ہوکر) پھر کیا ہوا؟

شوہر— میری تمھاری خبر سُن کر آنے والی ہے!

جنات غائب ہو گیا۔ لڑکی اچھی ہو گئی۔ شوہر صاحب انعام و اکرام لے کر مکان واپس آئے تو معلوم ہوا کہ چھتیا نے انار پر اپنی روزانہ مشق جاری رکھی تھی۔ چنانچہ جنات کو چھتیا کے شوہر کے نقشِ قدم کو اپنا خضرِ راہ بنانا پڑا۔

ماتا بدل کوٹھے کی کھپریل درست کر رہے تھے معلوم نہیں زمانہ یا زندگی کے کس نشیب و فراز پر غور کر رہے تھے اور حقّہ نوشی کے کن مدارج سے گزر رہے تھے کہ یکایک چھت سے پھسلے اور کوٹھے کی دوسری سمت چھتیا کے صحن میں حقّہ سمیت جا گرے۔ دھماکے کی آواز سن کر چھتیا للکارتی ہوئی نکلی۔ ادھر ماتا بدل کا قریب قریب وصال ہی ہو چکا تھا۔ چھتیا اس پر جھگڑ رہی تھی کہ یہ اس کے صحن میں کیسے صادر ہوئے اور ماتا بدل بے ہوش نہیں بلکہ دم سادھے ہوئے تھے ماتا بدل کو محلّے والوں نے پہچانا اور لاد پھاند کر ان کے گھر پہنچایا۔

مدتوں بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوئے نقل و حرکت میں اب اور زیادہ احتیاط برتنے لگے تھے قدم پھونک پھونک کر دھرتے اور کھپریل وغیرہ کی مرمّت اب بالکل بند کر دی تھی۔ صرف وہی کام کرتے جس سے پاؤں کا تعلق زمین سے منقطع نہ ہونے پائے۔ جس چیز کو اٹھاتے اس کی پورے طور پر دیکھ بھال کر لیتے اور جہاں رکھتے اس مقام کی بھی جانچ پڑتال کر لیتے حقّہ نوشی بھی بڑھ گئی تھی۔

برساتی مرمّت کے سلسلے میں جامع المتفرقین نے چھتیا اور ماتا بدل کو پھر یکجا کر دیا۔ کچھ کھپریلوں کی ضرورت تھی جس کو لانے کے لیے یہ تعینات کیے گئے۔ کمہار کی دکان سے کھپریلیں اور ٹوکری سر پر رکھ کر مکان واپس آئے۔ مسافت طویل تھی اس لیے صحن میں داخل ہوتے ہی ٹوکری زمین پر رکھ دی اور ایک طرف بیٹھ کر حقّہ پینے لگے۔ ممکن ہے حقّہ کی موسیقی

اس کی ذمہ داری رہی ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک کالے سانپ نے جس کا تمام جسم کھپروں میں چھپا ہوا تھا ایک بالشت اوپر سر نکالا اور ماتا بدل کی بین نوازی کی داد میں وجد کرنے لگا۔ ماتا بدل کی نیم باز آنکھوں کے سامنے سارا مکان ٹوکری اور چھتیا خود پہلے سے رقص اور وجد میں تھیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ ٹوکری میں عورتوں یا ان کے بچوں کے "ماموں" ناچ رہے تھے یا خود ان کے ناریل کا دھواں پیچ کھا رہا تھا۔ چھتیا نے بے تکان چیخ مارنا شروع کیا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ محلے والے دوڑ پڑے۔ لیکن ماتا بدل کے سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ چھتیا نے لپک کے ان کے حقے کو ایسا دو ہتڑ رسید کیا کہ چلم اور ناریل دونوں ٹوکری کے پاس جا گرے۔ بھانجی کی یہ حرکت "ماموں" کو پسند نہ آئی۔ انھوں نے اس کی طرف رخ کیا تو مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ چھتیا نے چیخ مار کر جست کی تو ماتا بدل کے اوپر گری اب ان کو صورتِ حال کا احساس ہوا۔ سانپ اب بالکل ان کے پاؤں کے پاس آچکا تھا۔ کچھ خفت اور غصہ اور بہت کچھ چھتیا کا غیر متوقع بوجھ، ان سب سے متاثر یا بیزار ہو کر اپنی سخت، کھردری اور دندانے دار انڈی کا ایک ایسا بھرپور دھچکا دیا کہ "ماموں" کا سر پندرے کی بوٹی بن گیا اور جھٹکے میں "بھانجی" "مرحوم" ماموں کے اوپر آرہی۔ یہ مزید خلفشار کا باعث ہوا کسی کو کیا معلوم کہ تشنگی کی مکتی ہو چکی تھی لوگ یہی سمجھے کہ چھتیا کی جان خطرے میں ہے۔ کسی نے پاؤں پکڑا کسی نے ہاتھ بعضوں نے سر ہر ایک نے بیک وقت اپنی اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چھتیا معلق ہو گئی جسے علیحدہ ڈال دیا گیا۔ کچھ دیر بعد سکون ہوا تو مجمعِ عام کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔

چھتیا: "یہ حرام خور اس سے پہلے بھی ایک بار اس گھر میں کود چکا ہے۔ آج اپنے باپ کو اٹھا لایا۔ ماموں نے اس کی بجو والی آنکھوں کو نہیں ڈس لیا۔"

ماتا بدل — ارے اوگھر ماں کو دب رہا کہ دیو کا کوپ، ای سسر کا ناتی البتہ کھپروایں کہاں گھسل رہا ڈارے وہ گھر میں کودنا تھا کہ خدا کا قہر تھا۔ یہ سسر کا ناتی البتہ معلوم نہیں کہاں کھپر دل میں گھسا ہوا تھا) مجمع میں ایک سال خوردہ کانسٹبل بھی تھے ماتا بدل سے کچھ "دستِ غیب" کے طالب ہوئے مایوسی ہوئی تو سب کو تھانے پکڑ لائے۔

ریاست کی فضا، وہیں کے قوانین، ویسے ہی حاکم اور اسی قسم کے ماتحت۔ داروغہ جی لالہ گنپت رائے، نائب صاحب لالہ جگل کشور اور دیوانجی لالہ چھیل بہاری، غرض سارا تھانہ لالہ زار تھا لالہ گنپت رائے   بہرے تھے اور بات چیت کرتے وقت ہمیشہ آلۂ سماعت کانوں سے لگا لیتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا داروغہ جی میلی دھوتی کا نصف حصّہ باندھے اور نصف اوڑھے نیب کے سایہ میں بانس کی ایک کھری چارپائی پر سو رہے تھے۔ چارپائی کے ایک پائے سے آلۂ سماعت اور دوسرے نارئیل (حقہ) آویزاں تھا۔ لالہ جگل کشور کنوئیں پر کھڑے اشنان کر رہے تھے، ایک کہارن کنوئیں سے پانی نکال کر ان کے اوپر ڈالتی جاتی تھی۔ منشی چھیل بہاری دفتر میں روزنامچہ سر کے نیچے رکھے خراٹے لے رہے تھے۔ موٹے شیشے کی عینک ناک سے پھسل کر نیم کشادہ دہن میں آگئی تھی اور ہر سانس کے ساتھ حلق تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شور غل سن کر چونکے تھانے کے احاطے میں مجمع دیکھ کر اٹھ بیٹھے۔ عینک درست کی اور کاغذات الٹنے پلٹنے لگے۔ لالہ گنپت رائے بھی اٹھائے گئے۔ تھوڑی دیر میں سب اکٹھا ہو گئے اور مدعیہ ملزم اور گواہوں کے بیانات شروع ہوئے۔ قصّہ سننے کے بعد یہ مسئلہ سامنے آیا کہ ملزم پر کون سی دفعہ لگائی جائے۔ ہر ایک نے شروع سے آخر تک تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ فوجداری کی ورق گردانی کی بالآخر سب نے تنگ آکر کتاب ٹپک دی اور کہنے لگے کہ یہ معاملہ زبانی ہی طے ہو جائے تو اچھا ہے۔ کتاب کو چھیڑنا اچھا نہیں ہے۔ ورنہ وکیل مختاروں کی مین میخ سے جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔

دیوانجی کی رائے تھی کہ دفعہ ۳۲۳ (مارپیٹ) عائد ہوتی تھی۔ لالہ جگل کشور کو اصرار تھا کہ یہ نقصِ امن اور مجمع خلافِ قانون کے تحت آتا تھا۔ بہرحال کچھ طے نہیں ہو پاتا تھا کہ لالہ گنپت رائے نے یک لخت آلۂ سماعت کو ایک بار پھر چارپائی کے پایہ سے آویزاں کیا اور فرمایا۔

"یہ سب کچھ نہیں کپتان صاحب کا کیمپ قریب ہے تنگ نیدی کا یہ موقع نہیں ہے میں اس معاملہ کی تہ تک پہنچ چکا ہوں، ذرا سا شبہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی آپ کی دعا سے دور ہوا جاتا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ ۳۰۲ (قتلِ عمد) کا ہے یا ۳۰۴ (قتلِ انسان) کا۔ اگر کپتان صاحب نئے نئے نہ آئے ہوتے تو قتلِ انسان چل سکتا تھا لیکن بھائی زمانہ نازک ہے

پنشن کے دن بھی قریب ہیں ایک کمانے اور بیس کھانے والے ہیں قتل عمد ہی چلانا مناسب ہے انسپکٹر نے ایسا صاف قتل کا مقدمہ بھیج دیا ہے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں موجود ہیں قیصر مہر کو بھی مدعی بننے کی ضرورت نہیں رہی۔ چلتے چلاتے ایسی کارروائی ہو جاتی ہے کہ سارا علاقہ تھرا جائے گا۔ مقدمہ کی صورت یہ ہے کہ اس سے قبل ملزم، مدعیہ کے گھر میں قتل کی نیت سے کودا تھا لیکن کامیاب نہ ہوا دوسری بار کھپرے لانے کے بہانے عمداً ردیا نجی غور کیجیے گا عمداً ایک سانپ پکڑ لایا اور مدعیہ کو کٹا نا چاہتا تھا۔ ملزم صورت سے بھی اچھا خاصا سپیرا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں بھئی منشی چھیل بہاری کیسی رہی۔ بھئی تم کو کتاب قسم اس واقعے کی بھنک کپتان صاحب کے کان میں بھی ڈال دینا چاہیے۔ افسر اعلیٰ ہے پھر انگریز ہے۔ انگریز کیا معلوم خوش ہو کر ہم کو آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دے! انسپکٹر صاحب بھی رخصت پر جانے والے ہیں۔"

ڈورس صاحب کپتان تھے، اور کپتان ہی نہیں بلکہ اپنے وقت کے کلکٹر کمشنر اور لاٹ صاحب بھی۔ قانون اور قاعدے سے ان کو اتنا ہی مس تھا جتنا نئی روشنی کی بیویوں کو اپنے مہذب اور مصلحت اندیش شوہروں سے۔ اکثر تمام دن دھوپ میں روئی کی نیم آستین پہن کر خندق کھودا کرتے تھے اور شام کو کشتی لڑتے تھے۔ رات کو اجلاس شروع ہوتا تھا۔ اختلاف رائے کا اظہار اس لمبے کوڑے سے کیا کرتے تھے جو ہر وقت ان کے پاس رہتا۔ صاحب کی خوشنودی مزاج یا اپنی سلامتی ذات کی خاطر میں ان کے چھوٹے بڑے لواحقین بھی بلا قید موسم روئی دار کپڑے استعمال کرتے تھے۔ ایک بار محرر پیشی کو ملزم کی حیثیت سے کسی عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ اتفاق سے اس دن ڈورس صاحب کا بھی اجلاس تھا۔ محرر کی طلبی ہوئی تو غیر حاضر پایا گیا۔ جھنجلا کر کوڑے کی طرف متوجہ ہوئے تو بوڑھے اردلی نے کہا۔

اردلی ــ ہوا کیا، محرر کو فوج داری والے پکڑ لے گئے۔ کچھ کرتے دھرتے تو نہیں سب کو ناحق بے ناحق پٹیا کرتے ہو!

ڈورس صاحب ــ (غضبناک ہو کر) کہاں گیا فوجداری والا؟

اردلی ــ وہ کیا سامنے اجلاس ہو رہا ہے۔"

ڈورس صاحب نے کوڑا سنبھالا، سامنے عدالت میں جا گھسے، دیکھا کہ ان کا محرر ملزموں

کے کٹہرے میں کھڑا ہے اور بیان ہو رہا ہے۔ وکیل مختار تو دیکھتے دیکھتے غائب ہوگئے حاکم نے بھی فوراً آرام کمرے کا رخ کیا۔ پیش کار صاحب کو کہیں جگہ نہ ملی تو میز کے نیچے دبک گئے۔ ڈورس صاحب نے اپنے محرر کی گردن دبوچی اور ایک کوڑا رسید کیا "بدمعاش یہاں کس کے حکم سے آیا" اور دھکا دیتے اور کوڑے سے ہنکاتے ہوئے اپنے اجلاس میں پکڑ لائے۔ حاکم اجلاس نے کلکٹر صاحب سے جاکر شکایت کی تو موصوف نے فرمایا۔ جانے ہی دو، پاگل سے دور ہی رہنا اچھا ہے۔"

ڈورس صاحب کبھی سوال کرتے تھے تو فوراً ہی بعد پوچھتے تھے "سمجھا" مخاطب کی خیریت اسی میں تھی کہ اگر نہ سمجھا ہو تو فوراً کہہ دے کہ نہیں سمجھا۔ اگر کسی نے شامت اعمال سے ذہن پر زور دے کر اِدھر اُدھر کا جواب دے دیا اور ڈورس صاحب کی تشفی نہ ہوئی تو فوراً کوڑے سے خبر لیتے تھے۔ اتفاق سے جس روز چھیا اور ما تا بدل کا مقدمہ پیش ہونے والا تھا ڈورس صاحب نے پیش کار سے دریافت کیا۔

ڈورس صاحب۔ "ول پیش کار ایک ہم ایک تم کیا ہوا سمجھا ؟"

پیش کار۔ (فوراً) "حضور نہیں سمجھا!"

ڈورس صاحب۔ "دیکھو ایک ہم اور ایک تم کیا ہوا ؟"

پیش کار۔ "حضور بالکل نہیں سمجھا (دفعتاً کچھ سوچ کر) اگر حکم ہو تو داروغہ جی کو بلا لاؤں وہ خوب سمجھتے ہیں اور اس وقت اتفاق سے حضور کو سلام کرنے آئے ہوئے ہیں۔

ڈورس صاحب۔ بلاؤ!

پیش کار نے اردلی کی طرف اشارہ کیا، لالہ گنپت رائے ایک لمبا چغہ پہنے پگڑی باندھے حاضر ہوئے۔

ڈورس صاحب۔ "ول تھانے دار ایک ہم ایک تم کیا ہوا ؟"

تھانے دار صاحب نے حسب دستور آلۂ سماعت نکال کر کان کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ ڈورس صاحب کا کوڑا ہوا میں بلند ہوا تھانے دار صاحب نے فوراً راہِ فرار

اختیار کی۔ ڈورس صاحب نے تعاقب کیا۔ جھاڑی کا احاطہ تھا۔ لالگنپت رائے نے کوشش کی کہ کسی طرح جھاڑی سے نکل جائیں۔ کانٹوں نے دامن اور پگڑی دونوں کو گرفتار کر لیا۔ داروغہ جی کانٹوں میں گر گئے۔ ڈورس صاحب ادھر سے نازل ہوئے۔ دوسری طرف چپتیا، عمّالِ تھانہ اور دوسرے تماشائیوں میں خلفشار مچ گیا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔

شام تک ماتا بدل بھی مکان پہنچ گئے۔

کارواں پیدا ست

کہتے ہیں ایک بار تین بزرگ ہم سفر ہوئے ایک نائی ایک گنجا اور ایک فلسفی۔ رات آئی تو یہ طے پایا کہ ہر شخص باری باری سوئے جاگے۔ ترتیب یہ قرار پائی کہ سب سے پہلے نائی پہرا دے اس کے بعد فلسفی اس کے بعد گنجا۔ چنانچہ موخرالذکر دونوں سو رہے اور نائی پہرہ دینے لگا۔ کچھ دیر تک تو جاگتا رہا آخر طبیعت اکتائی تو سوچا کہ کوئی مشغلہ ہونا چاہیے ورنہ وقت کٹنا دوبھر ہو جائے گا چنانچہ استرہ نکالا اور بیٹھے بیٹھے فلاسفر کا سر مونڈ دیا۔ وقت معینہ ختم ہونے پر اس نے فلسفی کو جگا دیا اور خود سو رہا۔ فلسفی نے جمائی لے کر اتفاقاً سر پہ ہاتھ پھیرا تو چونک پڑا اور متحیر ہو کر بولا: باری تو میری تھی کمبخت نائی نے گنجے کو کیوں جگا دیا!"

مجید ملک صاحب سے یہ طے ہوا تھا کہ ہو سکا تو کارواں کے لیے مضمون لکھ دوں گا بات آئی گئی ہو گئی۔ مجید صاحب کو یقین کہ میں مضمون لکھ دوں گا اور مجھے اس پر بھروسہ کہ لکھنا اپنے اختیار کی بات ہے۔ چنانچہ مجید صاحب نے یاد دہانی کے طرح طرح کے طریقے اختیار کیے۔ لیکن بات جہاں کی تہاں رہی۔

ایک روز دروازے پر ایک موٹر رکی۔ میں نے ہر قسم کی موٹر دیکھی ہے لیکن یہ اپنی

سج دھج اور شور وشغب میں نرالی تھی۔ رکی رہتی تو معلوم ہوتا کوئی سنیاسی حبس دم کیے ہوئے ہے۔ چلنے والی ہوتی تو معلوم ہوتا زلزلہ آرہا ہے۔ چل نکلتی تو پھر:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں!

ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ صاحب نمودار ہوئے۔ ایک نعرہ لگایا کہاں ہے رشید، نوکر، بچے، اعزا؛ سب بھاگ کر اندر آگئے، باوجود اس کے کہ میں اپنے مکان کے اس کمرے میں تھا جہاں اندر صحن کی آواز بھی بمشکل پہنچ سکتی تھی، اس خلفشار نے مجھے سراسیمہ کر دیا۔ باہر نکلا تو آواز آئی ارے مجید کا خط آیا ہے تم نے کارواں کے لیے مضمون لکھا یا نہیں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ گھر والوں میں سے کوئی بیمار تو نہیں ہے جب اس طرف سے اطمینان ہوا تو کسی قدر دلیر ہو کر بولا کیسا مضمون، فرمایا اس کا خط آیا ہے کہ مضمون لے کر بھیج دیا جائے۔ میں نے کہا جناب لکھنے یا نہ لکھنے کا وعدہ تو میں نے ان سے کیا تھا آپ مجھ پر کیسے مسلط ہو گئے۔ بولے سلام علیکم۔ گاڑی پر لرزہ طاری ہوا، محلہ والوں کے کان کھڑے ہوئے، انجن نے زقند بھری اور سوار و سواری دونوں غائب: یا مظہر العجائب!

ٹائیفائڈ نے ورود فرمایا۔ گھر میں بچی بیمار ہوئی ارادہ کیا ڈاکٹر صاحب کے ہاں چلوں ساتھ ہی ساتھ مضمون کا خیال آیا جس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ جھوٹ بولنے کی تحریک ہوئی۔ ایک مصرعہ بھی ذہن میں آگیا ایسا رواں اور شگفتہ کہ دیکھتے دیکھتے پوری غزل مرتب ہوگئی۔

ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ یہ میرس روڈ پر حال ہی میں تیار ہوئی ہے وسیع خوش قطع سامنے گھاس کا کشادہ میدان، آمد و رفت کا راستہ چوڑا صاف ستھرا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی، انفلوئنزا میں مبتلا تھے دیکھتے ہی بولے خوب آئے کوٹھی کا نام تجویز کر دو میں نے کہا آپ نے روکار پر یہ کیا لکھوا رکھا ہے، فرمایا حمید بٹ اور محمود بٹ، عرض کیا یہ کوٹھی کا نام ہے یا خاندان کا شجرۂ نسب، کہنے لگے ہرج کیا ہے، میں نے کہا ایسا نام بھی کیا جس کو نہ ثواب سے لگاؤ نہ آرٹ سے تعلق۔ ثواب کی خاطر رکھتے تو کراماً کاتبین میں کیا قباحت تھی آرٹ مدنظر تھا تو یاجوج ماجوج رکھتے۔ اکتا کر بولے ناک میں دم ہے، تم ہی بتاؤ۔ لیکن میں منزل و نزل کا قائل نہیں، میں نے کہا بٹ کدہ نام رکھیے رفتہ رفتہ بت کدہ بن جائے گا۔

عرض کیا بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہے، کہنے لگے حال سناؤ، میں نے کہنا شروع کیا اور

ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھنا میں نے ابھی بحر متعین نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے پوری نظم تیار کردی۔ اتنے میں طائیہ بی دوڑی آئیں۔ فرمایا باجی نے پوچھا ہے آپ نے کاررواں کے لیے مضمون لکھا میں نے کہا کہ باجی سے کہہ دیجئے کہ اس پھیر میں نہ پڑیں ایڈیٹر اور مضمون نگار کے معاملات اور ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم دونوں کو للکارا کمرے سے نکل جاؤ۔ طائیہ بی تو بے چاری گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں میں نے کہا جناب والا آپ کا یہ حکم بحیثیت مالک مکان کے ہے یا بحیثیت ڈاکٹر کے فرمایا تم کو معلوم ہے انفلوئنزا متعدی ہوتا ہے۔ میں نے کہا انفلوئنزا کا متعدی ہونا مسلّم لیکن آپ کا بداخلاق یا بدحواس ہونا کہاں تک روا ہے ڈاکٹروں نے مرض کو اور مولویوں نے مذہب کو ہوّا بنا رکھا ہے۔ مرض میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہونا اتنا بڑا سانحہ نہیں جتنا مریض سے بھاگنا بزدلی اور شقاوت۔ کہنے لگے لفاظی کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو یہ تو بتاؤ مضمون بھی لکھا یا نہیں اس کے لیے میں تیار ہو کر آیا تھا بولا عنقریب ختم ہونے والا ہے لیکن بچی کی بیماری کو کیا کروں فرمایا اچھی ہو جائے گی مضمون تیار کرو میں نے کہا لیکن مشکل یہ ہے کہ مضمون لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ کا نسخہ لکھ ڈالنا کہنے لگے تو پھر تم نے لکھنے کا وعدہ کیوں کیا ہوا تھا میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب بعض وعدے بس ایسے ہوتے ہیں جیسے آپ نے کہا سلام علیکم میں نے کہا وعلیکم السلام۔ ایک اضطراری فعل کا جواب دوسرے اضطراری فعل سے دے دیا گیا۔ اس کے ایفا پر آپ کا اصرار کرنا "حق آسائش میں خلل اندازی" ہے۔ فرمایا اچھا رخصت۔ سلام علیکم

تعطیلوں میں بارش اور چوروں کی یورش ہوئی اس پر لطف یہ کہ مکان کے ایک حصہ کی توسیع ہو رہی تھی بارش اور سلسلۂ تعمیر نے "کاشانہ کا کیا یہ رنگ"

کہ ہوگئے مرے دیوار و در در و دیوار

بچی ٹائیفائڈ میں مبتلا دن تو ڈاکٹروں کے ہاں حاضری دینے میں کٹتا رات بھر تیمارداری کا سلسلہ جاری رہتا ایک بار تنگ آکر کہا تیمارداری سے تو بہتر ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو جانا ہے۔ بیوی نے کہا خاموش ہو جاؤ اللہ کی مصلحت میں چون و چرا کی گنجائش نہیں میں نے کہا چون و چرا کون کرتا ہے۔ رات بھر بچی کو گود میں لے کر ٹہلانے میں ایسے فقرے نکل ہی جاتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مذہب کے معاملات میں بھی مجھ سے مشتبہ ہو جاؤ مصلحت کی قائل تو مجھ

سے زیادہ تم ہو نہیں سکتیں، دیکھتی نہیں آج کل چوروں کی وجہ سے تمام لوگ کتنے پریشان ہیں لیکن ہم تم کس قدر بے فکر ہیں بچّی کی بیماری چوروں سے نجات کا باعث بن گئی۔ ورنہ مکان ٹوٹا ہوا ہے چور گھس آتے تو ہماری تمھاری بے پردگی تو ہوتی ہی تمھاری کفایت شعاری اور میری زیر باری دونوں مالِ مسروقہ بن جاتیں۔ بیوی نے کہا اچھا چپ رہو رات کے وقت چور، ڈاکو کا ذکر نہیں کرتے لیکن آخر برسات میں مکان چھیڑنے کو کس نے کہا تھا۔ عرض کیا کہا کس نے تھا مصیبت کہیں کہہ کر آتی ہے ضرورت اور اتفاق کس کے بس کے ہیں؟ تم ہی بتاؤ ہماری تمھاری شادی کو کس نے کہا تھا کہ عین طوفان کی حالت میں ہو اور رخصتی طوفانِ نوح اور کشتی نوح میں ہو۔ جھلا کر کہا کہاں کی بات کہاں پہنچا دی تم تو مجھے ہمیشہ سے وبالِ جان سمجھتے رہے ہیں نے کہا بڑی مشکل ہے میں نے چوروں کا تذکرہ کیا تو تم نے کہا رات کے وقت اس کا ذکر نہ کرو میں نے سوچا بنیت شب بخیر شادی کا قصہ چھیڑوں اس پر تم چراغ پا ہو گئیں۔

تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

اتنے میں بچّی روئی اور میں پھر ٹہلنے لگا۔ اور موسیقی کی وہ دھن شروع کر دی جو موسیقی کی ایجاد سے بہت پہلے مدوّن ہو چکی تھی۔ اب بارش کا سلسلہ شروع ہوا ہوا چلنے لگی شب کی تاریکی و خاموشی میں ایک طرح کا نم آلود سکوں پیدا ہوا جس نے رفتہ رفتہ دماغ اعضا اور عضلات میں سرایت کرنا شروع کیا۔ اس وقت میں زندگی کا ماحصل یا زندگی کی زبونی و درماندگی کا معاوضہ اس آرام کی نیند سے تعبیر کر رہا تھا جو مجھے اپنے اس صاف ستھرے بستر پر میسر آ سکتی تھی جس پر میں نے کبھی اپنی طویل بیماری میں نہایت مایوسی اور بے قراری کی راتیں گزاری تھیں۔ زندگی کے بعض لمحات بھی کس درجہ عجیب ہوتے ہیں جب انسان بے اختیار یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ ان لمحات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنی قیمتی ترین متاع بھی قربان کی جا سکتی ہے۔

بچّی کو میں نے چارپائی پر آہستہ سے سُلا دیا۔ خیال آیا بیوی کو جگا کر خود سو رہوں۔ اتنے میں چوکیدار کی چیخ سنائی دی اس محلّے کے چوکیدار کی آواز ایسی ہے گویا چور کو دیکھ کر خوف کے مارے اس کی چیخ نکل گئی ہو۔ بیوی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بشرے سے یہ معلوم ہوتا تھا گویا چیخ کا مصنّف میں تھا۔ فرمایا دیکھیے نہیں بچّی بیمار ہے، میں نے کہا دیکھنے کی کون سی بات ہے میں تو اس کے

علاوہ یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ آرام فرما رہی ہیں، چوکیدار چیخ رہا ہے بارش ہو رہی ہے اور میں اُلّو کی طرح بیٹھا ہوں. فرمایا تو اس میں میرا کیا قصور ہے کہ آپ کس طرح بیٹھے ہوئے ہیں اچھا اب جاکر سو رہئے تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی آپ کو ڈاکٹر بٹ صاحب کے پاس جانا ہوگا اور ہاں آمنہ بی کہتی تھیں کہ آپ نے کوئی مضمون لکھنے کا وعدہ کیا تھا جسے اب تک پورا نہیں کیا میرے تحمّل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا. میں نے کہا وعدہ تو میں نے کیا تھا آپ کیوں سر پہ سوار ہو گئیں جی میں آیا لکھوں گا جی میں نہ آیا نہ لکھوں گا. نیک بخت بولیں اچھا شور نہ مچایئے اتنا بھی تو لحاظ ہونا چاہیے کہ ڈاکٹر بٹ صاحب ہم لوگوں پہ کتنا کرم کرتے ہیں. ان کی ایک ذرا سی فرمائش تو پوری نہیں ہوتی سارا گھر سر پہ اٹھا رکھا ہے. آپ کا مضمون میری سمجھ میں تو کبھی آیا نہیں میں نے کہا جس دن میرا مضمون آپ کی سمجھ میں آگیا اسی دن میں خودکشی بھی کر لوں گا. فرمایا خودکشی کے اس سے بہتر مواقع پیش آیا کیے ہیں لیکن آپ نے اپنا ارادہ ملتوی رکھا.

میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا. اس لیے نہیں کہ اس سے رفعِ شر مقصود تھا بلکہ کوئی جواب ہی نہ سوجھا. جاکر چارپائی پر لیٹ رہا. خواب میں دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی موٹر پر کاروان کا انبار ہے موٹر بے تحاشا چلی آرہی ہے کھڑ کھڑ. دھڑ دھڑ. تڑتڑ تڑ تڑ. چرچرا اور... ارارارا دھڑام میرے اوپر سے گزر گئی. آنکھ کھل گئی معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بچّی کو دیکھنے آئے ہیں اور دروازے پر کھڑے نعرے لگا رہے ہیں!

"ڈاکٹر عباد الرحمن خاں بیمار ہوئے ایک آدھ دن ملاقات نہیں ہوئی. خیال کیا الموڑہ سے بیوی بچے واپس نہیں آئے ممکن ہے ان کی فکر میں ہوں. بالآخر معلوم ہوا بیمار ہیں. کوئی کہتا ہے ملیریا ہے کوئی ٹائیفائڈ بتاتا ہے. پہنچا تو معلوم ہوا کہ واقعی بیمار ہیں اور ان کے طالب علم تیمار داری میں مصروف ہیں پوچھا کیسا مزاج ہے تو اس قدر آہستہ جواب دیا، گویا الموڑہ سے آواز آرہی ہے. بخار ہے میں نے کہا اللہ رحم کرے لیکن یہ بتاشے کی طرح بیٹھے کیوں جا رہے ہیں. بخار ہے تو ہوا کرے اور زیادہ نحیف آواز میں بولے ٹائیفائڈ ہوا تو میں نے کہا کہ میں اپنے سارے قرضے ابھی معاف کیے دیتا ہوں. اس پر ڈاکٹر خان چونکتے ہوئے آواز میں کسی قدر توانائی آئی. بولے کیسا قرض! ارے تم میرے مقروض ہو یا میں تمھارا. میں نے کہا بھائی کسی کا قرض ہو یہ موقعہ تو صرف معاف کرنے کرانے

کا ہے۔

خون کا معائنہ کیا گیا رپورٹ دیکھ کر ڈاکٹر اصغر نے کہا ٹائیفائڈ تو ہے نہیں ملیریا البتہ ہے میں نے کہا آپ مریضوں کے نہیں بلکہ طالب علموں کے ڈاکٹر ہیں۔ آپ کی رائے لینے یا دینے کے کوئی معنی نہیں، فرمایا آپ احمق ہیں ٹمپریچر چارٹ دیکھو تو معلوم ہوگا گراف کا موجودہ نشیب و فراز ٹائیفائڈ کا نہیں ہے۔ عرض کیا ٹائیفائڈ اور ملیریا دونوں ہوں تو کیا ہو۔ فرمایا ممکن ہے۔ میں نے کہا آپ کے فیصلہ کا یہی حال ہے تو تھوڑی سی ہومیوپیتھک پڑھ ڈالیے۔ کہنے لگے خوب یاد دلایا۔ ٹائیفائڈ میں ہومیوپیتھک علاج بڑا کارگر ہوتا ہے۔ اگر یہ متیقن ہوجائے تو یقیناً ہومیوپیتھک علاج کرنا چاہیے۔ عرض کیا کہ جب تک مرض یا علاج متیقن نہ ہو اور آپ کی رائے ہو تو میں زعفران سے آیۂ شفا لکھ کر پلانے کا انتظام کروں۔ ڈاکٹر صاحب بولے مذاق کی کون سی بات ہے کیا معلوم زعفران کی مقدار بجائے خود ہومیوپیتھک خوراک ہوتی ہو۔ میں نے کہا آپ تو بحیثیت ایک سائنس داں کے زعفران کے معتقد ہوں گے خود ڈاکٹر خان آیۂ شفا کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر خان نے منغض ہوکر کہا تم دونوں یہاں سے دفع ہو تو میری جان بچ جائے اور مجھ پر بڑا احسان ہو اگر آپ لوگ میرے پاس باری باری آیا کریں۔

بخار قائم رہا۔ انار اور سنترے کا عرق، آش جو، مسہل سب کچھ دیا گیا۔ ایک بھی پیش نہ گئی۔ ایک دن حسب معمول میں اور اصغر صاحب دیکھنے گئے تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے۔ حال دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوا اور غذا دونوں سے بیزار ہیں اور برابر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ہم دونوں دخل درمعقولات دینے مریض کے پاس پہنچے۔ پوچھا آخر دوا کیوں نہیں پیتے؟ فرمایا کچھ استعمال نہ کروں گا۔ معدہ میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی۔ بخار کا وہی عالم ہے۔ میں نے کہا دوا تو ہر حال میں پینی پڑے گی آپ کو جو تکلیف ہے اس کا دفعیہ صرف دوا سے ممکن ہے۔ اصغر صاحب اور مجھ کو دیکھیے تندرستی میں بھی دوا ترک نہیں کرتے اصغر صاحب نے فرمایا جھوٹے ہو تم ہی تندرستی میں دوا پیتے ہو گے۔ ڈاکٹر خاں نے کہا میں کچھ نہ کروں گا میں نے کہا آپ تو بچوں اور جاہلوں کی سی باتیں کرتے ہیں آپ کے عزیز شاگرد آپ کی جتنی اور جیسی خدمت کرتے ہیں اس کو دیکھ کر اصغر صاحب کو رشک ہے۔ کہتے

تھے اتنی اور ایسی خدمت میری ہو تو میں بیمار ہونے کو تیار ہوں۔ اصغر صاحب نے کہا جھوٹے ہو میں نے کب کہا کہ میں بیمار ہونے کو تیار ہوں۔ ڈاکٹر خان مسکرائے تو میں نے کہا دوا پی لیجیے۔ فرمایا کیوں؟ میں نے کہا آپ کے اس جواب سے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ آپ کا مسکرانا محض منافقت تھی، دوا پھر حلق میں انڈیلنی پڑے گی۔ بولے معاف کیجیے اور تشریف لے جائیے۔ عرض کیا آپ کی تندرستی میں کبھی یہ خطرہ نہیں گزرا کہ آپ اس درجہ بے مُرے اور ضدی ہیں۔ میں تو آپ کو ان لوگوں میں سمجھتا تھا جو دوستوں کی خاطر بڑی سے بڑی حماقت کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ فرمایا لا بھائی جان ہی لینے پر آمادہ ہے تو سب کچھ کروں گا۔ سوڈا اور دودھ دیا گیا اس کے بعد دوا پلائی گئی اور ہم سب مکان واپس آئے۔

المورہ سے بیوی بچے آئے تیمار دار کم ہونے لگے۔ ایک دن شام کو پہنچے تو لوگوں نے اندر جانے سے منع کیا کہ آج اضمحلال زیادہ ہے۔ میں نے کہا پھر تو ہماری موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ پردہ کرایا گیا اندر پہنچے تو موصوف واقعی نڈھال پائے گئے۔ نہایت نحیف آواز سے بولے طبیعت بہت درماندہ ہے حرکت کرنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے کہا یہ علامت "اچھی" ہے بخار اور نشہ دونوں کی یکساں خاصیت ہے۔ اترنے میں اضمحلال بڑھتا ہے کہنے لگے بکواس مت کرو میں نے کہا جناب مذاق ختم کیجیے جب بخار نہیں رہا تو مریض بھی نہیں رہا اس لیے آپ کو خوش ہونا چاہیے اس سے بیوی تیماردار سب خوش ہوں گے۔ مرشد کا قول آپ کو نہیں یاد رہا کہ خوش رہنا مفید غذا مقوی دوا ہے۔

میں نے کہا کچھ اور بھی سنا خان صاحب جرمنی جانے والے ہیں اور اصغر صاحب حج کرنے والے ہیں۔ اصغر صاحب بولے "خان صاحب حج کو جا رہے ہیں اور میرا ارادہ جرمنی کا ہے" میں نے کہا یہ تو آپ لوگ ایک بار کر چکے ہیں لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا اب آپ حج کو جائیں اور خان صاحب جرمنی ہو آئیں۔ اس طور پر مذہب اور آرٹ یا مولوی اور عورت کی بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی۔ ڈاکٹر خان بولے "خود کیوں نہیں ہو آتے" میں نے کہا "میں اور آپ دونوں گئے گزرے لوگوں میں ہیں۔ میں شیروانی پاجامہ پہ ہیٹ لگاتا ہوں آپ کوٹ پتلون میں مزارات پر جاتے ہیں۔

باہر نکلے اور زینہ سے اتر ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی بھونچال پر سوار آدھمکے دور ہی سے للکارا تم لوگ مریض کے پاس کیسے پہنچے؛ عرض کیا کیوں نہ پہنچتے۔ ڈاکٹر صاحب بگڑ کر بولے میں نے ہدایت کردی تھی کہ کوئی شخص مریض کے پاس نہ جائے میں نے کہا ہم لوگ "شخص" کب ہیں ہم تو علاج ہیں۔ فرمایا ناک میں دم ہے، اور کیوں جی مضمون لکھا۔ میں نے بھی کہا ناک میں دم ہے۔ فرمایا سلام علیکم۔ ہم لوگ تانگے پر بیٹھ کر واپس ہوئے۔

راستے میں اصغر صاحب نے فرمایا کیوں جی آٹھ دس دن سے تانگے پر یہاں آتے جاتے ہیں کرایہ کون دیا کرتا ہے۔ میں نے کہا تانگے والے سے پوچھیے۔ بگڑ کر فرمایا تانگے والے سے کیوں پوچھا جائے تم جو مفت خوری کرتے ہو عرض کیا اور کبھی آپ کو یہ بھی خیال آیا میں تعظیماً برابر آگے بیٹھتا آیا ہوں اور ارباب باصفا پر مخفی نہیں کہ جو شخص تانگے پر آگے بیٹھتا ہے اس کا کرایہ معاف ہوتا ہے۔

فرمایا، یہ سب صحیح لیکن آپ خود کیوں نہیں تانگہ کرتے ہیں عرض کیا سوال سینیر اور جونیر کا ہے پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ سفر میں ایک شخص کو سردار بنا لیا جاتا ہے، بقیہ اس کی متابعت کرتے ہیں۔ سینیر اور جونیر میں فرق یہ ہے کہ میں جونیر آپ سینیر کی معیت میں ہوں تو میرا خوش گوار فرض ہوگا کہ میں تانگہ پکڑ لاؤں، اسباب بار کراؤں کرایہ چکاؤں۔ کسی دکان پر جائیں تو آپ تانگے پر بیٹھے رہیں میں کپڑے، موزے، جوتے پھل پھلہری لا لاکر آپ کو دکھاؤں، کوئی فقیر آجائے تو مار بھگاؤں یا آپ کی نقدی میں سے خیرات دے دوں مجھے کوئی چیز پسند آجائے تو آپ خرید دیں۔ کچھ بحث و مباحثہ کی نوبت آئے تو قبل اس کے کہ آپ غلط اردو بولنے پر مجبور ہوں میں غلط انگریزی بولنے لگوں۔ برج کی صحبت ہو اور ہم آپ ایک طرف ہوں تو اگر آپ ایک نوٹرمپ کہیں تو میں دو نوٹرمپ کہوں، دشمن آپ کو ڈبل کرے تو میں ری ڈبل کروں۔ آپ غلطی کریں تو مجھے برا بھلا کہیں مجھے بحیثیت جونیر کے کوئی حق نہ ہوگا کہ سینیر کے خلاف ایک لفظ منہ سے نکالوں۔!

فرمایا شکریہ، لیکن آپ خود کیوں نہ سینیر بنیں۔ میں نے کہا سینیر بننا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے صورت شکل وضع قطع رکھ رکھاؤ ضروری ہے۔ مجھے اکثر میٹنگ وغیرہ میں شریک ہونے کے لیے باہر جانا پڑتا ہے۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیتا ہوں لیکن بعض اوقات ایسی دشواریاں

بخشی ہیں اور رسوائی ہوئی کہ اکثر جی میں آیا کہ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس میں بیٹھ جاؤں اوّل تو قلی پوچھتا ہے، صاحب اسباب انٹر کلاس میں رکھوں۔ اس کے بعد ہر بڑے اسٹیشن پر ٹکٹ چیکر آکر دیکھ جاتا ہے۔ خوانچہ والے دہی بڑے پیش کرتے ہیں پانی والا تاملوٹ اور بالٹی دکھاتا ہے!

ان حالات کو دیکھتے ہوئے انصاف فرمائیے مجھ میں سینیر بننے کی کہاں تک صلاحیت ہے۔ دوسری طرف اپنے کو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ سے زیادہ یونیورسٹی میں نہ کوئی خوش لباس نہ خوش اطوار، نہ خوش اوقات، آپ کا پاندان میری بیوی کے سنگاردان سے زیادہ خوبصورت ہے، اُبلا پانی پیتے ہیں، ٹیکے لگواتے ہیں مکھی زندہ نہیں رہنے دیتے، قاعدے سے برج کھیلتے آئے ہیں خواہ قاعدے کے سبب سے ہنستے ہوئے گیم کے بجائے دو چار ہاتھ ڈاؤن ہی کیوں نہ ہو جائیں سالن میں مرچ نہیں کھاتے چائے میں دودھ نہیں ڈالتے، بدتمیزی معاف نہیں کرتے قرض کا تقاضا نہیں کرتے، ہر روز شیو کرتے ہیں اور دو بار غسل کرتے ہیں۔ نہ کبھی کلاس چھوڑتے ہیں نہ ٹرین۔ میں تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لوں تو کسی کو یقین نہ آئے آپ بے ٹکٹ بھی سفر کریں تو کوئی قریب آنے کی ہمت نہ کرے۔ آپ سے ہاتھ ملانے کے لوگ متمنّی اور منتظر میرا سلام لینے سے مستغنی اور بیزار انصاف کیجیے ایسی حالت میں کون سینیر بننے کا مستحق اور سزاوار ہے؟

فرمایا آپ ہیں احمق مسخرہ بننے کی کوشش فرماتے ہیں ذرا آئینہ میں شکل ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے کہا آپ کے یہ خیالات غلط فہمی پر مبنی ہیں میں احمق نہیں اس لیے کہ چندہ دیتا ہوں خیرات نہیں کرتا۔ پردہ کا حامی ہوں لیکن علانیہ رقص کرتا ہوں، غریب پر آنچ آئے تو گورنمنٹ کا ساتھ دیتا ہوں۔ اپنے اوپر آفت آئے تو جہاد کی تلقین کرتا ہوں۔ رہی مسخرگی اس کا الزام یوں غلط ہے کہ یہ بجائے خود مرض نہیں ہے علامت مرض ہے آپ درباداری کا مطالبہ نہ کریں میں مسخرگی سے باز آجاؤں۔ آئینے میں شکل دیکھنے کا کوئی سوال نہیں۔ جونیر کی شکل ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ مقولہ نہیں سنا دُنیا میں رہنے کے دو مقصد ہیں نشاط یا نجات!

ایک صاحب نے مجید صاحب کا تار لاکر دیا کہ ابھی ابھی گھر پر آیا تھا۔

اب پانی سر سے گزر چکا تھا ارادہ کر کے بیٹھا کہ مضمون لکھوں گا خیال آیا کہ کمرہ میلا ہے چیزیں بے ترتیب ہیں ان کو درست کرلوں تو اطمینان سے لکھوں چنانچہ کمرہ صاف کیا گیا چیزیں قرینے سے رکھی گئیں۔ قلم اٹھایا تو معلوم ہوا سیاہی نہیں۔ فوراً بک ڈپو پہنچا کر سیاہی کی شیشی خریدوں۔ معلوم ہوا کہ بک ڈپو کی چھت ٹپک رہی ہے۔ فلاں کتاب نہیں آئی پارسلوں کی بلٹیاں وی۔ پی سے آئی ہوئی ہیں۔ روپیہ کا انتظام کیجیے ایک خریدار منیجر سے الجھے ہوئے ہیں منشی اور دفتری کی جھک جھک ہو رہی ہے کتابوں اور کاپیوں کا آرڈر بھیجنا ہے اسٹیشنری کی قیمت نہیں لگائی گئی ہے تین گھنٹے اس کی نذر ہوئے۔ شام ہو گئی مکان واپس آیا تو معلوم ہوا کہ داخلے کے سلسلے میں لڑکے معہ والدین آئے ہوئے ہیں۔ تیسرے درجہ میں پاس ہوئے ہیں۔ گھر سے ایک پیسے کی امداد نہیں ہو سکتی۔ فیس معاف ہونی چاہیے۔ قرضِ حسنہ دلوایئے آفتاب ہال میں جگہ مل جائے۔ سکنڈ ہینڈ کتابوں کا بندوبست کیجیے۔ فرنیچر گھر سے دیکھیے۔ فلاں فلاں اصحاب سے ملائیے۔ وائس چانسلر صاحب کے یہاں لے چلیے۔ قوم کی غفلت اور مسلمان بچوں کی تباہی پر ان کے ساتھ ماتم کرتا رہا اور ماحضر کھاتا کھلاتا رہا۔

رات گئے زنان خانے میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب بیمار ہیں دوسرے کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں تیسرے صاحب اس قدر کھائے جا رہے ہیں کہ ان کی صحت خطرہ میں ہے، یہ قضیئے فیصل کر کے بیٹھا تھا کہ کل پڑھانے کے لیے کچھ پڑھ لوں تھوڑی دیر تک مراقبہ میں بیٹھا رہا کہ ایک طرف سے سسکنے کی آواز آئی جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی۔ پوچھا کیا ہے معلوم ہوا پانی پئیں گے جب تک پانی مہیا کیا جائے دوسرے نے ایک نالہ سر کیا ان کی خدمت میں حاضر ہوا فرمایا میں بھی پانی پیوں گا۔ ان کے حکم کی تعمیل کی۔ واپس آکر کتاب اٹھائی کل کا سبق ہے ارتقا نظم نکالی گئی۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

بات تو ٹھیک ہے لیکن آج کل کے نوجوان مسلمان اسے سمجھیں گے کس طور پر!

چراغِ مصطفوی پر ایمان نہیں شرارِ بولہبی کے قائل نہیں۔ اچھا مسئلہ خیر و شر سے بحث کی جائے گی لیکن خیر و شر کو سمجھتے تو چراغ مصطفوی اور شرارِ بولہبی کے سمجھنے میں کون چیز حائل تھی؟ اچھا یہ بھی نہ سہی، سرمایہ دار اور مزدور کی مثال سے سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ آگے چلو:

حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز

سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی

اس شعر کو سمجھانا ذرا دشوار ہے ایسی حیات جس نے مشکل کشی اور جفا طلبی سے ترکیب پائی ہو ان نوجوانوں کی سمجھ میں کیسے آئے گی، جو حیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہوں کہ ان کی کفالت کے ذمہ داران کے والدین یا مسلم یونیورسٹی ہو اور ہندوستان کی آزادی کے ذمہ دار ہندو۔ تکلیف ہو تو چیخنے لگیں، راحت ملے تو کسی اور کی چیخ سنائی نہ دے۔ اچھا ان کو مثال دے کر سمجھایا جائے گا۔ مسلمانوں کی تاریخ تو ان کے نزدیک افسانۂ کہن ہے۔ ممکن ہے موجودہ ترکوں کی مثال سمجھ میں آجائے لیکن اگر کوئی یہ بول اٹھا کہ موجودہ ترک مسلمان کب ہیں تو کیا جواب دوں گا؟ کچھ حرج نہیں حکومتِ ترکیہ اسلامیہ کے مظاہر شخصی بھی دو ہیں، مصطفےٰ کمال اور رؤف بے۔ لیکن اسلامی حکومت ممکن ہے ہندی مسلمانوں کی سمجھ میں نہ آئے کیونکہ اس چیز کو مہاسبھا اور برطانوی کابینہ وزارت دونوں برا سمجھتے ہیں اس لیے اخلاق اور عقل دونوں اعتبار سے یہ قابلِ احتراز ہے۔ بہرحال اس پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔

لیکن اس بحث کو کیوں اٹھایا جائے؟ مشکل کشی اور جفا طلبی کا مسئلہ نوجوانوں کی سمجھ میں اس وقت تک نہ آئے گا جب تک آپ اسلامی ادب یا تاریخ کی مثالیں پیش کرتے رہیں گے۔ کسی غیر اسلامی چیز کو پیش کریں، مان لیں گے۔ لیکن اس وقت اس کا موقع نہیں کہ قوم کا ماتم کیا جائے کسی نہ کسی طرح سبق پر نظر ڈال لینی ہے۔

سکوتِ شام سے تا نغمۂ سحر گاہی

ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

شاید اس شعر کے سمجھنے میں زیادہ وقت نہ ہو، یہ بحث مشکل کشی اور جفا طلبی کے سلسلے میں آچکی ہوگی، کچھ کسر باقی رہ گئی تو پھر ان کو وہ زمانہ یاد دلایا جائے گا جب امتحان قریب

ہوتا ہے اور کورس کورا! شام کو بیٹھ کر پڑھنا شروع کرتے ہیں نیند آتی ہے تو اٹھ کر ٹہلنے لگتے ہیں پھر پڑھتے ہیں نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو چائے کی تیاری میں ہر قسم کی زحمت اٹھاتے ہیں پھر پڑھائی شروع ہوتی ہے۔ نیند کا غلبہ ہوتا ہے۔ کورس قبضے میں آجاتا ہے پاس کے درختوں پر پرندوں کا پہلا نغمہ شروع ہوتا ہے۔ افقِ مشرق سے آفتاب ابھرتا ہے یا نمایاں بام گردوں سے جبینِ جبرئیل!

کشاکشِ نزم و گرماتب و تراش و خراش
زخاکِ تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی!
مقامِ بست و شکست و فشار سوز کشید!
میانِ قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی!

یہ اشعار ٹھیک ہیں اس عہد کے نوجوان ساغر اور شراب کا مفہوم ہم سے زیادہ سمجھتے ہیں دقت اس وقت پڑتی ہے جب ساغر اور شراب کو تصوّف یا تصوّف کو ان کے قالب میں ڈھالنا پڑتا ہے اس کے علاوہ ایک سہولت یہ بھی ہے کہ آج کل فنِ معلمی کا ایک گر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ مفہوم کے سمجھنے یا سمجھانے میں دشواری پیش آئے تو موضوعِ بحث کو دلچسپ انداز میں خارج از بحث بنا دیا جائے۔ یوں بھی ساغر و شراب کی حکایت لذیذ ہوتی ہے!

اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام
یہی ہے رازِ تب و تابِ ملّتِ عربی
مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

رہا "اسی کشاکشِ پیہم" پر بحث ہو چکی ہے۔ ملّتِ عربی کو پیش کرنے کا موقع دیکھا جائے گا۔ آخری شعر فارسی کا ہے موجودہ دور میں اردو ہی کون سمجھتا ہے کہ یہ فارسی کا شعر بیچ میں آگیا "ستارہ می شکنند آفتاب می سازند" کی بلندی اور بلاغت سے ان لوگوں کو کیسے آشنا کیا جائے گا جن میں سے ایک صاحب مغاں کو مغاں پڑھتے تھے اور

سر دھنتے تھے؛ اللہ مالک ہے۔ سمجھا نہ سکا تو اردو کے ایک شعر میں پناہ لوں گا:

انگور میں تھی یہ پانی کی چار بوندیں
جس دن سے کھنچ گئی ہے تلوار ہوگئی ہے

دوسری کلاس میں غالب سے سابقہ ہوگا۔ رات زیادہ آگئی ہے مگر کوئی مفر نہیں خدا کرے سبق آسان ہو۔ دیوان کھولا یہ نکلا۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی!

لیکن اب الفاظ اور سطروں کی بجائے نیند چلی آتی ہے۔ پہلا مصرعہ امرِ مسلم لیکن دوسرا خلافِ واقعہ ہے۔ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

صبح مضمون لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا سیاہی کی شیشی خریدنا بھول گیا۔ پنسل ڈھونڈ کر نکالی مضمون کا عنوان کیا ہو؟ کچھ دیر سوچتا رہا پھر طے کیا عنوان نہ سہی مضمون کی فکر کرو لیکن مضمون کا بھی پتہ نہیں اچھا عنوان پر پھر زور لگاؤ، مثلاً ہندو مسلم اتحاد، برطانیہ کا اخلاص اور ہندوستان کا افلاس، انجمن اقوام عالم اور ہم، اچھوت اور ہم، ہٹلر اور ہم، بم اور ہم، کاروان اور ہم یعنی ہم ہی ہم!

ہندو مسلم اتحاد پر لکھنا آسان ہے مثلاً محرم، گاؤ کشی، تناسب آبادی اور بربادی، ریاست متحدہ اسلامیہ، پورن راج، مخلوط انتخاب مخلوط ازدواج، اردو کے مطلے، ناگری پرچارنی سبھا، لاٹھی چارج، تیشفیع داؤدی اور پنڈت مالوی لیکن ان کی طرف متوجہ کون ہوگا؟ "برطانوی اخلاص اور ہندوستانی افلاس" بھی اچھا مضمون ہے مگر اس قسم کی چیزوں سے میرٹھ کا مقدمہ سازش بھی مرتب ہوجایا کرتا ہے اس لیے اس سے اجتناب لازم ہے، فائدہ کیا خود جیل خانہ گئے۔ گورنمنٹ کو زیر بار ہونا پڑا۔

انجمن اقوام عالم اور ہم، خاصا عنوان ہے لیکن اقبال نے ایک شعر میں جو کچھ لکھ دیا ہے

وہ ہم سے ایک جلد میں بھی نہ لکھا جائے گا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

" اچھوت اور ہم " البتہ کسی قدر حسبِ حال ہے۔ ہٹلر اور ہم " بھی خوب ہے لیکن ہٹلر کو ہم اپنی یونیورسٹی کے نقطۂ نظر سے کچھ بہت اچھا نہیں سمجھتے اور بزرگوں نے کہا ہے کہ ایسوں کا نام نہ لینا چاہیے ورنہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادھر نام لیا ادھر وہ آ دھمکے اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کو نظر انداز کیا جائے۔

" بم اور ہم " قافیہ کے اعتبار سے مناسب لیکن عنقریب ہز اکسلینسی گورنر کا ورود ہوگا ایسی حالت میں اس کا ذکر مناسب نہیں کیوں نہ اس عنوان کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے پاس بھیج دیا جائے۔ کسی ایسے ہی موقع پر موصوف نے " پیاری ڈکار" تصنیف فرمائی تھی، ممکن ہے اس دفعہ بھی کچھ ہو جائے !

گھاگ

گھاگ (یا گھاگھ) کی ہیئتِ صوتی و تحریری اس کو کسی تعریف کا محتاج نہیں رکھتیں۔ الفاظ کی شکل اور آواز سے کتنے اور کیسے کیسے معنی اخذ کیے گئے ہیں۔ لسانیات کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔ کبھی کبھی تلفظ سے بولنے والے کی نسل اور قبیلہ کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ گھاگ کی تعریف منطق یا فلسفہ سے نہیں تجربے سے کی جاتی ہے، ایسا تجربہ جسے عقلمند سمجھ لیتا ہے، بے وقوف برتنا چاہتا ہے۔

گھاگیات کا ایک اصول یہ ہے کہ قضیے میں فریق سے بہتر قاضی بننا ہے۔ جھگڑے میں فریق ہونا خامی کی دلیل ہے۔ حکم بننا عقلمندوں کا شعار ہے۔ اگر ہر ایجاد کے لیے ایک ماں کی ضرورت ہے تو ہر ضرورت کے لیے ایک گھاگ لازم آتا ہے۔ گھاگ موجود نہ ہوتا تو دنیا سے ضرورت کا عنصر مفقود ہو جاتا اور "طلب تجھ سے سارا عالم" کا فلسفہ انسدادِ توہینِ مذاہب کے قانون کی مانند ناقص ہو کر رہ جاتا ــــ گھاگ کا کمال یہ ہے کہ وہ گھاگ نہ سمجھا جائے۔ اگر کوئی شخص گھاگ ہونے کا اظہار کرے یا بقول شخصے "مارکھا جائے"، تو وہ گھاگ نہیں گھاگس ہے اور یہ گھاگ کی ادنیٰ قسم ہے۔ ان میں امتیاز کرنا دشوار بھی ہے آسان بھی۔ جیسے کسی روشن خیال

بیوی کے جذبۂ شوہر پرستی یا کسی مولوی کے جذبۂ خدا ترسی کا صحیح اندازہ لگانا۔

گھاگ ایک منفرد شخصیت ہوتی ہے۔ وہ نہ کوئی ذات ہے نہ قبیلہ، وہ صرف پیدا ہوجاتا ہے لیکن اس کی نسل نہیں چلتی۔ روایت قائم رہتی ہے۔ ہر طبقہ اور جماعت میں کوئی نہ کوئی گھاگ موجود ہوتا ہے۔ معاشرہ، مذہب، حکومت غرض وہ تمام ادارے جن سے انسان اپنے آپ کو بناتا بگاڑتا یا ڈرتا ڈراتا رہتا ہے، کسی نہ کسی گھاگ کی دستبرد میں ہوتے ہیں وہ جذبات سے خالی ہوتا ہے اور اپنے مقصد کے حصول میں نہ جاہل کو جاہل سمجھتا ہے نہ عالم کو عالم۔ دانشمند کے سامنے وہ اپنے کو احمق اور احمق کے سامنے احمق تر ظاہر کرے گا۔ جب تک وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوسکتا ہے، اس کو یہ پروا نہیں ہوتی کہ دنیا اس کو کیا کہے گی۔ وہ کامیابی ہی کو مقصد جانتا ہے، وسیلے کو اہمیت نہیں دیتا۔

گھاگ کا سوسائٹی کے جس طبقے سے تعلق ہوتا ہے اسی اعتبار سے اس کی گھاگیت کا درجہ متعین ہوتا ہے۔ نچلے طبقے کا متوسط طبقے اور متوسط طبقے کا اعلیٰ طبقے کے گھاگ پر فوقیت رکھتا ہے اس لیے کہ موخرالذکر کو اول الذکر سے کہیں زیادہ سہولتیں میسّر ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گھاگ نہ بھی ہوں جب بھی اپنی دولت اور اثر سے کام نکال سکتے ہیں۔ ان سے کم درجہ والے کو اپنی گھاگیت کے سوا کچھ اور میسّر نہیں ہوتا۔ مثلاً گھاگ ہونے کے اعتبار سے ایک پٹواری کا درجہ کسی سفیر سے کم نہیں بشرطیکہ سفیر خود کبھی پٹواری نہ رہ چکا ہو۔

سیاسی گھاگ کو قوم اور حکومت کے درمیان وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو قمار خانے کے منیجر کو قمار بازوں میں ہوتی ہے۔ یعنی ہار جیت کسی کی نفع اس کا! وہ صدارت کی کرسی پر سب سے زیادہ ہار پہن کر تالیوں اور نعروں کی گونج میں بیٹھتا ہے اور تحریر و تقریر میں پریس اور حکومت کے نمائندوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ کہیں گولی چلنے والی ہو یا دار و رسن کا سامنا ہو تو وہ اپنے ڈرائنگ روم یا کوہستانی قیام گاہ کو بہتر و محفوظ تر جگہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک قوم کی حیثیت نعش کی ہے۔ اس پر مزار تعمیر کر کے نذرانے اور چڑھاوے وصول کیے جا سکتے ہیں لیکن پیش قدمی

کی ضرورت ہو تو ان سے گڑھے پاٹ کر راستے ہموار کیے جا سکتے ہیں۔ اپنے اغراض کے پیشِ نظر وہ نوحۂ غم اور نغمۂ شادی میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ حکومت سے خفیہ طور پر اور حکومت اس سے علانیہ ڈرتی ہے۔

گھاگ صرف اپنا دوست ہوتا ہے۔ کسی اور کی دوستی پر اعتبار نہیں رکھتا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے موقع کو اپنے سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے کو خطرے میں بھی ڈال دیتا ہے لیکن اسی وقت جب اسے یقین ہوتا ہے کہ خطرے سے اُس کو نہیں بلکہ اُس سے خطرے کو نقصان پہنچے گا۔ وہ انتہا پسند نہیں ہوتا صرف انتہا پسندوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کی مثال ایک ایسی عدالتی مسل سے دی جا سکتی ہے جس کی رو سے متضاد فیصلے آسانی سے دیے جا سکتے ہیں اور وہ فیصلے آسانی سے بحال بھی رکھے جا سکتے ہیں اور توڑے بھی جا سکتے ہیں۔

سیاسی گھاگ نیکٹری کے بڑے پہیے کی مانند ہوتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوگا کہ صرف ایک بڑا پہیا گردش کر رہا ہے لیکن اس ایک پہیے کے دم سے معلوم نہیں کتنے اور کل پرزے گردش کرتے ہوتے ہیں۔ کہیں بھاری مشین تیار ہوتی ہے کہیں نازک ہلکے طرح طرح کے آلات۔ کہیں زہر، کہیں تریاق، کہیں برہنہ رکھنے کے لیے کپڑے تیار ہوتے ہوں گے کہیں بھوکا رکھنے کے لیے خرمن جمع کیا جا رہا ہوگا۔ کہیں حفاظت کا کام در پیش ہوگا کہیں ہلاکت کے سامان کیے جا رہے ہوں گے۔ گھاگ بولنے کے موقع پر سوچتا ہے اور چھینکنے کو صرف ایک جمائی پر ختم کر دیتا ہے۔ وہ ضابطۂ فوجداری اور کتابِ الٰہی دونوں کی طاقت اور کمزوری سے واقف ہوتا ہے۔ آرام کمرے میں بیٹھ کر جیل خانہ پر عذاب جھیلنے والوں سے ہمدردی کرے گا کہ کہیں وہ ملک الموت کی زد میں نہ ہوں۔

وہ حکومت کے خطابات قبول نہیں کرتا لیکن خطاب یافتوں کو اپنے اثر میں رکھتا ہے کونسل اور کمیٹی میں نہیں بولتا ہے لیکن کونسل اور کمیٹی میں بولنے والے اسی کی زبان بولتے ہیں۔ وہ کبھی بیمار نہیں پڑتا، لیکن بیماری اسی طرح مناتا ہے جس طرح دوسرے تعطیل مناتے ہیں۔ اس کا بیمار ہونا درحقیقت اپنی صحت منانا ہوتا ہے۔ وہ ہر طرح کے جرم کا مرتکب ہوتا

ہے لیکن ماخوذ کسی میں نہیں ہوتا. جرائم پیشہ ہوتا ہے سزا یافتہ نہیں ہوتا.

مذہبی گھاگ کو مذہب سے وہی نسبت ہے جو بعض نوجوانوں کو اپنے والدین سے ہوتی ہے. وہ والدین کو اپنا کمزور اور مضبوط دونوں پہلو سمجھتا ہے. ایک طرف تو وہ ان کو حکام کے آستانوں پر حاضر ہو کر مرادیں مانگنے کا وسیلہ سمجھتا ہے دوسری طرف اگر وہ خود تعلیم یافتہ، روشن خیال اور اسی طرح کی بیوی کا شوہر ہے اور والدین ذہنی حیثیت نہیں ہیں تو ان کو حکام عالی مقام کے چپراسی سے بھی چھپانے کی کوشش کرے گا. ضرورت پڑ جائے گی تو مذہب کا واسطہ دلا کر دوسروں کو ہندوستان سے ہجرت پر آمادہ کرے گا. کسی اور موقع پر مذہب ہی کی آڑ پکڑ کر دارالحرب میں سود لینے لگے گا. وہ تارکِ موالات رہے گا، تارکِ لذّت نہ ہوگا.

ایک شخص کا کردار یوں بیان کیا گیا ہے. پیشِ ملاّ قاضی پیشِ قاضی ملاّ پیشِ ہیچ ہر دو، و پیشِ ہر دو ہیچ. یعنی وہ ملاّ کے سامنے قاضی بنا رہتا ہے اور قاضی کے سامنے ملاّ. دونوں میں سے کسی کا سامنا نہ ہو تو دونوں حیثیتیں اختیار کر لیتا ہے اور دونوں موجود ہوں تو کہیں کا نہیں رہتا. یہ مقولہ گھاگ پر صادق آتا ہے. گھاگ ایسا موقع نہیں آنے دیتا کہ "وہ کہیں کا نہ رہے" گھاگ کی یہ مستند پہچان ہے.

دفعتاً حاجی بلغ العلیٰ وارد ہوئے اور آتے ہی بے ربط سوالات اور دوسرے اضطراری یا اختیاری اشغال سے ایک دھوم مچا دی. کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دور ہی سے سلام علیکم، کمبل بر دوش ریش بداماں، پوچھنے لگے، نظر کیوں نہیں آتے ہو، سگریٹ لاؤ. پانی منگاؤ. آخر دیر کیا ہے، کھانا کھا چکے ہو، کچھ معلوم ہوا، کمشنر والے آج ٹینس کھیلیں گے یا ڈاکٹر ضیاالدین صاحب کا بیان لیں گے؟ اچھا کوئی گانا سناؤ. "آمدِ شہزادہ ہے گلشن ہے سارا لکھنؤ!" ایک کرسی پر جا بیٹھے ٹھیک طور سے جگہ نہیں پکڑی تھی کہ کھڑے ہو کر دیوار پر آویزاں تصویر دیکھنے لگے لیکن جیسے تصویر دیکھنا نہیں وقت گزارنا مدِّنظر ہو. وہاں سے جست کی تو چارپائی پر دراز اور کمبل میں ملفوف. چند لمحے بعد اٹھ بیٹھے جیسے کوئی بھولی بات یاد آ گئی ہو، پھر وہیں لیٹ گئے جیسے اس چیز کو اور اس کے ساتھ ساری کائنات کو صبر کر بیٹھے ہوں. پانی آیا. فرمایا نہیں دیا سلائی

لاؤ، وہ آئی تو جلانے کے بجائے اس سے خلال کرنے لگے۔ کچھ کتابیں الٹیں، اخبار کے اوراق زیر وزبر کر ڈالے، فرمایا یہ سب تو ہوا، بتاؤ، فلاں صاحب مکان پر ملیں گے۔ اور ہاں تم کچھ لکھ رہے تھے، عرض کیا، گھاگ، فرمایا شیطنت سے باز نہ آؤ گے۔ اب دیکھتا ہوں تو حاجی صاحب صحن کے دروازے سے غائب ہوتے نظر آئے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، ہر جماعت میں گھاگ ہوتے ہیں یہاں تک کہ فرشتوں میں جب مسلسل و مدام، عبادت ہونے لگی تو مصلحت الٰہی نے آدم کو پیدا کیا، فرشتوں کا یہ کہنا کہ یہ صفحۂ ہستی پر فساد پھیلائیں گے گھاگ کی آمد کا پیش خیمہ تھا، جس طور پر کٹر ملحد اور دہریے کبھی کبھی کٹر موحّد اور متقی ہو جاتے ہیں اسی طور پر فرشتوں کے معصوم طبقے میں ابلیس (گھاگ) پیدا ہوا۔ گندم جنتی پر آدم و حوا سے باز پرس کی گئی۔ گھاگھس تھے گھگھی بندھ گئی۔ اپنی خطا کا اس طرح اعتراف کیا جیسے اس پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ گھاگ سے جواب طلب کیا گیا تو اس نے جواب دیا۔ مجھے آخر کس نے گمراہ کیا؟ یہ سوال ارتکابِ جرم سے زیادہ سنگین تھا۔ گھاگ اور گھاگھس دونوں جلاوطن کیے گئے اور اس جہان میں پھینک دیے گئے جہاں نبرد آزمائی کے ہر ایک کو مساوی مواقع ملے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے:

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

آمد میں آورد!

ہندوستان کے دو پیدائشی حقوق ہیں. ایک بلوغ دوسرا سوراج. مس میو اور تلک آنجہانی اس پر گواہ ہیں. شرعاً ممکن ہے یہ گواہی ناقص ہو لیکن مس میو کی اصلاحی سرگرمیاں اس قسم کے اصطلاحی اعتراضات سے بری ہیں. معلوم نہیں ہندوستانیوں کو اس کی توفیق کبھی ہوگی یا نہیں کہ حقوق کو متوازن کر یا رکھ سکیں. ہندوستانی کون ہے اور کون نہیں یہ بعد کو طے ہو گا میرا خیال ہے غیر ہندوستانی دو ہیں. ایک ہندو دوسرے مسلمان. ان کو مس میو کے حوالے کر دینا چاہیے. اس کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی مل جائے گی. اس آزادی کو سوراج کہہ لیجیے یا شب برات نہ سائمن کمیشن کی ضرورت باقی رہے گی نہ آتنگ نگرہ گوپیوں کی.

لیکن آمد اور آورد کو سائمن کمیشن اور آتنگ نگرہ گوپیوں سے کیا نسبت اور یہ بھی کیا ضرور کہ ہر مضمون کو اس کے عنوان سے نسبت ہو آخر تعلیم یافتہ بیوی کو ہندوستانی شوہر سے بھی کچھ اسی طرح کی نسبت ہوتی ہے. ہر شخص اس کا طلب گار ہے کہ اسے کم سے کم اولاد اور زیادہ سے زیادہ روشن خیال بیویوں سے سابقہ ہو. ایسا نہ ہو تو آرٹ کا مقصد

کیوں کر پورا ہو گا جب یہ بھی معلوم ہو کہ آرٹ کے زوال سے بیسویں صدی میں کتنوں کو جوتیاں اور کتنوں کی روٹیاں ماری جائیں گی۔ تضادِ قدرت نے روزی کے مسئلہ میں ایک ستم ظریفی ملحوظ رکھی ہے یعنی اکثر اولاد ایک گھر میں اور روزی دوسرے گھر میں بھیجی جاتی ہے کبھی کبھی روٹیاں اور جوتیاں ایک ہی خاندان میں بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی روٹی کے ساتھ دال بھی اتنا کھانے کے لیے نہیں جتنا پٹنے کے لیے!

آمد اور آورد کے سلسلہ میں سب سے پہلے آدم کو لے لیجیے جو صرف آمد کا ایک پھیر ہے۔ بالغ اور لاعقل مشرقیوں کا خیال ہے کہ آدم یا آدمی کی شانِ نزول "آورد" کے تحت آتی ہے۔ مغرب کا دعویٰ ہے کہ حیوان نے ترقی کر کے انسان کا خلعت اختیار کیا اور دعویٰ کے بجائے ثبوت یہ ہے کہ انسان بالخصوص ہندوستان کا انسان ترقی کر کے حیوان بن جاتا ہے اب یہ اس کی قسمت ہے اگر حکومت کے ہاتھ لگ جائے تو بندر رہے ہندوستانیوں کے قبضے میں آ جائے تو گائے ہے۔ وہ بھی اللہ میاں کی نہیں پنڈت مالوی کی۔

دیکھنا یہ ہے کہ حضرت انسان کی آمد کس طرح ہوتی ہے؟ اس کی ابتدا روزِ ازل سے بھی ہو سکتی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے۔

خذرا سے پردگیاں پردہ درے پیدا شد!

لیکن یہاں اس سے بحث نہیں۔ بچے کی آمد بھی دو طرح کی ہوتی ہے آمد یا آورد۔ آمد تو کسی اندھیری بدبودار کوٹھری میں ہوتی ہے جس کو اور زیادہ ناقابلِ برداشت بنا دینے کے لیے گندی دائی رونے، شور مچانے والے بچے بچیاں ان سے زیادہ چیخنے والی بی اماں اور نانی اماں ہوتی ہیں جو کبھی کبھی پاس کے بچے بچیوں پر رفعِ یدین بھی کرتی جاتی ہیں۔ میلے کوڑے گلاس لوٹے اور سلفچی کا باہم ٹکراتے رہنا۔ بچوں کا رونا عورتوں کا چیخنا کوسنا، بیوی کا کراہنا، شوہر کی بدحواسی، باہر کسی پڑوسی کا بندوق داغنا گویا کسی شکار کا جنگل میں ہنکوا ہو رہا ہے، اتنے میں مولودِ سعید برآمد ہوئے۔

دوسری طرف آورد ہے۔ مفلس شوہر اور روشن خیال بیوی کے بچوں کی بالعموم کسی ہسپتال میں کھینچ تان یا قطع برید ہوتی ہے۔ مدتوں پہلے سے ہسپتال کی زیارت ہوتی

رہی ہے۔ ولادت سے ہفتوں قبل بیگم صاحبہ ہسپتال پہنچ جاتی ہیں۔ ان بیویوں کی حالت بھی ایک گونہ قابلِ رحم ہوتی ہے حمل، وضعِ حمل اور مکافاتِ حمل سب ہسپتال ہی میں پورے ہوتے ہیں وضعِ حمل کا وقت آتا ہے تو سارے چھوٹے بڑے خوش حال تنگ دست دور اور نزدیک کے رشتے دار کسی دوسرے کمرے یا برآمدہ میں اس طور پر بیٹھے ہوتے ہیں گویا عدالتِ فوج داری میں مجرم کی حیثیت سے لائے گئے ہیں۔ پہلو بدلنے پر بھی آمادہ ہوئے تو لیڈی ڈاکٹر سے لے کر بھنگن تک اس طور پر ڈانٹتے ہیں جس طور پر عدالت کا چپراسی اس فریق کو پھٹکارتا ہے جس سے اس کو کچھ دستِ غیب نہ وصول ہو سکا ہو بچے نے برآمد ہونے میں ذرا پس و پیش کی اور لیڈی ڈاکٹر نے کلوروفارم نشتر چاقو اور دوسرے اقسام کے آلات سنبھالے اور مولود سعید "بادستِ دگرے دست بدستِ دگرے" عالمِ ظہور میں لائے گئے۔ دوسری طرف "تا برخاستِ کچہری قید" رہ کر فریقین کو حکم رہائی ملا۔ ساتھ ہی ساتھ جرمانے کا بل بھی پیش کیا گیا جس کے مطالبات نے ننھے سے پہلے ننھے کے ابا کا عقیقہ کر دیا۔ شوہر کو ہدایت کی گئی کہ آئندہ وہ اس قسم کی کوئی حرکت نہ کرے جس سے اس طرح کی نوبت آئے۔ نیک چلنی کی آزمائش کے لیے لیڈی صاحبہ متبسم ہوگئیں، ثبوت میں شوہر صاحب مفلس۔ نانی اماں کو ہدایت کی گئی کہ وہ آئندہ روئیں کم اور صفائی زیادہ رکھیں۔

فرض کیجئے کسی قومی لیڈر کی آمد ہے۔ حکومت نے پولیس کو حکم دیا کہ لیڈر کی ہسٹری شیٹ کا مطالعہ شروع کر دیں کچھ اہالیانِ شہر اور خفیہ پولیس نے استقبالیہ کمیٹی کی طرح ڈالی بھوکے شریف اور شکم سیر انفار جن سے زیادہ خطرناک طبقہ کوئی اور نہیں ہوتا رضا کار بنے۔ جن لوگوں کو حکومت سے یہ شکایت تھی کہ وہ ان کی پرسش نہیں کرتی تھی یا ضرورت سے زیادہ ان کا خیال رکھتی تھی، مقروض رؤسا، مایوس اطبا، مفلوک الحال وکیل، دیوالیے مہاجن، فیل شدہ طلبہ اور ایسے لوگ جن کو عرش پر بھی بیگار نصیب ہوا استقبالیہ کمیٹی کے ممبر بنے۔ پھاٹک کھڑے کیے گئے، ہار تیار ہوئے، گولے بنائے گئے، اڈریس لکھے جانے لگے۔ پولیس کو گالیاں دی جانے لگیں، کلکٹر صاحب نے باجلاسِ خطاب یافتگان دفعہ ۱۴۴ پر غور کرنا شروع کیا، شرفا نے گھر کے کواڑ بند کیے، پنڈال میں مجمع ہوا، اللہ اکبر، مہاتما گاندھی کی جے

اور بھارت ماتا کی جے وغیرہ کے نعرے بلند کیے گئے اور لیڈر صاحب ہار پھول میں لدے قربانی کا بکرا بنے صدارت کی کرسی پر براجمان یا جلوہ افروز ہوئے۔ جو مرے تھے ان پر تعزیت کے اور جو زندہ تھے ان پر لعنت کے ووٹ پاس کیے گئے۔ خطبۂ صدارت میں اپنی اور اپنے منتخب کرنے والوں کی نالائقی پر اظہارِ تشکر کیا۔ اس کے بعد جو مسئلہ اٹھایا گیا اس میں حضرتِ آدم سے لے کر پنڈال تک کی کارروائیوں کا جائزہ لیا گیا اور قوم، نصب العین، ماحول، حکومت، تعلیم، افلاس اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ جن کو مقرروں اور اخبار نویسوں نے آرائشِ سخن کے طور پر رواج دے رکھا ہے، دہرائے جانے لگے۔

لیڈر نے حکومت، پولیس، قوم اور دوسرے لیڈروں کو صلواتیں سنائیں۔ مجمع نے تالیاں بجائیں، دعوتیں ہوئیں، سفر خرچ وصول کیا گیا۔ لیڈر صاحب رخصت ہوئے۔ شہر میں کچھ دنوں بعد بلوہ ہوا، کیلوں کی عید آئی۔ جن کو چوٹ لگی یا جن سے پولیس کو چوٹ پہنچی تھی جیل خانہ بھیج دیے گئے۔

مولوی یا پیر صاحبان بالعموم رمضان میں رخصتِ سفر درست کرتے ہیں۔ اس میں دو فائدے ہیں۔ ایک طرف روزہ کو شہ مات ہوئی، دوسری طرف سحری و افطار، خیر خیرات حصے میں آئے۔ مریدوں اور عقیدت مندوں کے گھر صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ بچہ کا ختنہ، یا بسم اللہ، لڑکی کی شادی اور رخصتی، حمل و وضعِ حمل یا ان کا ردِ عمل، مریض کی حیات و ممات سب اسی دن کے لیے ملتوی رکھے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نازل ہوئے، کسی کو اولادِ نرینہ عطا ہوتی ہے، کسی کو بہشت نصیب ہوتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کو جہنم کے لیے نامزد کیا جاتا ہے۔ بعضوں کی جائداد کے متولی بنتے ہیں۔ تعویذ لکھیں گے تو صرف مرغِ سفید کے خون سے تاکہ دسترخوان پر مرغِ مسلم موجود ہو۔

گورنر یا وائسرائے کی آمد ہے۔ یہ آمد بھی آورد ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ جہاں کہیں جاتے ہیں مدعو ہوتے ہیں لیکن یہ امر اب تک تصفیہ طلب ہے کہ ان کا مدعو کیا جانا ناگزیر ہے یا ان کا تشریف لانا لازمی ہے۔ کچھ ہی ہو ان کا ورودِ مسعود مفید ہے۔ ہندوستان کی میونسپلٹیاں صرف دو وقت اپنی زندگی یا اپنے کارآمد ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔ یا تو میونسپلٹی کے

کے کسی ممبر یا چیئرمین کے ہاں ، فوتی پیدائش "قسم کا کوئی واقعہ پیش آگیا ہو یا" حکام بالادست" کی آمد ہو ۔میونسپلٹی کی بیداری میونسپلٹی کی کوڑا گاڑی کا متحرک ہونا ہے، یہی دو مواقع ایسے ہیں جب یہ گاڑیاں حرکت میں آتی ہیں۔ اس کوڑا گاڑی کو صرف کوڑا کہنا زیادہ صحیح ہے. نیم جان بھینسے اور تنومند بھنگی کو بھی اس میں شمار کرنا چاہیے۔ کوڑا اکثر متحرک بھی دیکھا گیا ہے لیکن کوڑا گاڑی قائم بالذات رہتی ہے. آج تک کوئی گاڑی درست حالت میں نہیں پائی گئی. پانی چھڑکنے والی گاڑیوں کو دیکھ کر یہ کوڑا چھڑکنے والی گاڑیاں خود بخود معرض وجود میں آگئیں جہاں تک کوڑے کا تعلق ہے ان گاڑیوں کو یہ گوارا نہیں کہ کوڑے کا سارا سرمایہ ایک ہی مرکز پر جائے اس لیے وہ اُن کو ہر طرف تقسیم کرتی رہتی ہیں.

اگر حکام کی آمد یا ارباب بلدیہ (میونسپلٹی) کے ہاں تقریب نہ ہو تو یقیناً ساری بستی کسی وبا کی شکار ہو جائے. فرض کیجیے گورنر یا گورنر جنرل بہادر کہیں نزول اجلال فرمانے والے ہیں. غریب اور امیر دونوں متفکر ہوتے ہیں غریب کو تو یہ فکر کہ کہیں صفائی کے سلسلے میں ان کے شکستہ مکانات یا ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں سطح زمین سے نہ ملادی جائیں امیر کو یہ فکر کہ کس قسم کا خطاب کس قسم کے اخراجات کا مطالبہ کرتا ہے. پھر یہ سوچا جاتا ہے کہ کہاں تک خود ان کا اندوختہ اور کہاں تک رعایا اور کسانوں کی پونجی اس سودے کی متحمل ہو سکتی ہے. اگر دونوں راسیں بیٹھ گئیں تو فہوالمراد، ورنہ قرض کی سبیل نکالی جاتی ہے. ان سب سے عہدہ برآ ہونے کے بعد مغرور اور مہنگے مہمان کو چائے، لنچ، ڈنر، رقص و سرود، افتتاحیات اور تاسیسیات کے سلسلے میں مدعو کیا جاتا ہے جوں جوں مقررہ ساعت قریب آتی جاتی ہے، ہنگامے بڑھنے لگتے ہیں، پولیس چپے چپے پر پھیل جاتی ہے جو شخص کسی جرم کے سلسلے میں ماخوذ یا مشتبہ ہے اس کو تا مراجعت حاکم زیرِ نگرانی رکھا جاتا ہے. دن رات ایک کر دیے جاتے ہیں آرائش و زیبائش اور دھوم دھام پر روپیہ اس طرح صرف کیا جاتا ہے جس طور پر جوان اپنی جوانی یا طالب علم والدین کے روپیہ اڑاتا ہے. ان حکام کی آمد پر ہندوستانی رؤسا یا انجمنیں اور تعلیم گاہیں ایک سال میں جتنے روپے صرف کر دیتی ہیں ان کو بس انداز کر لیا جائے تو خیال ہے ایک سال میں کئی سوراج ہندوستان کے لیے حاصل کیے جا سکتے ہیں

اور یہ رقم حکومت کے ہاتھ لگ جائے تو اس کو ہندوستانی بجٹ کی اس رقمِ خطیر کی ضرورت باقی نہ رہے جو صوبہ سرحد کے نظم ونسق یا دوسرے سیاسی مصالح کے سلسلے میں صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اور جس کا حساب دینے سے وہ اتنا ہی گھبراتی ہے جتنا گھریلو شوہر اور بیویاں ایک دوسرے کا نام بتانے میں۔

ان حکام کا ہندوستانی ریاستوں میں ورود بظاہر ایک شاندار جلوس تقریب نشاط و کامرانی معلوم ہوتا ہے لیکن میزبان رؤسا پر جو کچھ گزر جاتی ہے، اس کا اندازہ بمشکل کیا جاسکتا ہے۔ وقت، عافیت اور روپیہ کا خسارہ تو در کنار لطف اس وقت آتا ہے جب ملک معظم کے جام صحت کے بعد معزز مہمان گل افشانیِ گفتار کرتا ہے ریاستیں اس پر تلی ہیں کہ ان کے اپنے اندرونی معاملات میں حکومتِ ہند کو دخل دینے کا حق نہ حاصل ہو اس کو وہ مساوات یا خود مختاری کے منافی سمجھتے ہیں دوسری طرف معزز نمائندگانِ حکومت کا اصولِ مہمانی یا حکمرانی یہ ہے کہ ان کو عیش اڑانے دو نہ چین سے رہنے دو۔ لیکن دوسری ریاستوں میں یہ اصول نافذ کرتے ہیں کہ کار ہوتا ہے یعنی عیش کیوں نہیں اڑاتے؟ فی الحال ان ریاستوں اور برطانوی حکومت کے درمیان وہی تعلقات ہیں جو ہندوستانی شوہر اور بیوی کے ہوتے ہیں حکومت ریاستوں کو وہی حیثیت دینی چاہتی ہے جو ہندوستانی شوہر اور ہندوستانی بیوی کی ہے۔ یعنی بیوی کا کام یہ ہے کہ وہ کھلائے پلائے اور خوش رکھے شوہر کا فریضہ یہ ہے کہ وہ بیوی کے مطالبات یا میلانات کو اپنے مقاصد سے بلند یا ان کا منافی نہ ہونے دے۔ لیکن اب ریاستیں روشن خیال بیویوں کی حیثیت حاصل کرنا چاہتی ہیں یعنی کھلاؤ پلاؤ اور آزاد رکھو اور ایک دوسرے کے مقاصد ایک دوسرے کی ذمہ داری پر چھوڑ دو اور ذمہ داری کسے کہتے ہیں اس میں تجسس نہ کرو۔

معزز مہمان آئے اور معزز مہمان چلے گئے میزبان نے دن گننے شروع کیے نوروز یا ملک معظم کی سال گرہ کا موقع آیا دونوں پر یاس و امید کی دھوپ چھاؤں پڑنی شروع ہوئی۔ دنیا کی بے ثباتی اور سب سے پہلے اپنی حماقت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے

خیال آتا ہے تارک موالات کیوں نہ ہوئے جو کچھ ضیافت میں صرف کیا تھا اس کو کسی بہتر کام میں کیوں نہ لگا دیا، لڑکی کی شادی ہو سکتی تھی۔ مہاجن کا قرض بھی ہلکا کیا جا سکتا تھا۔ پچھلے سال وبا میں کیوں نہ چل بسے۔ غرض وہ تمام باتیں ایک ایک کر کے تازہ ہو جاتی ہیں جو شاید عالم نزع میں بھی ان کو یاد نہ آتیں۔ ایک اور قسم کی آمد ہے ایک بزرگ شکستہ حال شکستہ تر جھونپڑے میں اسی طرح کے بستر پر ایک شہر آرزو "کے ساتھ "ایک زانوئے تامل" بنے بیٹھے ہیں۔ مضامین کی آمد ہے بیوی سردی کے مارے باورچی خانہ میں بیٹھی کانپ رہی ہے۔ ایک بچہ سینے سے لگا ہوا دودھ کھینچتے کھینچتے اور چیختے چیختے گود ہی میں سو گیا ہے۔ دوسرا بیٹھا اونگھ رہا ہے۔ سب سے بڑی لڑکی دم بدم سرد ہونے والے چولھے کے منہ سے جا لگی ہے اور تیسرے بچے کو گلے سے لٹکائے ہوئے ہے اور آس پاس کا کام بچہ کو لیے ہوئے کھسک کھسک کر کرتی جاتی ہے کبھی کبھی خود اونگھ جاتی ہے کبھی ماں سے کہتی ہے اگر کہیے تو ایک لکڑی اور لگا دوں۔ سالن ٹھنڈا ہونے لگا ہے۔ ماں سمجھ جاتی ہے کہ یہ معصومانہ حسن طلب صرف بھوک اور سردی کی بنا پر ہے کچھ جواب نہیں دیتی لیکن لڑکی کو اس مادرانہ یاس انگیز شفقت سے دیکھنے لگتی ہے کہ لڑکی اپنے اندر استقلال اور شکر کی توانائی محسوس کرنے لگتی ہے۔ پھر کہتی ہے، سنیے وہ ابا میاں کھانسے۔ ارے ننھے ابا میاں آئے ہیں تو ان کی گود میں بیٹھ کر کھانا کھائے گا۔ اماں دیگچی اتاریے میں برتن لاتی ہوں ــــ اماں ان باتوں کو خوب سمجھتی ہے لیکن اس دفعہ زیادہ واضح طور پر لڑکی کی تالیف قلب کرتی ہے۔ اچھا بی بی تم بچوں کو سلا لو۔ میں ذرا پہلو بدل لوں اور وضو بھی کر لوں۔ لڑکی ہر کام کے لیے مستعدی سے آمادہ ہو جاتی ہے اور باوجود اس کے کہ ماں عمداً ہر کام میں سستی کرتی ہے لڑکی تمام فرائض سے سبک دوش ہو جاتی ہے۔ ماں کو تقریباً خاموش اور مایوس دیکھ کر کہتی ہے ابا کو بلا لاؤں۔ ماں کہتی ہے بیٹی ان کے کام میں مخل نہ ہو ان کی طبیعت اچھی نہیں۔ بلاؤ گی تو ان کو تکلیف ہو گی اور ہاں بیٹی تم کچھ کھا لو۔ میں نماز پڑھ کر تم کو کھانے میں شریک کر لوں گی۔ لڑکی کہتی ہے نہیں بھوک نہیں ہے۔ میں ابا میاں کا انتظار کروں گی۔ اور ہاں اماں ابا جان کیسی شکر قند لائے تھے آپ نے اس دن کیسی نفیس کھیر تیار کی تھی، اس دن ہم سب . . . کی شادی میں کیسے اچھے اچھے کپڑے پہن کر گئے تھے

احمد کا کوٹ صابرہ کو کیسا ٹھیک آیا تھا۔ ماں ہوں ہاں کرتی جاتی ہے۔ چراغ کی روشنی مدھم ہونے لگتی ہے۔ اکّا دکّا سلگتے ہوئے کوئلے بھی راکھ میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ جلتے ہوئے انگارے سے راکھ جھڑ جاتی ہے تو ایک لمحے کے لیے چولھے کی خاکستری فضا بیدار سی ہو جاتی ہے۔ ماں سوچتی ہے آج تمام دن آفتاب نہیں نکلا۔ بچوں کا بستر بالکل نہیں سوکھ سکا ہے۔ ان کو شب میں کیسی سردی لگے گی صبح بچوں کا ناشتہ کیا ہوگا۔ دھوبی کپڑے نہیں لایا۔ کل جمعہ کو کپڑے کیوں کر بدلے جائیں گے؟

دوسری طرف اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔ اس گھر کے مالک (شاعر) مراقبے میں ہیں فضائے تخیّل میں معلوم نہیں کہاں کہاں پرواز کر رہے ہیں۔ کبھی صحرائے نجد میں "عرسِ مجنوں" منا رہے ہیں۔ کبھی نپولین اور صلاح الدین کے ہمدوش سرگرمِ کارزار ہیں۔ کہیں کارنیگی اور فورڈ کی دولت کو ٹھکرا رہے ہیں، کبھی آستانۂ محبوب پر دعائیں "صرفِ درباں" کر رہے ہیں۔ ایک طرف "پریوں کی محفل" ہے ان سب سے دل کو بچائے ہوئے معلوم نہیں دیووں کے دنگل میں لیے جا رہے ہیں یا کسی خیراتی ہسپتال میں۔ کبھی رازی، ہیگل، برگساں اور رومی سب کو پھلانگتے ہوئے "عدم سے بھی پرے" پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کی "آہِ آتشیں سے بالِ عنقا" خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ کبھی پٹ گلیڈسٹون میٹرنخ کے مقبرہ کو ٹھکراتے ہوئے لائڈ جارج و برکن ہڈ کو کہنی مارتے ہوئے مس میو سے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان سے گزرتے ہیں تو شدھی سنگٹھن سب پر لات مارتے ہوئے لکشمی کاٹن مل کی دھجیاں بکھیرتے چھوٹانی سا ملز پہ جا کر دم لیتے ہیں۔ خالی دماغ اور خالی شکم میں خیالات کا وہ ہجوم ہو رہا ہے جیسے کسی تھرڈ کلاس میں یاتری بھر دیے گئے ہیں۔ کبھی لیلیٰ، عذرا، کلوپیٹرا، دمینتی، ان کی نگاہِ کرم کی متمنی کھڑی ہیں۔ اور یہ آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں یعنی جب تک کہ ان کا لپٹا ہوا بستر کھلا" دیکھیے تو سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے پڑے ہیں" مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب" ملک الموت سے آنکھ مچولی کر رہے ہیں۔ کبھی غالب کے اس شعر

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں!

کو پڑھتے ہیں اور غالبؔ کے قومی شاعر ہونے پر وجد کرتے ہیں اور بالآخر:

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ!
ننگِ پیری ہے جوانی میری!!

کا مصداق بن جاتے ہیں۔

مغالطہ

نان کوآپریشن کے مانند مغالطہ بھی ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ نان کوآپریشن اور مغالطہ دونوں اب تک کسی منطقی تعریف کے نہ متحمل ہوئے نہ محتاج، جس طور پر نان کوآپریشن کے مختلف خفی اور جلی پہلو ہوتے ہیں، مغالطہ بھی مختلف النوع اور مختلف الجہات ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ خالی دماغ شیطان کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ یہ ایک غلط فہمی ہے جسے مرورِ ایام نے دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ جب دماغ خالی ہوتا ہے تو اس میں شیطانی وسوسے سما جاتے ہیں۔ وسوسوں کا تعلق تو شکم سے ہے۔ معدہ خالی ہو یا بھرا وسوسے دماغ کی طرف صعود کرتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ہر بھلے مانس کو شکم سیر انفار اور بھوکے اشراف سے بچتے رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ یہی وسوسے کبھی انجرہ کبھی ریاح کبھی مزدور اور کبھی سرمایہ دار کی صورت میں ایسی حکومتوں کو بالخصوص جن کا قیام قانون اور امن کے تحت عمل میں آیا ہو، ستاتے رہتے ہیں۔ حکومت کا سر ریاح اور روشن دماغ ادویات سے ان کا مداوا کرتی رہتی ہے مگر ایک پیش نہیں جاتی چنانچہ

نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ قدیم الایّام سے اب تک جو ضرب المثل صحیح چلی آتی تھی وہ مجروح ہوگئی ہے۔ یعنی رعایا کو اسی قسم کی حکومت ملتی ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ اب ہونے یہ لگا ہے کہ حکومت کو اسی قسم کی رعایا ملتی ہے جس کی وہ سزادار ہوتی ہے۔

مغالطہ کی تحقیق میں میرے پاس وہی مواد موجود ہے جو سوَدا کو اپنے گھوڑے کے سلسلے میں دستیاب ہوا تھا۔ فرق یہ ہے کہ ان کے گھوڑے پر شیطان سوار ہوکر جنّت سے نکلا تھا اور میری تحقیقات یہ ہے کہ مغالطہ خود شیطان پر سوار ہوکر دنیا میں آیا۔ یہ وہی موقع تھا جب فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ ابلیس کو خاکی اور آتشی کا مغالطہ لگا اور فرشتوں کی جماعت سے نکل کر خدا جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا۔ بالآخر ہندستان آگیا۔ ناخواندہ مہمان کی آمد پر سخت احتجاج کیا گیا یعنی "شیطان چلے جاؤ" "شیطان چلے جاؤ" لیکن ان کے استقلال میں فرق نہ آیا اور از آدم تا ایں دم موجود ہیں اور اب وہ خود طرح طرح کے عناصر کو چلے آنے یا چلے جانے کی دعوت دیا کرتے ہیں!

یہ تو شیطان کا تاریخی پہلو تھا لیکن اس کا نفسیاتی پہلو بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ مشیّتِ الٰہی نے عالم کو پیدا کیا تو یہ ضروری ہوا کہ اس نیرنگ خانہ کو ایسی حیثیت دی جائے جس میں ایک طرف مبدءِ اعلیٰ کا عظیم و عسیر الفہم لاہوتی تصوّر قائم رہے دوسری طرف ناسوت کی گریز پا اور رنگین آویزشیں اور لغزشیں بھی کارفرما رہیں۔ انسان کو اگر صرف انسان ہی بنانا یا رکھنا مقصود ہوتا تو ملائک غیر ضروری ہوجاتے اس لیے انسانوں کی جماعت میں تخریب کاری عنصر (اہرمن)، کا اضافہ کیا گیا۔ ابلیس وہاں کے نکالے ہوؤں میں تھا اس کو بڑی دور کی نسبت تھی۔ وہ لاہوتی حقیقتوں کو ناسوتی کرشموں میں بے نقاب کرنے لگا۔ وہ انسان کے کمزور پہلو کو اپنے کمزور بچّے کی مانند زیادہ عزیز رکھتا ہے لیکن اس کا قائل نہیں ہے محض اس لیے کہ وہ قائل ہونا گوارا نہیں کرتا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ زنجیر کی استواری کا مدار زنجیر کے سب سے کمزور حلقے پر ہوتا ہے اس لیے ذہن و دماغ سے بہتر میدان اس کی جولانگاہ کے لیے نہیں ہوسکتا تھا۔

یہاں تک مغالطہ یا شیطنت کا ایک طائرانہ یا شترانہ جائزہ تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے

کہ دنیائے عمل میں اس نے کیسے گل کھلائے ہیں۔ مغالطہ ایک طرح کی گمراہی ہے جس میں مبتلا ہوکر انسان کچھ ایسا محسوس کرنے لگتا ہے یا محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس صفت میں ساری دنیا فرطِ رشک ورقابت سے جل کر تباہ ہو جائے گی یا اسے تباہ ہو جانا چاہیے اگر اس کے پاس دولت ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نعمت سے بہرہ مند دنیا میں اب تک وہی رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو لوگ اس سے محروم ہیں وہ اس کے قدموں پر گریں گے یا وہ خود کلکٹر کے قدموں پر گر کر ان کو جیل خانے بھجوا دے گا۔ لطف یہ ہے کہ دونوں قدموں پر گرتے ہیں اور دونوں کامیابی سے دور رہتے ہیں۔ ایک اس فعل کو اس لیے اختیار کرتا ہے کہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہوتی دوسرا اس لیے کرتا ہے کہ اس کے بازوؤں میں سکت نہیں ہوتی۔

دولت کا مغالطہ عجیب وغریب ہے۔ دولت مند اپنے آپ کو سب سے زیادہ طاقت ور، عقل مند، قوم پرست، طرفہ یہ کہ سب سے زیادہ معقول بھی سمجھتا ہے۔ کبھی بحیثیت مجموعی کبھی علیحدہ علیحدہ۔

اس کے نزدیک یہ تمام سعادتیں بنک سسٹم پر قائم ہیں۔ ہر مد میں کچھ رقم جمع کر دی جس کی آمدنی سے ان میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دنیا کی عظیم ہستیاں نیز ارکینِ مسلم یونیورسٹی کمیشن کے مورثِ اعلیٰ بنک میں اتنی دولت جمع کر گئے تھے کہ ساری سعادت اور شہرت ان کو بطور سود ملتی رہتی ہے۔ حالانکہ خود اسے جو نام نہاد اہمیت حاصل ہے اس کی تحقیق اپنے نظریہ کے مطابق کرنے سے گریز کرتا ہے اور کوئی دوسرا اسی نیک کام کے لیے اپنی خدمات پیش کرے تو بگڑتا ہے اور عدالتی چارہ جوئی کی دھمکی دیتا ہے۔ لیکن کوئی دوسرا عدالتی چارہ جوئی پر آمادہ ہو جائے تو اس سے ہر قیمت پر صلح کر لیتا ہے۔

وہ دولت کا غلام بن کر غیر دولت مندوں پر حکومت کرنا چاہتا ہے، اور ہندوستانیوں کے مانند اس کا قائل ہونا پسند نہیں کرتا کہ غلامی اور برتری دو متضاد باتیں ہیں وہ ڈومینین اسٹیٹس یا سوراج ملک معظم کی سالگرہ کے موقع پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی اس کے مغالطے کا مضحک پہلو ہے۔ وہ جتنا جاہل ہوگا اتنا ہی عالموں سے علم وفضل کی باتیں کرے گا۔ اور وہ بھی

اس طور پر گویا اس کے مخاطب ان جواہر پاروں سے اتنا ہی ناآشنا تھے جتنا مس میو ہندوستان سے جیسے وہ خود ان فنون کا امام رہ چکا ہے لیکن بر بنائے ایثار دوسروں کے لیے ترک کر چکا ہے۔ اس فرقہ میں ایسے بھی ملیں گے جو علم و ادب کے اکابر سے اس فروتنی اور فتادگی سے پیش آئیں گے گویا مخاطب کو نعوذ باللہ۔ کلکٹر صاحب سمجھتے ہیں مثلاً میں تو آپ کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہوں، آپ کا فرمانا سرآنکھوں پر بے شک لاریب آپ ملک و قوم کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ آپ کے طفیل خدا قوم پر رحم کرے "مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور" وغیرہ اور یہ سب اس لیے کہ وہ آپ کو احمق سمجھتا ہے۔ کبھی کبھی اس لیے بھی کہ دنیا یہ سمجھ لے کہ وہ علم و فن کا مربیؔ اور سرپرست ہے اور اکبر و بکرماجیت کے عہد کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے اتنا ہی مضطرب ہے جتنا مہاسبھا اور جمعیتہ العلماء ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دلانے کے لیے دست بدعا یا دست و گریباں ہیں۔ آپ سے اس کا کام نکلتا ہو گا تو وہ آپ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ آپ بیک وقت اس کے بھائی، باپ یا لڑکے اور کلکٹر صاحب تو نہیں کلکٹر صاحب کے چپراسی یا پیشکار ہیں اور آپ بھی باوجود اس کے کہ صرف ایک کثیر الاولاد بے روزگار مقروض ہندوستانی شوہر ہیں تھوڑی دیر کے لیے اس مغالطہ میں پڑ جائیں گے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے ممکن ہے وہ صحیح ہو!

جس طور پر حکومتِ ہند کو آئی سی ایس نے مغالطہ میں مبتلا کر رکھا ہے اسی طور پر طبقۂ رؤسا کو مصاحبین اور متوسلین نے گمراہ کر رکھا ہے۔ حکومتِ ہند نے آئی سی ایس کو اپنا ہاتھ پاؤں نہیں بلکہ عقل و دماغ قرار دے دیا ہے۔ دوسری طرف رؤسا کے مصاحبین ہیں جو ان کے ہاتھ پاؤں ہیں۔ یہ عام طور پر جاہل لیکن خصوصیت کے ساتھ عقل مند ہوتے ہیں اور چونکہ اپنی بعض نہایت قیمتی متاع رؤسا کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہوتے ہیں اس لیے ان کا معاوضہ بھی اس دلیری اور سفاکی سے لیتے ہیں۔ ان مصاحبوں کی وفاداری اور ذہانت کا ان کی سرکار پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ کبھی یہ سوچ نہیں سکتا کہ اس دنیا میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اس کے اور اس کے لواحقین سے زیادہ قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ مشیر و مصاحب اکثر تیسرے درجہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن مصاحبوں کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ واجد علی شاہ اور اکبر دونوں

مصاحبوں کے گمراہ کیے ہوئے تھے لیکن ایک "رنگیلے" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں دوسرے "اللہ اکبر"!

بعض کو یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کا وجود دنیا کے لیے ناگزیر ہے. کوئی پوچھے کہ اس بیسویں صدی میں کتنے ہیں جو خود خدا کے ناگزیر ہونے کے قائل ہیں. خدا کو جانے دیجیے کتنے ہیں جو ہندوستان کے امن و ترقی کے لیے حکومتِ برطانیہ کو ناگزیر سمجھتے ہیں! حالانکہ حکومتِ برطانیہ کے پاس دفعہ ۱۴۴ سے لے کر سرہائیکل اوڈائر تک موجود ہیں.

میرے دوایسے کرم فرما ہیں جو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹا یا دنیا سے اٹھالیے گئے تو نظامِ شمسی درہم برہم ہو جائے گا. ایک تو "مخادمہ" ہیں جو میرے یہاں کھانا پکاتی ہیں اور ہر اُس چیز کو میرے گھر کے لیے غیر ضروری سمجھتی ہیں جو گھر والوں کی نظر سے اوجھل اور نقل و حمل کی متحمل ہو. ان کو کسی نے یقین دلا دیا ہے کہ ہر دانے پر ہر شخص کا نام لکھا ہوتا ہے اور وہ اس کے حصہ میں آکر رہتا ہے. اس بنا پر ان کا مسلک ایک طور پر وہی ہے جو بعض صوفیا کا ہے یہ "ہمہ از اوست" کے بجائے "ہمہ برائے ماست" کی قائل ہیں. ان کا خیال ہے کہ جس روز انھوں نے ہم کو اپنی خدمات سے سبکدوش کر دیا اسی دن ہم پر کمیشن بیٹھ جائے گا یا ہم دنیا سے اٹھالیے جائیں گے. ہر شخص کے بارے میں ایک رائے رکھتی ہیں. ان کا خیال ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی زبونی کا سبب یہ ہے کہ لوگ بیویاں رکھنے کے عادی ہیں بلکہ جس قدر بیوی پر اعتماد کرتے ہیں اتنا ان پر نہیں کرتے. چنانچہ بڑی بیزاری و برہمی کے ساتھ لکڑی پھونکتی ہیں اور میں کسی محفوظ مقام پر بیٹھا ڈرتا رہتا ہوں کہ لکڑی کے ساتھ یہ کہیں بیوی بچے کو چولھے میں نہ جھونک دیں. کبھی کبھی یہ قطعِ تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں. اس وقت ہم کو اپنی حالت پر ترس آجاتا ہے اور اس اندیشے سے کہ کہیں دوسرا ان سے بھی زیادہ "مہربان" نہ ملے فوراً ایک جلسۂ خاص منعقد کیا جاتا ہے جس میں ان کی خدمات و احسانات کا اعتراف کرتا ہوں. بیوی "شیم شیم" اور بچے "ہیر ہیر" رجن کا اخباری ترجمہ "شرم شرم" اور "سنو سنو" ہے) کرتے ہیں اور ایک بار پھر ہم ان کو اپنے آپ پر مسلط کر لیتے ہیں.

سرسید کی بدنصیبی تھی اور ہماری اب بھی ہے کہ یہ سرسید کے عہد میں تھیں.

ان کو سرسید کا اتنا شدید مغالطہ ہے کہ ہربات پر سرسید یا ان کے عہد کا حوالہ دیتی ہیں اور چوں کہ ہم پیدائش کے اعتبار سے مسلمان اور پیشہ کی حیثیت سے قبر پرست واقع ہوئے ہیں، اس لیے سرسید کا نام مخدومہ کی زبان سے سن کر خائف وخفیف ہوتے رہتے ہیں۔ چیزیں چرانے اور لکڑی پھونکنے کے علاوہ ان کا فرصت کا لمحہ سرسید کی خطبہ خوانی میں صرف ہوتا ہے۔ ایک دن عرض کیا بڑی بی ان دنوں کمیشن آیا ہوا ہے ہم لوگ فوجداری سپرد ہیں کچھ دعا کرو۔ کہنے لگیں میاں سرسید کے مزار پر چراغ جلاؤ اور پھول چڑھاؤ بیویوں سے کہو غریب محتاجوں کو ستائیں نہیں۔ ان کے کاموں میں عیب نہ نکالیں۔ سرسید کی برسی میں ایک سال چراغ چڑھانے اور طاق بھرنے نہیں گئی تھی، میری بچی کے چیچک نکل آئی، میاں جب سے کان پکڑا ہر سال برسی پر مزار جاتی ہوں اور ایک پاؤں پر کھڑی ہوکر دعا مانگتی ہوں کہ کالج کے لڑکے بڑے اچھے ہیں، بیویاں البتہ بہت ستاتی ہیں، ان کو کوئی خواب دکھاؤ۔ میں تو ان کو ایک دن میں ٹھیک کرلوں لیکن یہ تمھارا ڈائننگ ہال ٹھیک نہیں ہونے دیتا۔ کھانا پکانا بند کردوں تو سب ڈائننگ ہال سے بریانی کھانے لگتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یہ تو سب رہا لکڑی چولھے سے کھینچ لوبے کار جل رہی ہے کہنے لگیں میاں سرسید کے زمانے میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ بیوی نے کہا آج کھانا پکنے میں دیر ہوئی ذرا جلدی کرو۔ فرمایا کہہ لو بیوی کہہ لو سرسید کا زمانہ ہوتا تو بتاتی۔ بغرض سرسید، ان کا عہد اور ان کے کارنامے اس درجہ ان پر مسلط ہیں اور بات بات پر مرحوم کو اس کثرت سے یاد کرتی ہیں اور یاد دلاتی رہتی ہیں کہ کبھی کبھی یہ جی چاہنے لگتا ہے کہ موقع ملے، سرسید اجازت دیں اور بیوی مانع نہ ہوں تو بڑی بی کے ساتھ سرسید ہی کے مزار میں سماجاؤں۔

میرے دوست ابھی جیل خانہ سے واپس آئے ہیں۔ نان کوآپریشن کی تعبیر میں ان سے اور ضلع کے کلکٹر سے اختلافِ آرا ہوا۔ اس نے ایسا طول پکڑا کہ جیل خانہ جانا پڑا۔ فی الحال ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان سے اور ان کے خاندان سے زیادہ دنیا میں نام ونمود پیدا کرنے کا کوئی اور اہل نہیں ہے۔ جب کبھی اس قسم کا تذکرہ آئے گا کہ فلاں شخص نہایت قابل، منتظم، خوبرو یا پرہیزگار ہے۔ تو وہ یہ فرمائیں گے کہ ان کو یا ان کے کسی عزیز یا رشتہ دار

کو اس قسم کے ناروا ذرائع اور وسائل حاصل نہیں ہوسے ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ بالان کے عزیز اس پایہ کے نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ کارنیگی راک فیلر کا تذکرہ آیا فرمانے لگے میرے پاس اتنا روپیہ ہوتی سہولتیں نصیب ہوں تو کیا میں کارنیگی اور راک فیلر نہیں بن سکتا، مصطفےٰ کمال کو دیکھو اسلام سے برگشتہ اور بیزار ہوکر اتنی شہرت حاصل کرلی تو کیا ہوا مجھے دیکھو۔

منکرِ بودن وہمرنگ مستاں زیستن!

ایک مرتبہ ذکر چھڑا کہ یوربین عورتیں بڑی محنتی اور منتظم ہوتی ہیں۔ فرمانے لگے یوں نہ کہیے گا پروپگنڈا کرتا ہوں لیکن یقین مانیے جفاکشی کے ان امور میں میری بیوی کو کمال حاصل ہے۔ یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ میرے حصّہ میں آئی ورنہ اگر کہیں یورپ میں پیدا ہوئی ہوتی اور کمبخت پردہ وغیرہ کی پابند نہ ہوتی تو لطیفہ خانم اور ملکہ ثریا کا کوئی نام نہ لیتا۔ میری خود یہ حالت ہے کہ ان کے سامنے بالکل سہما ہوا رہتا ہوں یہ انھیں کی تعلیم و تربیت کا اثر ہے کہ میرے بچے صحت اور ذہانت میں اپنا نظیر نہیں رکھتے چھوٹے کو آپ نے دیکھا ہوگا اس کی ذہانت کا خیال کرتا ہوں تو دنگ رہ جاتا ہوں۔ ایک دن تو اس نے مجھ کو بالکل متحیر کردیا میں اندر بیٹھا پڑھ رہا تھا راجہ اندر کی تصویر دیکھ کر کہنے لگا کیوں ابا یہ آپ کی تصویر ہے نا؟ اتفاق سے وہ بھی بیٹھی ہوئی تھیں بول اٹھیں کیوں بے۔ یہ تیرے ابا ہیں تو کیا یہ ساری قطامہ جو ارد گرد کھڑی ہیں وہ تیری نانی ہیں!

قابلیت کا ذکر آیا تو فرمانے لگے میرا بھتیجا آئیڈیل طالب علم ہے۔ کل کلب میں میری زبان سے اس کا نام نکل گیا سب لوگ تعجب اور فخر سے دریافت کرنے لگے کیوں صاحب وہ آپ کا بھتیجا ہے: ایک صاحب نے فرمایا آپ اس کو ولایت کیوں نہیں بھیج دیتے۔ دوسرا بولا اس کو کیوں نہیں بتاتے۔ تیسرے بزرگ دریافت فرمانے لگے کیوں صاحب ان کی شادی ہوئی ہے یا نہیں؟

میرے دوست کوئی ایسی چیز پسند نہیں کرتے جو ان کے پاس نہ ہو بلکہ دوسروں کی ملک ہو آپ نہایت اچھا کپڑا پہن کر جائیے وہ کہیں گے سِلا اچھا نہیں، رنگ بھی یونہی سا

ہے میری شیروانی تو دیکھی ہوگی۔ ایک دن پہن کر نکلا تو خلقت عش عش کرنے لگی۔ آپ کا مکان اچھا ہے لیکن کچھ تاریک سا ہے میرے مکان کو دیکھیے اکثر رات کو صحن میں نکل کر دیکھا ہے تمام در و دیوار روشن اور شگفتہ نظر آئے آپ کے گھر پر تو بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

غرض آپ کوئی تذکرہ کریں یہ اپنا اپنے بیوی بچوں یا عزیزوں کا پروپیگنڈا کیے بغیر نہ رہیں گے۔ جیل خانہ میں اس عادت کو انھوں نے بالکل ترک کر دیا تھا کیوں کہ قیدیوں کے جرائم سن کر اکثر اپنے قبیلے کے کارناموں کا خطبہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پولیس نے تحقیقات شروع کر دی بالآخر ایک دن اعزا ملنے آئے اور تاکید کر دی کہ وہ اس طرح ساتھیوں کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ فرمایا کریں ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ سارے رشتے دار جیل خانہ پہنچ جائیں گے۔

ڈپٹی کلکٹر کو گورنمنٹ سے وہی نسبت ہے جو کنگارو کو اپنے بچّہ کے ساتھ ہوتی ہے۔ جس طور پر کنگارو کا بچّہ خطرے کی آہٹ پا کر ماں کی جھونج میں جا بیٹھتا ہے۔ ڈپٹی کلکٹر بھی حکومت کی جھونج میں پناہ لیتا ہے لیکن خطرے کا سامنا نہ ہو تو ڈپٹی کلکٹر نہ کسی کی نیاز مندی کو خطرہ میں لائے گا نہ کسی کی ناموس کو صرف اپنا نفع دیکھے گا! ڈپٹی کلکٹر مغالطے کے اعتبار سے کئی قسم کا ہوتا ہے مثلاً مادر زاد ڈپٹی کلکٹر، چوبیس گھنٹہ ڈپٹی کلکٹر، پیشہ ور ڈپٹی کلکٹر وغیرہ۔ ڈپٹی کلکٹر تنہا نہیں ہوتا بلکہ ایک ڈپٹی کلکٹر کے معنی بے شمار ڈپٹی کلکٹروں کے ہیں اس کے دوست رشتے دار چپراسی خانساماں بھنگی، بہشتی سب کے سب ڈپٹی ہوتے ہیں۔ ڈپٹی کلکٹری کی تاریخ میں بعض ابتدائی قسمیں ایسی ملتی ہیں جو اب بعض جانوروں کی مانند یا تو ناپید ہوگئی ہیں یا خال خال کہیں نظر آجاتی ہیں۔

کسی زمانے میں ایک ڈپٹی فتح علی خاں تھے شکل صورت ڈیل ڈول رعب داب میں لندھور بن سعدان یا رحمت اللہ رعد کی بڑی جنتری اور اس کی بعض تصاویر یاد ہوں تو ان کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ صرف سزا دیتے تھے اور شبہہ کا فائدہ اگر کبھی کسی نے اٹھایا تو وہ ملزم نہیں بلکہ اس کے وکیل مختار ہوتے تھے اور یہی سبب تھا کہ وکیل مختار موکل سے

زیادہ اپنی خیر مناتے رہتے ڈپٹی صاحب کا تعزیراتِ ہند کا یہ تصور تھا کہ اس کا مقصد صرف لوگوں کو سزا دینا تھا۔ رہا شبہ یا عدمِ ثبوت اسے وہ وکیلوں کا فریب یا حاکم عدالت کی کمزوری یا عدم قابلیت پر محمول فرماتے تھے۔ ان کی عدالت میں مقدمے کا سزایاب ہونا یقینی ہوتا۔ ان کا کام ہی سزا دینا یا فرصت کے لمحات میں یادِ الٰہی میں مصروف رہنا تھا لیکن عدالت میں خدا کا اور عبادت میں عباد کا لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ڈپٹی صاحب سے ہر شخص ڈرتا تھا۔ بیوی اور بیوی کے گھر والے بھی! خدا جانے کب سے زندہ تھے اور خدا ہی جانے کب تک زندہ رہنے کا قصد رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر شخص جھوٹا تھا اور زدوکوب اور سب و شتم کا سزاوار اس میں بیوی بچے پیش کار وکیل مختار مدعی ملزم کسی کی تخصیص نہ تھی۔

ڈپٹی صاحب دورے پر تھے، بابو گنیشی لال پرانے زمانے کے مختار وکیل، ایڈوکیٹ بیرسٹر سب ہی کچھ تھے، نہایت طرار حکام رس حاضر جواب وقت پڑے شاعری بھی کر لیتے تھے کسی مقدمے کی پیروی میں کیمپ کے ساتھ تھے اور خانساماں وغیرہ کے ساتھ بیٹھے حقہ کے دو چار کش لے رہے تھے قضا را رفعِ حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی ایک طرف بیت الخلا تھا لوٹا لیے بدحواسی کے ساتھ داخل ہوئے وہاں جو دیکھتے ہیں ڈپٹی فتح علی خاں جلوہ افروز ہیں

تو گوئی ہمہ تخت سہراب بود!

لوٹا فوراً زمین پر رکھ دیا جھک کر سلام کیا پھر جو فرار ہوئے تو کہا جاتا ہے جب تک ڈپٹی فتح علی صاحب اس ضلع میں رہے بابو گنیشی لال کو کسی نے عدالت میں نہیں دیکھا۔

چوبیس گھنٹے ڈپٹی کلکٹر کی علامت یہ ہے کہ وہ تنگ سوٹ میں ملبوس ہوگا اور سستے قسم کا سگریٹ کثرت سے پیے گا اور ٹھیک اس وقت جب انگریزی بولنا ضروری ہو وہ غلط اردو بولے گا اور جہاں اردو بولنا مناسب ہو وہ غلط انگریزی شروع کر دے گا۔ زین کے کوٹ پتلون سے اسے خاص الفت ہوتی ہے۔ بالعموم شرعی پتلون پہنے گا یعنی ٹخنوں سے کافی اونچا۔ چھوٹا جوتا۔ گھٹیا۔ کوٹ ہمیشہ تنگ ہوگا۔ گو دیدہ و دانستہ کبھی ایسا کوٹ تیار نہیں کراتا لیکن تن و توش کے بڑھانے میں اس کا ڈپٹی ہونا نادانستہ اور نامعلوم طور پر ہمیشہ معین ہوتا رہتا ہے۔

ڈپٹی کو میل ملاقات کے لیے ڈپٹی ہی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، دوسروں کی صحبت میں یا تو وہ اپنے آپ کو بے وقوف ورنہ برتر سمجھتا ہے لیکن نتیجہ یکساں ہوتا ہے یعنی وہ رہتا بالکل ڈپٹی ہی ہے آپ اس سے ملیں آپ کے سلام پیام، مزاج پرسی، اور اس قسم کے دوسرے تکلفات کو سن کر کچھ اس طرح کا رنگ اختیار کرے گا جیسے یہ سب کچھ غیر متعلق باتیں تھیں، پھر وہ ایسا کھویا کھویا نظر آنے لگے گا جیسے جلد سے جلد آپ سے نجات پانے اور کسی دوسرے ڈپٹی کا منتظر ہو!

سواری میں عام طور سے بائیسکل استعمال کرتا ہے لیکن گھنٹی نہیں بجاتا خاص طور پر احاطۂ عدالت میں پہنچ کر تاکہ کوئی گنوار ٹکراتے ٹکراتے بچے اور اس کو اپنا سفید دانت نکال کر اینگلو انڈین زبان میں اس طرح گالی دینے لگے کہ ایک طرف بے چارہ گنوار سہم جائے دوسری طرف ڈپٹی صاحب کی آمد کی اطلاع ساری کچہری میں ہو جائے۔ وہ ہمیشہ اس کی کوشش کرے گا کہ اس کی وضع قطع اور طور طریقے کو دیکھ کر لوگ یہ یقین کرلیں کہ یہ سلسلہ "فاتحانِ ہند" کی کوئی کڑی ہے گم شدہ نہیں تو گری پڑی سہی!

۲۴ گھنٹے ڈپٹی کلکٹر کی زندگی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوا۔ اس سے قبل کے زندگی اور خاندان کے سارے حالات و حوادث اس طور پر بھلا دے گا گویا وہ کبھی پیش ہی نہیں آئے تھے اب نہ وہ عزیزوں کو پہچانے گا نہ دوستوں کو خاطر میں لائے گا بشرطیکہ وہ کلکٹر صاحب نہ ہوں۔ ڈپٹی کسی وقت کو خاطر میں نہیں لاتا سوا اس کے کہ جب اسے اپنے سے کم درجے کے عزیزوں اور رشتے داروں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو یا کلکٹر صاحب خفا ہوں۔ وہ کبھی کھل کر ہنستا ہوا نہیں پایا جائے گا تاوقتیکہ وہ ڈپٹی برادری میں نہ ہو۔ کبھی ایسا ہوا بھی تو محض یہ محسوس کرانے کے لیے بادلِ ناخواستہ ہنسے گا کہ آپ پر احسان کر رہا ہے! وہ ہر واقعہ یا مسئلے کو خواہ اس کے عقل و فہم سے باہر ہی کیوں نہ ہو اس طور پر سنے گا گویا اس کی تہ تک پہنچ چکا ہے اور آپ جس سنجیدگی یا تشویش کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں وہ آپ کی حماقت کی دلیل ہے۔ ڈپٹی کلکٹر کبھی بے تکلف نہیں ہوتا کیونکہ اس کو یقین ہے کہ اس کے بے تکلف ہونے سے ہندوستان سے انگریزی اقتدار اٹھ جائے گا، اور ظاہر ہے اس کے ساتھ اس کی ڈپٹیت بھی!

بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیئت اور حلیے کے اعتبار سے ان کا عجیب وغریب نظر آنا، اسی کے مطابق لباس تیار کرنا، سر کے بالوں کو بڑھا کر ان کی حالت پر چھوڑ دینا یا انوکھے انداز سے چلنا یا گفتگو کرنا ان کی شہرت یا قابلیت کے لیے اتنا ہی ضروری یا مفید ہے جتنا امرت دھارا یا حکیم صاحب کی گولیاں امراض معدہ میں۔ مثلاً ایک صاحب موسیقی کے فن کے ماہر تھے۔ ان کی عادت برہنہ سر رہنے کی تھی، دوسرے نے اس خیال سے کہ لوگ ان کو بھی ویسا ہی باکمال سمجھنے لگیں، یا ان کو دیکھ کر اول الذکر کا دھوکا ہو ٹوپی ترک فرمادی۔ حالانکہ ان کا کمال اگر ظاہر ہو سکتا تھا تو اس طور پر کہ ٹوپی کے سوا یہ سارے کپڑے ترک فرمادیتے۔

بعض لوگ جو ہمیشہ انگریزی طرز کے لباس پہنتے ہیں جب کوئی غیر معمولی تقریب ہوگی تو وہ قدیم اور متروک ہندوستانی لباس میں نظر آئیں گے تاکہ لوگ حیرت میں آکر یہ سوچنے لگیں کہ ایسا قابل اور ایسا مشہور آدمی جس لباس میں نظر آرہا ہے اس سے اپنے شاندار ماضی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

ایک دوست اس تیوہار اور کچھ تعجب نہیں اس مقصد سے نماز پڑھتے ہیں کہ جو لوگ ان کے ساتھ یا ان کے پیچھے نہیں پڑھتے وہ دوزخی ہیں۔ دوسرے ہیں جن کی زندگی کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ مشہور لوگوں کے ساتھ رہیں اور ان کے ساتھ دیکھے یا پائے جائیں وہ کھیلنے سے قطعاً ناآشنا ہوں گے لیکن کپتان کے اردلی بنے رہیں گے، کہیں کھیل ہو رہا ہو تو گھوم پھر کے وہیں رہیں گے جہاں کھلاڑی جمع ہوں، اپنے سوا کسی دوسرے کو وہاں آنے نہ دیں گے۔ اس سلسلے میں ان کو دو چار پست قسم کے کام کرنے پڑیں یا کپتان یا ٹیم والے ان کو تفریحاً گالی دے دیں یا ایک آدھ ہاتھ تفریحاً رسید بھی کر دیں تو وہ غالب سے نابلد ہونے کے باوجود غالب کے مسلک

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے!

کی پیروی کرتے نظر آئیں گے۔ ان کو اس کا معاوضہ کیا ملتا ہے؟ صرف اتنا کہ وہ کپتان یا کھلاڑی یا دوسرے ممتاز افراد سے بے تکلف ہیں ان کی گفتگو میں شریک ہوں گے کبھی کبھی اپنا کھانا

سنگوا کران کے دستر خوان پر بیٹھ جائیں گے۔ ان کی عدم موجودگی میں دوسروں سے کھیل کا حال
کھیل کا طریقہ یا کھیل کا فلسفہ اس طور پر بیان کریں گے گویا یہ خود اس میں شریک تھے اور
انھیں کے نام پر ٹرافی حوالہ کی گئی ہے۔ پہلی بار تو مجبوری ہے ٹرافی کیپٹن ہی کے ہاتھ میں دی
جائے گی لیکن اس کے بعد غریب ٹرافی ہے اور یہ ہیں۔ تانگے میں، ریل میں، پلیٹ فارم
پر چوراہے پر ہر جگہ ٹرافی انھیں کے آغوش میں ہوگی۔ اس قسم کے لوگ یا اس قسم کی حرکتیں
صرف کھیل کود تک محدود نہیں ہیں زندگی کے ہر شعبے میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً لکھنا پڑھنا۔
تقریر کرنا۔ فیل ہونا، کھیلنا، مانیٹری کرنا۔ اسٹرائک کرنا۔ مارنا مار کھانا۔ شادی کرنا والدین بننا یا
نان کوآپریشن کرنا وغیرہ۔

ایک صاحب اور ہیں جن کا خیال ہے کہ ان کے علاوہ تمام دوسرے لوگ مغالطے میں
مبتلا ہیں۔ اگر ناظرین ان کا ٹھیک پتہ بتا سکیں تو اس صلے میں یہ مضمون دریافت کرنے والے
کے نام معنون کر دیا جائے گا۔

مُرشد

مارواڑی عورتوں، بنگالی مردوں اور شرعی مسلمانوں کے ساتھ سفر کرنے میں مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ ایک بار ان سب کا ساتھ ہوا۔ مرشد ہم بالائے علم! حقیقت یہ ہے کہ مرشد نہ ہوتے تو زنجیر کھینچ لیتا یا سمتِ مخالف سے آنے والی گاڑی پر کود جاتا۔ ایک میں مالی نقصان تھا دوسری میں جان کا۔ کچھ ہوتا یہ کیا کم تھا کہ اپنا ہی ہوتا دوسرے کا نہ ہوتا۔ قومی نقطۂ نظر سے یہ صورت مناسب نہ تھی پھر مرشد کا ساتھ، جن کی معیت میں ایک بار کانگریس کے پنڈال اور حکیم اجمل خاں مرحوم کے مطب میں ہو آیا تھا۔ بہرحال قوم کی خاطر میں نے زندہ رہنا اور سفر کرنا گوارا کر لیا۔

اسی طرح کی قومی الجھنوں اور ذاتی وسوسوں میں مبتلا تھا کہ مرشد پر نظر جا پڑی۔ معلوم ہوا کہ برہمی کے بجائے اضطراب کا عالم ہے۔ مرشد کا اضطراب دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو جب بھوکے ہوتے ہیں اور ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ بھوکے نہ ہوں۔ دوسرا ایک واقعہ ہے جس سے شاید کم لوگ واقف ہوں۔

جس سال کالج نان کو آپریشن کی زد میں آیا مرشد اور میں ہم نوالہ ہم پیالہ ہم سبق

اور ہم خیال تھے۔ مرشد ان طلبہ میں سے تھے جن سے کالج کے اربابِ حل وعقد مرعوب یا مشتبہ رہے، وہ یوں کہ ان کی حاضری ہمیشہ کم رہتی تھی لیکن اچھے سے اچھے نمبروں سے پاس ہوتے۔ یونین کے بے مثل مقرروں میں سے تھے۔ کرتا، پاجامہ گھریلو، داڑھی شرعی، شیروانی حیدرآبادی۔ غذا ڈائننگ ہال کی، ناشتہ دوسروں کا، دوا دہلی کی۔ مرشد کو ہمیشہ اس کا اندیشہ رہا کہ ان کی تندرستی ناقابلِ اعتبار ہے اس لیے آس پاس کے تمام معتبر اور غیر معتبر حکیم اور ڈاکٹروں سے رجوع کیا کرتے تھے جن میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی تھے اور ایسے بھی جن کے نام سے یا تو ان کا سائن بورڈ واقف ہوتا یا خود مرشد یا پھر وہ جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

دہلی جا کر ان سب کی تجویز کردہ یونانی، انگریزی، ویدک دوائیں خریدتے، طرح طرح کے پھل اور مٹھائیاں بھی ہوتیں۔ اسٹیشن کے خوانچہ فروشوں سے بھی کچھ نہ کچھ خرید لاتے۔ بورڈنگ پہنچ کر اعلان کرتے۔ مریضوں اور مخلصوں کا اجتماع ہو جاتا۔ ان فتوحات میں شریک ہونے کی ایک شرط تھی یعنی جو شخص پھل اور مٹھائی میں حصہ لگائے اس کو دوا بھی کھانی پڑے گی۔ اور جو شخص اپنی پسند کی دوا کھائے گا اس کو مرشد کا انتخاب کیا ہوا پھل کھانا پڑے گا۔ اسی طرح اس کے برعکس مرشد دواؤں کے خواص اس مخلصانہ انداز سے بیان کرتے کہ ہم سب اپنے میں کوئی نہ کوئی بیماری یا اس کے آثار محسوس کرنے لگتے۔ کسی نے دوا کھانے میں تامل کیا تو اس کے امراض کے عواقب سے اس طور پر ڈراتے جس طرح مولوی عذابِ عقبیٰ سے۔ اپنی لائی ہوئی دوائیں مرشد خود بہت کم استعمال کرتے البتہ جہاں کہیں پہنچ جاتے اور کسی اور کی دوا رکھی ہوئی مل جاتی تو اس کو کھائے بغیر نہیں رہتے تھے۔ کسی مرض یا مریض کے لیے دوا تیار ہونے کا اہتمام یا چندہ ہوتا تو مرشد خود شریک ہوتے قدمے، دلمے، سخنے۔

ایک دفعہ عطاء اللہ خاں درانی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ خان کو کیمیا بنانے اور کھچڑی پکانے سے غیر معمولی شوق تھا۔ صبح سے شام تک سید محمود (کچی بارک) کے برآمدے میں

انگیٹھی دہکتی رہتی کیمیا سے سیر ہو جاتے تو کھچڑی کی دیگچی آگ پر رکھ دیتے اور کھچڑی سے فراغت پاتے تو کیمیا میں مصروف ہو جاتے ہمونیا سے ڈرتے اور کسی لڑکی پر عاشق تھے۔ مرشد نے فرمایا بھوکا ہوں کچھ کھلاؤ۔ خان نے کہا کھچڑی میں تو دیر ہے اس وقت کچھ اور موجود نہیں۔ بریکیٹ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا اس مرتبان میں کیا ہے فرمایا معجونِ جالینوس دہلی سے منگائی ہے۔ اتنے میں خان کسی دوسری طرف متوجہ ہوئے مرشد نے ساری معجون مرتبان سے معدہ میں منتقل کر دی۔

مرشد پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ کہنے لگے، ہندوستانی دواؤں میں شکر خوشبو یا بدبو کے علاوہ کوئی اور بات قابلِ اعتنا نہیں ہوتی۔ اس لیے مقدار کا سوال نہیں پیدا ہوتا پھر بات دیسی طریقۂ علاج پر چلی۔ فرمایا اطبا مرض کا علاج کرتے ہیں، ہونا چاہیے مریض کا علاج۔ مرض ایک غیر شخصی چیز ہے۔ مریض ایک شخصیت۔ عام طور پر اطبا دونوں کو ایک قرار دیتے ہیں۔ اسی سبب سے مرض کبھی کبھی جاتا رہتا ہے تب بھی مریض ماؤف رہتا ہے۔ عرض کیا مرشد آپ کی قسمت میں دوا کھانے کے بجائے دوا تجویز کرنا ہوتا تو کیا کرتے۔ فرمایا ہر مرض کا علاج اچھی سے اچھی غذا سے کرتا۔ میں نے کہا علاج الغربا شاید اسی اصول پر تصنیف کی گئی ہے۔

ذکر تھا کالج پر نان کوآپریشن کے حملہ کا اور بیچ میں آ گئے یہ "صفحاتِ معترضہ" مرشد کو نان کوآپریشن کی تحریک سے کوئی ایسی دلچسپی نہ تھی بلکہ اربابِ کالج کے ایک حد تک معاون تھے اور نان کوآپریشن کی تحریک کے جلسوں اور ہنگاموں میں تفریحاً شریک ہوا کرتے تھے۔ وہ رات آج بھی یاد ہے جب ہم دونوں شورش مچانے والوں کی "سعیِ لاحاصل" پر صاحب باغ میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے کہ صبح کالج تو جانا نہیں ہے ناشتہ میں دلیے کی بجائے کھچڑی کیوں نہ ہو۔ اتنے میں سید نصیر الدین علوی گاتے، گالی دیتے اور ہکلاتے آ گئے ان سب سے فارغ ہو کر گویا ہوئے۔ صبح مجھے غسل کر کے مولانا محمد علی کی ہونے والی تقریر کا جواب سوچنا ہے۔ ذاکر صاحب نے کہا یہی مجھے بھی کرنا ہے۔ بحث کی نوعیت یہ تھی ذاکر صاحب کہتے تھے دو باتوں میں سے ایک کرنی ہوگی یا تو میں نہاؤں گا آپ تقریر کا جواب سوچیں گے یا آپ غسل فرمائیں گے میں تقریر کا جواب سوچوں گا۔ دونوں حرکتیں دونوں نہیں کریں گے

علوی صاحب کو اس پر اصرار تھا کہ پہلے یہ طے کر لیا جائے کہ غسل کا حق مرجح کس کو ہے، غرض تا دیر دونوں میں طرح طرح کی بحث طرح طرح سے ہوتی رہی۔

صبح ہوئی، یونین میں جلسہ ہوا، میں اور مرشد بھی ایک طرف بیٹھ رہے، مولانا محمد علی نے حسبِ معمول بڑی پُرزور تقریر کی لیکن حاضرین پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا، ان کے بعد مولانا شوکت علی آئے، دوپہر ہونے والی تھی۔ دونوں بھائی ٹرین سے کہیں باہر جانے والے تھے تقریروں کی آخری اور کمزور موجیں کنارِ ساحل سے ہم آغوش ہونے ہی والی تھیں کہ مولانا شوکت علی نے آخری بار ایک مایوسانہ وارفتگی کے ساتھ یہ مشہور اور فرسودہ شعر

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

پڑھا اور تھکے ہوئے انداز سے جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، مڑ کر دیکھتا ہوں تو مرشد کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ دم بخود ہو گیا۔ مجمع قابو سے باہر ہو چکا تھا، مرشد کو کھینچتا ہوا باہر لایا۔

پوچھا یہ کیا ہوا، فرمایا رشید صاحب الوداع، زندگی کا آغاز بخیر ہوا انجام کے بھی بخیر ہونے کی دعا کیجیے گا۔ میرے پاس جو کچھ میرا ہے وہ یوسف اور محمود (دو چھوٹے بھائی) کے حوالہ کر دیجیے گا۔ کالج کے کاغذات ہوں گے، ان کو واپس بھیج دیجیے گا، میں نے کہا مرشد اس تحریک سے متعلق اکثر گفتگو رہی آپ اس طریقہ کار کے کچھ ایسے مؤید بھی نہ تھے، آخر یہ ہوا کیا، فرمایا تحریک غلط ہو یا صحیح اس کے بارے میں یقین اور صحت کے ساتھ کچھ کہنا ناممکن بھی ہے اور قبل از وقت بھی، مجھے جس بات نے بے دست و پا کر دیا وہ یہ خیال تھا کہ کہنے والے یہ نہ کہیں کہ علی گڑھ نے ایسی ایک تحریک میں حصہ نہ لیا جس میں مصائب کا سامنا تھا، مجھے تو یہ بتانا ہے کہ فرزندانِ علی گڑھ رزم اور بزم دونوں کی ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں، آپ مزاحم نہ ہوں، پانسا پھینکا جا چکا ہے۔ انجام جو کچھ ہو اچھا خدا حافظ۔

ریل پر سفر کرنے والوں کی ایک عجیب ذہنیت ہوتی ہے، ٹکٹ خرید لینے کے بعد اور کبھی اس کے بغیر بھی یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہر ایسے فعل کے لیے آزاد ہیں جس سے کمپارٹمنٹ

میں گندگی پھیلتی ہو یا مار پیٹ ہو جانے کا امکان ہو۔ ڈبے میں داخل ہوں گے یا داخل ہونے دیے جائیں گے تو اس بدگمانی کے ساتھ کہ دوسرے تمام مسافروں نے ان کے آسائش کے حقوق غصب کر لیے ہیں۔ اور یہ نان کو آپریٹر قسم کے مظلوم ہیں ان کو حق پہنچتا ہے کہ جتنا ظلم چاہیں کریں، دوسرے کو شکایت یا تدارک کا حق نہیں۔ دوسری طرف بقیہ مسافر اس پر تلے ہوتے ہیں کہ نان کو آپریشن کا چاہے جو انجام ہو، نو وارد کی جان ورنہ ناموس کی خیر نہیں۔ دونوں اپنی جیسی کر ڈالتے ہیں لیکن جلد ہی اس طرح گھل مل جاتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ بک بک کرنے، دہی بڑے کھانے اور جھوٹے پتّے ادھر اُدھر بکھیرنے لگیں گے۔

عام طور پر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ بچّے، عورتیں، ریل کے مسافر، محنتی مزدور وغیرہ معمولی سی بات پر برہم ہو کر اس شدت سے لڑتے جھگڑتے ہیں جیسے اس کے بعد پھر کبھی ایک دوسرے کا منہ دیکھنا گوارا نہ کریں گے۔ اور نامعلوم مدت تک درپئے انتقام رہیں گے لیکن تھوڑی ہی دیر میں فریقین ایک دوسرے سے بے تکلّف ہو جائیں گے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا حالانکہ اس سے بدرجہا کم بے لطفی کا کوئی واقعہ پڑھے لکھے مہذب لوگوں کو پیش آجائے تو عمر بھر کے لیے ایک دوسرے سے منحرف ہو جائیں گے۔ شاید ایک کا تعلق جبلّتِ حیوانی سے، دوسرے کا تہذیبِ انسانی سے ہے۔

کمپارٹمنٹ اور غسلخانے کی سرحد پر بیٹھے ہوئے ایک شرعی مسلمان "وضو بنا رہے تھے" وضو کا لوٹا بالعموم میلا اور ٹپکتا ہوتا ہے۔ میلا ہونا اور نہ ہونا ایک نکتہ سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جب تک کوئی چیز طاہر ہے، اس کے میلے ہونے نہ ہونے کا سوال غیر متعلق ہے۔ اگر کسی کو اس سے اتفاق نہیں ہے تو اس کو اپنے گریبان یا تہبند میں منہ ڈال کر غور کرنا چاہیے۔ تہبند شرع کی رو سے یقیناً پاک ہوگا۔ لیکن حفظانِ صحت کے اصول سے میلا اور متعفن۔

چنانچہ وضو اس طور پر کیا جا رہا ہے کہ کچھ پانی کمپارٹمنٹ کے فرش پر گر رہا ہے اور کچھ غسلخانے میں۔ اور دونوں کا آمیزہ لباس اور جسم پر وضو بن گیا۔ تو اس فاتحانہ انداز سے

کھڑے ہوئے جیسے کوئی پرانے زمانے کا تھانے دار دفعہ ۴۴ کے ملزم کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ بھیگے ہوئے اعضا کو کپڑے سے خشک کرنے کے بجائے ہاتھوں سے پونچھ کر چھینٹے ہوا میں اڑا رہے ہیں۔ کوئی برا مانے یا معترض ہو تو اس طور پر بھپریں گے جیسے اسلام خطرے میں ہو اور صرف یہی ایک مسلمان، دجّال سے نپٹنے کے لیے بقید حیات ہوں۔ گاڑی کان پور پہنچی نماز کا وقت تھا، گاڑی سے اتر پڑے اور پلیٹ فارم پر نماز پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کو دیکھ کر کچھ اور مجاہد جھپٹے اور نماز باجماعت شروع ہوگئی۔ کوئی لیڈر نان کوآپریشن وغیرہ کے سلسلے میں گرفتار کیے گئے تھے۔ اور اسی ٹرین سے کہیں بھیجے جا رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر ایسا ہجوم اور شور و غوغا تھا کہ کسی کو اپنی عزت و عافیت خطرے سے خالی نظر نہیں آتی تھی سمجھ میں نہیں آتا اس وقت نماز باجماعت ادا نہ کرنے سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق تھا، میدانِ جنگ میں بھی نماز باجماعت ہوئی ہے اور ہونی چاہیے لیکن یہ کیسے مان لیں کہ اس وقت پلیٹ فارم پر باجماعت نماز ادا کرنا ضروری تھا اور اس طرح کی نماز ایسے مقام پر کیوں ضروری تھی جہاں ہر طرح کے لوگوں کا ہجوم ہو، ہلچل مچی ہوا اور عامتہ الناس کو جن میں مسلمان بھی شامل ہوں راحت اور آزادی کے ساتھ ضروری کاموں کے انجام دینے میں دشواری پیدا ہوتی ہو۔ اگر اس ہلڑ اور دوڑ دھوپ میں باجماعت نماز ادا کی جا سکتی ہے تو مسجد کے سامنے باجا بجنے اور جلوس کے گزرنے پر مسلمان نماز ادا کرنے سے کیسے قاصر رہتے ہیں!

اسی پیچ و تاب میں تھا اور ہر اناڑی ریفارمر ابتدا میں اس طرح کی منہ زوری سے کام لیتا اور بے ضرورت آمادۂ شہادت رہتا ہے کہ مرشد سے داد لینے کے لیے متوجہ ہوا، خادم ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے۔ آواز دی مرشد آگیا عین پلیٹ فارم پر وقتِ نماز، دیکھیے ایک ہی صف میں محمود و ایاز کھڑے ہیں۔ یہ وقت سونے کا ہے یا گورنمنٹ کو گالی دینے کا۔ مرشد نے آنکھیں کھول دیں سامنے سے ایک خوانچہ والا گزر رہا تھا اس سے دہی بڑے کی خیریت پوچھی۔ کون سا اسٹیشن ہے بڑی چہل پہل ہے۔ کوئی بڑا اسٹیشن ہوگا اس نے کہا کان پور ہے۔ فرمایا یہیں وہ کان پور والی مسجد ہے۔ میں نے پوچھا یہ خطرہ آپ کو کیسے گزرا۔ فرمایا کچھ نہیں پلیٹ فارم کے نمازیوں کو دیکھ کر خیال آیا۔ میں نے کہا مرشد کھانے اور سونے

دونوں سے نفرت۔ ذرا یہ تو بتایئے اس وقت پلیٹ فارم پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہنے لگے نمازی اور آپ دونوں نیک لوگ ہیں۔ نمازیوں کا تو یہ خیال ہے کہ جب تک نماز پڑھتے جائیں عقل کو کام میں لانے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو یہ مغالطہ کہ جب تک عقل ہے نماز پڑھنا چہ ضرور۔ آخر ہم اس شخص کے پیچھے ڈنڈا لیے کیوں پھریں جو ہمارے آپ کے خیالات سے متفق نہ ہو۔ ہر شخص جداگانہ طبیعت جداگانہ مذاق اور جداگانہ مقاصد رکھتا ہے آپ کا شمار نہ تو ائمہ معصومین میں ہے اور نہ حکومتِ برطانیہ سے کہ غلطی کا ارتکاب ممکن نہیں۔ بھلا مانس وہ ہے جو حتی الوسع لوگوں سے ہم آہنگ رہ سکے، زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے بہرہ مند ہوں اور کم سے کم لوگوں سے وہ خود نفع اٹھائے۔ مسلمان ہونے کا مفہوم یہ بھی ہے۔ میں نے کہا یہ باتیں تو غیر متعلق ہیں مجھے تو یہ بتایئے کہ اس وقت اس پلیٹ فارم پر نمازِ باجماعت کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے ایسے بزرگوں کو بھی دیکھا ہوگا جو اس تیور اور تجبر کے ساتھ آمادۂ نماز ہوتے ہیں جیسے وہ سارے مسلمان جو ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں گے دوزخی ہیں۔

خبط اور خطابت کا جو دورہ مجھ پر پڑا تھا اس کو جاری رکھتے ہوئے عرض کیا کہ مرشد یہ کچھ نماز ہی پر موقوف نہیں ہے بعض اصحاب روزہ بھی اسی ذہنیت کے ساتھ رکھتے ہیں ان کے روزہ رکھنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ کسی شریف آدمی سے ملنے کے لائق نہیں رہ جاتے، اور دوسرا شریف آدمی ان سے ملنا گوارا نہ کرے گا مثلاً آپ شکایت کریں کہ ملنے گیا معلوم ہوا آپ آرام فرما رہے ہیں فرمائیں گے کیا کروں روزہ ہے۔ آپ کہیں گے فلاں کام کا وعدہ کیا تھا اب تک پورا نہیں کیا فرمائیں گے روزہ ہے آپ نے خط کیوں نہیں بھیجا یا جواب ملے گا روزہ ہے اور کپڑے کیوں میلے ہیں روزہ ہے ہنستے کیوں نہیں روزہ ہے۔ انتقال فرمانے میں کیا قباحت ہے۔ تم جہنمی ہو

مرشد نے فرمایا روزہ کا ذکر ہو تا رہے گا کچھ اس کا بھی خیال ہے کہ اس کے ذکر و فکر سے معدے پر کیا اثر پڑتا ہے۔ کھانے پینے کا کچھ بندوبست کیجیے اس کے بعد روزے

پر زیادہ یکسوئی اور آسودگی سے گفتگو کی جائے گی کھانا نکالا گیا مرشد نے پہلا لقمہ فرو کیا اور پانی کا ایک پورا گلاس اس کے تعاقب میں روانہ کیا فرمایا آج کل فرائضِ مذہبیہ کا ادا کرنا لوگوں نے خدا پر احسان کرنے اور اس کے بندوں سے ناواجب نفع کمانے کا وسیلہ سمجھ لیا ہے. مثلاً روزے اس لیے نہیں رکھتے ہیں کہ شعارِ اسلام میں سے ہے اس قسم کی پابندی نفس کو بے راہ روی سے روکتی ہے اور اس کا اثر انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اچھا پڑتا ہے بلکہ اس طرح نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے خدا کے وہ تمام اختیارات ان کے ہاتھ میں آجاتے ہیں جن سے وہ اپنے بندوں کو جلاتا، مارتا یا عزت اور ذلت دیتا ہے. اس فرق کے ساتھ کہ خدا کی بخشنے کی طاقت اپنے لیے اور چھیننے کی دوسروں کے لیے استعمال کرتے ہیں انھوں نے عبادت کو گناہ سے بچنے کا نہیں بلکہ گناہ کی بازپرس سے بچنے کا وسیلہ سمجھ رکھا ہے مثلاً پانچ گناہ کیے پانچ وقت کی نماز پڑھ دی حساب کتاب برابر ہو گیا.

عرض کیا کیوں مرشد سوراج مل گیا تو آپ ریل میں سفر کرنے والوں کی بدعنوانی کا کیا علاج کریں گے فرمایا سوراج کچھ آپ کی مسلم یونیورسٹی تو ہے نہیں کہ قوم کی ساری ضرورتوں کے کفیل ہونے کا دعویٰ کرے میں نے عرض کیا سوراج ملنے پر ہم ہندوستانیوں کو سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا یا وہاں کے غسلخانے کے آداب برتنے نہ آئے تو حیف ہے آپ پر اور آپ کے سوراج پر فرمایا ہندوستانیوں کو سکنڈ کلاس نہیں بلکہ تھرڈ کلاس میں ٹھکانے سے سفر کرنا یا وہاں کے غسلخانے کے طور طریقے ملحوظ رکھنا آجائیں تو سوراج کی ضرورت باقی نہ رہے. آخر میں عرض کیا مرشد بات دراصل یہ ہے کہ ان انگریزوں کی وجہ سے ہم ہندوستانیوں کے لیے تقاضائے حاجت کا مسئلہ اختیاری نہیں بلکہ اضطراری بن گیا ہے. کلکٹر صاحب کا سامنا ہوتے ہی ہم پر پہلا جو ردِ عمل ہوتا ہے وہ ہم کو غسل خانے کے آداب ہی نہیں غسل خانے کے موقع اور مصرف ہی سے یکسر بے نیاز کر دیتا ہے.

پورب سے کاجل سا بادل اٹھتا گھٹتا جھومتا پھنکارتا بل کھاتا ہوا جیسے "فیلِ مست بے زنجیر" یا جیسے انگریزوں کا کوئی ڈریڈناٹ کہیں پیغام صلح لے جا رہا ہے. شام ہونے لگی تھی پانی

برسنے لگا۔ میں نے کہا مرشد ہندوستان کی برسات سے بھی زیادہ پرکیف منظر کہیں دیکھا ہے۔ کیسی گھٹا اٹھی ہے کس چم خم سے بجلی چمکتی ہے کیسی جانفزا ہوا ہے۔ کتنی اچھی بارش ہو رہی ہے۔ آپ تو بڑے جہانیان جہاں گشت ہیں۔ کچھ سنائیے۔ فرمایا:

بن بادل بجلی کہاں چمکی ......

مثلث

مرشد کا مقولہ ہے اور میرا تجربہ کہ اگر انسان کو بدترین دشمن کی تلاش ہو تو اس کو اپنے عزیزوں میں مل جائیں گے اور بہترین دوست کی ضرورت ہو تو غیروں کا جائزہ لینا چاہیے یعنی عزیزوں سے زیادہ دشمن اور غیروں سے زیادہ دوست نہیں ہوتے۔ اس پر ایک دوست نے فرمایا دوست اور دشمن دونوں کی بدترین مثال یونیورسٹی میں مل جائے گی۔

اس سال یونیورسٹی میں غیر معمولی تعطیل ہوئی یعنی غیر معمولی طور پر طویل، اور اس میں حصہ لینے کے لیے ہم آزاد ہی نہیں مجبور بھی ہیں تو سوچنا پڑا کہ آخر کیا کیا جائے چنانچہ مرشد سے رجوع کیا گیا فرمایا تعطیل گزارنے کی دو صورتیں ہیں یا تو۔

سیر کر دنیا کی غافل، نوجوانی، پھر کہاں

اور یہ صورت اس حال میں روا ہے جب صحت اچھی ہو اور روپے پاس نہ ہوں، دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیے عزیزوں کی مدد کیجیے، کسی کی روپے سے کسی کی کپڑے لتے سے ایک کی تیمارداری کیجیے دو چار کی تجہیز و تکفین اور پھر بیمار، مفلوک الحال مقروض اور مطعون ہو کر واپس آ جائیے۔ مشورے میں ایسے لوگ شامل تھے جو مرشد کے

باعث اوران کی بشارتوں کے ہمیشہ سے قابل تھے چنانچہ یہ طے پایا کہ اس بارے میں مرشد کی ہدایت کو تسلیم کرلیا جائے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کہاں اور کب چلا جائے۔

مرشد نے فرمایا، یورپ چلا جائے، راؤنڈ ٹیبل میں شرکت بھی ہو جائے گی اور میموں سے بھی جھجک نکل جائے گی۔ عرض کیا مرشد میموں سے جھجک کے کیا معنی۔ فرمایا بھی تھوڑی بہت یاد اللہ۔ مثلاً یہ کہ جب دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ساتھ ہو گا تو پھر وہ باتیں جو ہمارے بزرگوں کو ان کی بری معلوم ہوتی ہیں ہم کو بھلی معلوم ہونے لگیں گی۔ اپنے یہاں کی عورتوں کے علاوہ سارے جہان کی عورتوں کی توقیر ہماری نظروں میں بڑھ جائے گی اور ہم صحیح معنوں میں عورت اور آزادی کا اندازہ کرسکیں گے آپ جانتے ہیں ہمارے آپ کے بزرگوں کے ذہن میں کبھی یہ معمولی سی بات بھی نہیں آئی کہ ہندوستان کی آزادی درحقیقت عورتوں کی آزادی سے وابستہ ہے۔ جس دن عورت آزاد ہوئی ہم آپ بھی آزاد ہو جائیں گے اور بفرض محال ہم آزاد نہ بھی ہوئے تو مجلس بین الاقوام تو ہم کو آزاد ماننے پر مجبور ہی ہوگی۔ اور جس دن مجلس بین الاقوام نے ہم کو آزاد قرار دے دیا نہ نگار فتحپوری کی ضرورت ہوگی نہ سچ دریابادی کی، نہ طلاق ہے نہ تعدد ازدواج نہ سعدی نہ شفیع داؤدی۔

نہ ہر زن، زن است و نہ ہر مرد مرد !

ایک طرف سے آواز آئی۔

گئے تھے ہر بھجن بنیں گے کپاس !

میرے ایک دوست میر مجنو ہیں۔ جن کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ دولت میں راک فلر کے ہمسر اور شہرت میں مہاتما گاندھی کے لگ بھگ ہو جائیں۔ دریافت کیا کہ آخر آپ کو اس کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ پہلے تو بہت جز بز ہوئے لیکن جب میں معافی مانگنے پر آمادہ ہوا اور ان کو اندیشہ ہوا کہ میں اپنے سوال کو جہاں کا تہاں رہنے دوں گا تو فرمانے لگے تم سے کیا تکلف میں چاہتا ہوں کہ کوئی نہایت حسین نوجوان تندرست دولت مند اور نیک عورت مجھ سے عشق کرنے لگے۔ میں نے کہا جو صفات آپ عورت میں چاہتے ہیں وہ خدا نخواستہ مل گئیں تو اندیشہ ہے وہ سب سے پہلے تو خدا سے عشق کرے گی یا پھر مجھ سے۔

آپ کا تو کوسوں پتہ نہ ہوگا میر صاحب چراغ پا ہو گئے فرمایا تم کافر بھی ہو اور جھوٹے بھی آخر تم پر وہ کیوں اور کیسے مائل ہوگی میں نے کہا صاحب سنو مجھ پر تو وہ یوں مائل ہوگی کہ اس میں جتنے صفات ہوں گے اس کے برعکس مجھ میں عیوب ہیں اور آپ جانتے ہیں عورت مرد کے محاسن سے زیادہ اس کے معاصی کی پرستار ہوتی ہے۔ آپ خود ان لوگوں میں ہیں جن کو نہ اپنے محاسن کا احساس نہ معاصی کا علم۔ آپ کا دشمن ہوتا آپ کے بارہ میں حکم لگاتا۔ نہ رزق نہ موت!

میر منجھو ان لوگوں میں تھے جن کی شادی والدین کرتے ہیں، اور عقدِ ثانی دوست احباب۔ کسی زمانے میں ان کی شادی ضرور ہوئی تھی، کیونکہ ان کا مخصوص برزخ اس پر گواہ تھا۔ لیکن والدین کے ساتھ ساتھ بیوی نے بھی مفارقت کی۔ میر منجھو نے ہوش سنبھالا تو جوانی اور دولت دونوں ختم ہو چکی تھیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہی وہ زمانہ ہوتا ہے کہ جب انسان میں کارینگی اور انٹولی بننے کی استعداد نہیں صرف آرزو رہ جاتی ہے اور ظاہر ہے اس حالت پہ پہنچ کر انسان کیا کچھ نہیں ہو جاتا۔ جیل خانہ جانے سے زیادہ نائٹ بننا پسند کرتا ہے۔

میر صاحب بوڑھے ہو گئے تھے لیکن بڑھاپا ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ داڑھی مونچھ دونوں صاف۔ نماز روزے سے مستثنیٰ۔ عورتوں سے مایوس شادی سے گریز۔ سحر کے وقت تک جاگتے اور چاشت تک سوتے۔ ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے اور بڑی سے بڑی مسرت پر متبسم نہ ہوتے۔ تندرست تھے لیکن شکل سے بالکل ہندوستانی دواخانہ۔ ایک سبب یہ بھی تھا جس سے عورتیں اور لڑکے ان سے بھاگتے اور دوست احباب ان کے گرد رہتے تھے۔

آج تک کسی کو نہ معلوم ہوگا کہ میر منجھو کا مبلغ علم کیا ہے، نہ کوئی شخص یہ پتہ لگا سکا کہ ان کو کیا نہیں آتا کہ ایک دن ایک مریض کے زخم کی پٹی دیکھ کر غش کھا گئے لیکن میں اس دن بھی موجود تھا جب میر صاحب کی داہنی بغل کی چار گلٹیاں نشتر سے نکالی گئیں اور میر صاحب اس دوران میں بائیں ہاتھ سے چار سگریٹ پی گئے۔

میر صاحب سنی اور شیعی دونوں ہیں اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ کس موقع پر کیا کر بیٹھیں گے۔ میر صاحب کو اس کا کبھی یقین نہیں آئے گا کہ کل پورب سے سورج نکلے گا یا نہیں۔ لیکن

اگر آپ یہ کہنے لگیں کہ شاید سورج نہ نکلے تو پھر کہیں گے کہ سورج ضرور نکلے گا آپ کیسی ہی معقول اور مدلل بات کیوں نہ کہیں وہ اس کی مخالفت ضرور کریں گے۔ یہ بھی ممکن ہے آپ نامعقول یا کھُسر پھُسی بات پیش کریں اور میر صاحب اس کے معقول ہونے کی قسم کھالیں۔

یورپ جانے کی تیاری ہورہی تھی۔ میں نے کہا مرشد دو چیزوں کی ہمیشہ تمنا رہی ایک داڑھی رکھنے کی دوسرے یورپ جانے کی۔ داڑھی کی تو اب تک توفیق نہیں ہوئی۔ آپ کے ہوتے اگر یورپ جانا بھی نصیب نہ ہوا تو میری بیوی بچے آپ کو کیا کہیں گے۔ میر مجھو بولے یورپ جانے والوں کا یہ منہ نہیں ہوتا۔ میں نے کہا مرشد نے سالہا سال کس منہ سے یورپ میں بسر کی ہے۔ مرشد نے فرمایا کبھی یورپ میں ہر قسم کا منہ، چالو ہے بشرطیکہ منہ میں زبان کے بجائے پیسے ہوں۔ میں نے کہا مرشد پیسے ہوتے تو آم کیوں نہ کھاتے۔ آم کا سننا تھا کہ مرشد یک لخت کھڑے ہوگئے۔ فرمایا چلو۔۔۔ چلیں۔ سبحان اللہ آم تو علاج الغربا، کا بہترین نسخہ ہے۔ مقوی، مشتہی، مسکن، محرک اور بہت سے دوسرے خواص نرینہ، جن سے ہندوستانی دواخانہ کی فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ عرض کیا مرشد یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک ہی چیز مسکن بھی ہو اور محرک بھی۔ فرمایا جب تم نفسیات طب سے واقف نہیں ہو تو پھر ہر بات میں قابلیت کیوں جتاتے ہو۔ اتنا تو جانتے ہو کہ جرم کا مدار نیت پر ہے، اس لیے تسکین اور تحریک کا مدار محض نیت پر ہے جو آم کے استعمال کی محرک ہوئی۔ میں نے کہا بعض جرائم ایسے بھی تو ہیں جن میں نیت کا مدار جرم پر ہوتا ہے یا جہاں جرم موجود ہوتا ہی اور نیت کا پتہ نہیں ہوتا۔ فرمایا وہ کیا، کہا مثلاً نان کوآپریشن۔ کہنے لگے دیکھو ذاتیات کو معرض بحث میں لاتے ہو اور یہ علی گڑھ والوں کا عام شیوہ ہے۔ میں نے کہا علی گڑھ کا ہونے کی کمزوری تو بجھ میں آپ میں برابر ہے کہ میر مجھو نے سر کہ جبیں ہو کر فرمایا، فرق صرف یہ ہے کہ آپ نے علی گڑھ کو چار چاند لگا ہیں اور ذاکر صاحب سے علی گڑھ کو کلنک کا ٹیکہ لگا ہے۔ میں نے کہا میر صاحب آپ کے خوشامدی ہونے کا ثبوت مل گیا لیکن مرشد کو ذاکر صاحب کہنے سے کیا مطلب ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں آپ کا عقیدہ بھی وہی ہو جس کی بنا پر محمد علی جناح، مہاتما گاندھی کو مسٹر گاندھی کہتے ہیں۔

مرشد نے فرمایا، نان کوآپریشن نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ میں نے کہا مرشد نان کوآپریشن

جب مولانا شوکت علی کا کچھ نہ بگاڑ سکا تو میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ میر منجھو نے کہا تم دونوں میں بننے کی کب صلاحیت تھی کہ کچھ بگڑتا۔ میں نے کہا جناب میں، مرشد، جملہ اراکین اسمبلی، امیر فیصل اور میر منجھو مسلمان ہیں، جن کی نجاتِ اخروی کا ذمہ دار خدا اور نجاتِ دنیوی کی حکومت برطانیہ ہے اس کے بعد رہ کیا جاتا ہے۔ نان کوآپریشن کا ورد سر دہ خریدے جس پر اُن کا ایمان نہ ہو۔ مرشد اس پر کچھ ایسے نعل در آتش ہوئے کہ قریب تھا کوئی نہایت غیر ذمہ دار فقرہ زبان پر لاتے اُتنے میں آم والے نے صدا دی۔ مرشد کا چہرہ اصغر صاحب کا مصرع بن گیا

شعاعیں (صدائیں) کیا پڑیں رنگت نکھر آئی گلستاں کی

آم والے کو آواز دی۔ اس نے خوانچہ سامنے رکھ دیا۔ مرشد نے آموں کی اقسام اور ان کی تعریف شروع کر دی۔ ٹوکرے میں اتنے آم یا اس کے اقسام نہ تھے جتنے مرشد کی زبان پر توصیفی الفاظ۔ عرض کیا مرشد مسئلہ آم اور اقسام کا نہیں ہے بلکہ آم ودام کا ہے۔ فرمایا انسانیت سے کیوں گزرے جاتے ہیں۔ میں نے کہا آخر یہ کس صحیفۂ اخلاق کی تعلیم ہے کہ آم کے سلسلے میں آپ کسی کی انسانیت کو معرضِ بحث میں لائیں فرمایا آم اور انسانیت کا جب کبھی مقابلہ کریں گے اول الذکر کو بہتر و برتر پائیں گے مثلاً آم سے کمزوروں میں اور انسانیت سے حریفوں میں طاقت پیدا ہوتی ہے۔ آم سے آپ سرخ و سفید ہوں گے۔ انسانیت سے آپ کے دشمن آم کھاتے رہیے اولاد پیدا کرتے رہیے انسانیت دکھایئے تو بیوی اور برطانیہ دونوں شیر۔ اتنے میں ایک دوست بول اٹھے آم کھانے سے گرمی دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔ میر منجھو نے بھی سر ہلاتے ہوئے اس کی بہم سی تصدیق کی۔ مرشد نے بشارتاً فرمایا اس پر دودھ استعمال کیجیے تو گرمی قائم رہے گی اور دانے پیدا نہ ہوں گے۔ یہ بشارت کچھ ایسی تھی کہ آم والا دام لیے بغیر چل دیا۔ مجھ پر وجد کا عالم طاری ہوا۔ مرشد اسی وقت کے منتظر اور آم خائف تھے۔ چنانچہ کھاتا آتے آتے تمام آم ناگفتہ بہ ہو گئے۔

کئی دن تک مرشد دعوتیں اور میر منجھو غم کھاتے رہے ایک دن پھر جلسۂ مشاورت ہوا، طے پایا کہ میر منجھو کوئی پروگرام پیش کریں میر صاحب کبھی فیصلہ کن بات پیش نہیں کریں گے۔

بعضوں کا خیال ہے کہ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے۔ لیکن کوئی دوسرا پیش کرے تو اس کی مخالفت شروع کر دیں گے۔ میر صاحب صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا کرتے ہیں اور وہ بھی اس طور پر گویا ان کو اس کا یقین نہیں ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ میر صاحب مسئلہ کی اتنی مخالفت نہیں کرتے جتنی مسئلہ پیش کرنے والے کی۔ مثلاً کوئی شخص کہے۔ موسم نہایت عمدہ ہے، میر صاحب بول اٹھیں گے آپ احمق ہیں۔ کوئی ڈرتے ڈرتے یہ دریافت کرے کہ میر صاحب آپ عقدِ ثانی پر مجبور کیے جائیں تو کس قسم کی بیوی پسند فرمائیں گے۔ چھوٹتے ہی فرمائیں گے "آلو"۔ لیکن میر صاحب کوئی قطعی بات پیش بھی کر دیں گے تو جلد ہی اس کے نقائص یا خطرات بھی بیان کرنے لگیں گے۔ مثلاً ارشاد ہو گا کہ یہ وقت شکار کے لیے موزوں ہے اور لوگوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا۔ معاً دوسری آواز آئے گی لیکن دیکھو ممکن ہے دھوپ تیز ہو جائے موٹر میں آگ لگ جائے۔ چلتے چلتے وصال ہو جائے بندوق موجود نہ ہو۔ ناشتہ تیار نہ ہو سکے۔ شکار نہ ملے۔ ورنہ پھر کہو گے میں نے تجویز پیش کی تھی۔ اس پر بھی لوگ تیغ و کفن باندھ کر تیار ہو گئے۔ تو فرمائیں گے۔ سورج نکلنے پر روانگی ہو گی اور سورج غروب ہونے سے پہلے واپسی، شکار کس قسم کا ہو گا۔ چرند۔ پرند۔ درند یا کیا؟ جائے ورود سے شکار کتنے فاصلہ پر ہو گا۔ کن کن لوگوں کی بیویاں چلیں گی اور کن کن کے بچے اور کون لوگ گھر رہ جائیں گے؟ اگر ان تمام امور کا جواب خاطر خواہ ہوا تو پھر میر صاحب آمادہ ہوئے لیکن روانہ ہوتے ہوتے سفر کے دوران' سفر کے اختتام پر کہتے یہی رہیں گے کہ شکار نہ ملے گا اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ نہیں ملتا اور آخر ملے بھی کیوں میر صاحب چاہتے ہیں کہ ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا پڑے نہ شکار کو اپنے پاؤں سے چلنے کی توفیق ہو۔ آرزو یہ ہوتی ہے کہ شکار کے دولت خانے پر چلے جائیں مل جائے تو فبہا ورنہ کارڈ چھوڑ آئیں شکار کی اخلاقی پابندی ہے کہ وہ بازدید کے لیے میر صاحب کے آستانہ پر حاضر ہو۔

ایک دن ہم سب نے

نکل گھر سے بس راہ شملہ کی لی

راستے میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مرشد دہلی اتر پڑے۔ میر تھوا اسٹیشن پر ٹھہر گئے

اور میں مکان واپس آگیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ سب کے روپے میر صاحب کے پاس تھے جسے وہ گھر بھول آئے تھے، لیکن تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ روپے صرف ان کے تھے اور بقیوں کے وعدے، غلطی سے وعدے ساتھ چلے آئے اور روپے گھر رہ گئے۔ یہ مسئلہ پھر مرشد کے سامنے آیا۔ موصوف نے فرمایا کہ روپے کا انتظام شملہ پہنچ کر کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اصغر صاحب نے دریافت فرمایا وہاں پہنچ کر آخر کیا سبیل ہوگی۔ مرشد نے فرمایا کہ اس وقت شملہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ راؤنڈ ٹیبل میں کس قسم کے ممبران بھیجے جائیں۔ دقت یہ تھی کہ امیدواروں کے زمرے میں ایک جماعت کے پاس روپے کی افراط تھی اور ارکین کی کمی۔ دوسری مفلس تھی لیکن تعداد میں بالکل کسان سبھا۔ حکومت کے پاس صرف روپے تھے۔ مرشد نے فرمایا اگر ایسی حالت میں ہم شملہ پہنچ جائیں تو حکومت کا نام اور ہمارا کام ہو جائے گا۔

میں نے دریافت کیا یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن شملہ پہنچیں گے کیوں کر۔ طے پایا کہ مرشد ایک دفعہ ہندوستانی دواخانہ ہو آئیں۔ اصغر صاحب ریفریشمنٹ روم، میر مجھو جگادھری انبالہ میں مکان۔ ہم لوگ اپنے اپنے مشن پر روانہ ہوئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میر مجھو نے ہمارا خون ہدیہ کر دیا ہے!

میر مجھو اور مرشد سے نجات پا کر علی گڑھ واپس آیا۔ معلوم ہوا کہ عزیزوں میں ایک صاحب کی شادی ہونے والی ہے۔ دوسرے صاحب سفرِ آخرت کر گئے۔ تیسرے ایسا کرنے والے ہیں۔ چوتھے خود ہمارے یہاں تشریف لانے والے ہیں۔ یہ خبر ایسی فیصلہ کن تھی کہ فی الفور بیوی بچوں کو محفوظ مقام پر بھیج دیا گیا اور میں نینی تال کے لیے روانہ ہو گیا۔

ایک دفعہ ایک کتے سے کچھ اختلافِ آرا ہوا تھا، اس لیے کسولی جانا پڑا تھا، ورنہ اب تک کسی پہاڑ کو مجھ سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ایک عرصے سے ڈاکٹر اصغر صاحب سے ناخوش تھا سبب یہ تھا کہ انھوں نے میرے ساتھ کشمیر چلنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آخر وقت میں جانے کا خیال ترک کر دیا اس سلسلہ میں بہت کچھ زیربار ہونا پڑا تھا۔ چنانچہ عہد کر لیا تھا کہ جہاں تک سیر و سفر کا تعلق ہے ان سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ انھوں نے بہت کچھ عذر و معذرت بھی کی، لیکن میں قطعاً بیزار رہا۔ لیکن بعض مستند راویوں کا خیال ہے کہ جو قصور میں اصغر صاحب

کے سر تھوپ رہا ہوں وہ ان کا نہیں میرا تھا در اصل میں نے کشمیر چلنے کا وعدہ کیا تھا اور آخر وقت میں میں نے سفر سے انکار کر دیا۔ اور وہ مجھ سے بیزار تھے اور عزم کر چکے تھے کہ اب سے میرے قول و فعل کا کبھی اعتبار نہ کریں گے۔ بہت کچھ معافی مانگی لیکن انھوں نے اعتنا نہیں کی۔ بہرحال اوّل تو میری عادت ردّ و قدح کرنے کی نہیں ہے، دوسرے یہ کہ اب میرے اور ان کے تعلقات نئے سرے سے شگفتہ ہوئے ہیں، اس لیے اس مسئلہ کو موضوعِ بحث میں نہیں لانا چاہتا۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب میں اور وہ نینی تال کو اپنا ممنونِ کرم بنانے کے لیے روانہ ہوئے تو تعلقات کچھ یوں ہی سے تھے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میرا اصولِ سفر یہ ہے کہ میں اور میرا ہمسفر پہلے یہ طے کرلے گا کہ کون سینیر ہوگا اور کون جونیر۔ سینیر اور جونیر کے فرائض یہ ہیں کہ صرف ریل کا کرایہ اپنے اپنے پاس سے ادا کریں۔ اس کے بعد موٹر تانگے کا کرایہ۔ قلی کی مزدوری۔ کھانے کی قیمت، قیام، طعام اور راستے کے تمام اخراجات سینیر کے ذمہ، ناشتہ دے چلنے کا ذمہ دار بھی سینیر ہے۔ جہاں جا رہے ہو وہاں جونیر کو روپیوں کی ضرورت ہو تو سینیر کا فرض ہے کہ وہ بطور قرض ادا کرے، جہاں تک اس قسم کے قرض کا تعلق ہے جونیر کا فرض ہے کہ وہ اپنی سہولت کو مدِ نظر رکھ کر بالاقساط ادا کرے، لیکن ہمیشہ ہر مجمع میں اس کا اقرار کرے کہ اس نے قرض لیا تھا۔ اس کے علاوہ جونیر کا فرض یہ ہے کہ وہ اسباب وغیرہ کا نگراں رہے۔ سینیر کے لیے ریل پر ہر قسم کی سہولت فراہم کرے۔ مثلاً پانی یا ضرورت کی چیزیں اسٹیشن پر سے لایا کرے۔ قلی اور تانگے والے سے لڑائی مول لے۔ ٹکٹ کلکٹر سے انگریزی بولے نئے مسافروں کو اندر نہ آنے دے اور سینیر کو باہر نہ جانے دے۔ ناشتہ دسترخوان پر چن دے پھر ساری چیزوں اور برتن کو سمیٹ لے مختصر یہ کہ ہر قسم کے متوقع یا غیر متوقع اخراجات کا سینیر اور جونیر بننے یا بنائے جانے کا مسئلہ بھی پیش ہوا، اصغر صاحب نے سرے سے انکار کر دیا کہ نہ کوئی جونیر ہے اور نہ سینیر ہر شخص ہمسفر اور سب نے بہت کچھ سمجھایا کہ بغیر اس کے کام نہ چلے گا لیکن کسی کی ایک پیش نہ گئی۔ شام کے پانچ بجے روانگی کا وقت تھا لیکن سامان وغیرہ درست نہ ہو سکا۔ رات کے دس بجے تک یہی عالم رہا۔ بالآخر یہ طے پایا کہ علی گڑھ سے کاٹھ گودام تک میں جونیر اور اصغر صاحب

سنیئر اور کاٹھ گودام سے نینی تال تک میں سینیئر اور اصغر صاحب جونیئر. بارہ بجے رات کو روانہ ہوئے صبح بریلی پہنچے اور ۹،۱۰ تک کاٹھ گودام تمام راستے کے اخراجات کے اصغر صاحب کفیل اور خدمات کا میں متحمل رہا. کاٹھ گودام پہنچے تو ترشح ہو رہا تھا. میں نے کہا چھتری نکال کر مجھے لگائیے فرمایا یہ تم کو خود کرنا پڑے گا. میں نے کہا آخر کیوں؟ کہنے لگے یوں ہی میں نے کہا اچھا کھانا اتار کر جنگلے میں کھانا شروع کروں اور آپ لپک کر کوئی موٹر ٹھہرا لیجئے اور اسباب بار کرائیے. کہنے لگے موٹر میں ٹھہرا لوں گا لیکن کھانا نینی تال پہنچ کر کھایا جائے گا. ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا وہیں سے دیکھتا رہا. تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ سارے موٹر والے، قلی، مسافر اور تماشائی اصغر صاحب کے گرد جمع ہیں. تھوڑی دیر تک اور یہی حالت رہتی تو پولیس کے چند سپاہیوں کا اور اضافہ ہو جاتا. چنانچہ مجھ کو بھی جانا پڑا. میں نے اصغر صاحب کو الگ لے جاکر دریافت کیا کہ اب آپ جونیئری سے فوراً مستعفی ہو جائیے ورنہ نینی تال اور علی گڑھ دونوں ہاتھ سے جاتے ہیں کچھ دیر تک ردّ و قدح ہوتی رہی، لیکن بعد میں معاملات طے ہو گئے اور میں جونیئر کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔

کاٹھ گودام سے نینی تال تک کا سفر بھی کس درجہ روح پرور تھا. بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نیاز فتحپوری کی جنت سے مولانا ماجد کی جنّت کو منتقل ہو رہا ہوں تو اس جنت کے اس تصوّر کو اس وقت دھچکا لگتا جب ہوا زیادہ سرد ہونے لگی، یا سامنے سے یک لخت کوئی موٹر آجاتی. جنّت اور دوزخ کے معاملہ میں ان دونوں بزرگوں میں جو "مزاح المومنین" ہوا ہے اس پر ایک دفعہ مرشد سے بھی درخواست کی تھی کہ اس معاملہ میں رہبری فرمائیں، ارشاد ہوا تھا، یادہ گوئی پر یادہ گو کی زبان کھینچ لینی چاہیے لیکن اگر کوئی شخص یادہ گوئی کا حق چھیننا چاہے تو اس کا سر قلم کر دینا لازم ہے. میں نے کہا مرشد معاف فرمائیے. یہ آپ کیا جبر تعقیل پیش کر رہے ہیں. میں اس طرح کی باتوں کو نہ سوچ سکتا ہوں نہ کہہ سکتا ہوں. فرمایا جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے لیکن اس وقت بھوک لگ رہی ہے. چنانچہ مدارات معدہ کے بعد مرشد چارپائی پر اس طور سے لیٹ گئے کہ ہاتھ اور پاؤں کے انگوٹھے سے اس کے چار پایوں کو چھونے لگے

عرض کیا مرشد یہ کس قسم کا لیٹنا ہے فرمایا کھانے کے بعد یہ ایک طرح کا قیلولہ ہے جس سے غذا کے مقاصد جلد سے جلد پورے ہو جاتے ہیں۔

کچھ دیر ہندو مسلم نفرت و نفاق کا ذکر چلا، پوچھا مرشد اس بارے میں کیا حکم ہے۔ فرمایا رسہ کشی ہو رہی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ دور رہو۔ لیکن دل نہ مانے تو ایک تیز چھرا کہیں سے لاؤ۔ میں نے کہا مرشد اتنی ہمت نہیں ہے کہ چھرے کا نام سن کر اس سے کام لے سکوں فرمایا ایک حالت تو یہ ہوتی ہے کہ لاٹھی نہ ٹوٹے اور سانپ مر جائے۔ دوسری یہ کہ لاٹھی ٹوٹ جائے اور سانپ نہ مرے۔ تیسری یہ کہ دونوں پر آفت آئے۔ اور چوتھی یہ کہ کسی پر نہ آفت آئے۔ میں اچھل پڑا۔ مرشد مرحبا، بس آخری ترکیب ٹھیک ہے۔ فرمایا اچھا اس وقت دونوں انتہائی جوش اور شدت کے ساتھ رسا کھینچ رہے ہیں۔ تم بیچ میں کھڑے ہو جاؤ۔ جب دونوں پورے طور پر آنکھیں کھولے اور دانت نکالے ہوئے ہوں رسے پر بھرپور ایک ہاتھ چھرے کا مار دینا!

لاحول ولا قوۃ کہاں سے کہاں جا پڑا۔ ہم موٹر پر اس تیزی کے ساتھ بلندی کی طرف بڑھ رہے، جیسے کسی مہاجن کا سودی قرض۔ سیاہ چکنی چمکتی پر پیچ و پر خم سڑک جیسے پیکر کوہ کسی کالے ناگ کے فشار آغوش میں ہو راستہ خشک اور خنک، منظر حسن و شباب کا تصور اور تصویر، سردی بڑھتی جاتی تھی۔ نشیب سے کہر اور ابر کی فضائیں بلند ہونی شروع ہوئیں، دیکھتے دیکھتے سارا ماحول ایک نمناک دھندلکے میں تبدیل ہو گیا۔ کبھی خیال آتا کہ شاید زندگی کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے۔ کبھی معلوم ہوتا کہ زندگی کی انتہا ایسی ہی ہو گی۔ بایں ہمہ یہ خیال بھی نہ گیا کہ یہ سب صحیح ہو یا نہ ہو، گرم کپڑوں کی ضرورت مسلم ہے۔

ہم دونوں نینی تال پہنچے۔ ڈاکٹر عباد الرحمن خاں صاحب موٹر اسٹینڈ پر پہلے سے موجود تھے ان کی آنکھیں بھی اچھی ہیں اور قسمت بھی۔ وہ یونیورسٹی میں بھی ہیں اور ہم کو قرض بھی دے دیتے ہیں۔ ابھی جھیل کے کنارے نہیں پہنچے تھے کہ ایک سمت ایک نئی عمارت نامکمل حالت میں نظر آئی۔ اصغر صاحب کو بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر خان نے کہا یہ عمارت فروخت ہونے والی ہے اصغر صاحب نے بے اختیار ہو کر قیمت دریافت فرمائی تو معلوم ہوا کہ کم و بیش ایک لاکھ پر معاملہ

ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں کو کچھ کام تھا اس لیے وہ راستے ہی سے ہم لوگوں سے معافی مانگ کر رخصت ہو گئے۔ ڈاکٹر اصغر صاحب کو یہ بات آدابِ میزبانی کی منافی نظر آئی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ گھر پر پہلے سے پہنچ کر مہمانوں کی تعداد یا کھانوں کی اقسام پر بعض ایسے لوگوں سے عرض معروض کرنے چلے گئے تھے جن کے مزاج وطبیعت سے وہ ہم لوگوں سے یقیناً زیادہ واقف تھے لیکن تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ وہ راستے بھر ہمارے ساتھ رہے اور ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ محض لطفِ داستاں کے لیے تھا۔

ہم ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچے۔ یہ ایک عام دستور چلا آتا ہے کہ جب کسی کے ہاں مہمان کی حیثیت سے جایا جائے اور یہ یقین ہو کہ ہم کو نہیں صرف میزبان کو ہر قسم کے اخراجات کی زیر باری نصیب ہوگی تو اپنے آپ کو مطبوع ومقبول بنانے کے لیے ہر قسم کی کوشش کرنا لازم ہے۔ ہم دونوں کو اس کا علم تھا۔ لیکن ایک دوسرے سے چھپانا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں تو اسباب وغیرہ سے الجھا ہوا تھا۔ اصغر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے چھوٹے بچّہ کو اس طور پر چمکارنا اور کھلانا شروع کیا کہ میں باوجود ایک پیشہ ور "والدین" ہونے کے تھوڑی دیر کے لیے حیران رہ گیا اور معاً خیال آیا کہ جھیل میں کود پڑوں۔ لیکن جھیل دور تھی اور بچّے کے نانا قریب۔ چنانچہ زقند بھر کر ان کے پاس پہنچا اور ایک ایسا تعظیمی آداب بجا لا کر دست بستہ کھڑا ہو گیا کہ تھوڑی دیر کے لیے دونوں ڈاکٹر مبہوت ہو گئے۔ نانا سے بغل گیر ہو کر نواسے سے بآوازِ بلند یوں مخاطب ہوا۔ بیٹے اپنی والدہ سے میرا اور میری بیوی کا اور میرے بچوں کا سلام کہنا اور یہ بھی کہہ دینا کہ آپ کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی ہے۔ ہم لوگوں کی اس مقاومت ومسابقت کا کیا انجام ہوا، اس کا اندازہ ہم کو سوا اس کے اور کچھ نہیں ہو سکا ہے کہ اصغر صاحب مجھ سے کچھ زیادہ الجھنے لگے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کا خاندان میرا مداح ہے۔

ڈاکٹر اصغر، ڈاکٹر خان اور میں ایک ہی کمرے میں مقیم ہوئے۔ شیر وشکر جائے کی مانند۔ مجھ سے ڈاکٹر اصغر سے صلح ہو گئی تھی کچھ اس قسم کی صلح جو تیاری جنگ کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں اور ڈاکٹر اصغر اپنی اپنی چارپائیوں پر دراز ہو گئے، اور جب ڈاکٹر خان کو اطمینان

ہوگیا کہ ہم دونوں کچھ عافیت سے رہیں گے یا انھیں رہنے دیں گے تو چپکے سے اٹھ کر کہیں اور محلِ عافیت ہونے کے لیے چل دیے۔ شام کے وقت اٹھے تو معلوم ہوا کہ بارش اور چاء دونوں موجود ہیں۔ چائے سے فراغت ہوئی تو سردی تاش اور گل غپ شروع ہوئی سب سے پہلے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ بازی کیا ہوگی؛ میں اصولاً بازی لگانے کے موافق ہوں اور عملاً مخالف۔ ڈاکٹر اصغر اصولاً اور عملاً دونوں طرح اس کے مؤید تھے۔ ڈاکٹر خان دونوں کے مخالف۔ چوتھے صاحب بازی لگانے کے موافق اور روپے لگانے کے مخالف۔ کھیل ہوتا رہا۔ بحث جاری رہی نتیجہ یہ ہوا کہ بحث پر سردی، سردی پر بھوک اور بھوک پر نیند غالب آئی۔ آج کا پورا دن اسی طور پر گزرا۔ شب میں بارش تیز ہوئی، صبح اصغر صاحب کو زکام اور ڈاکٹر خان کو حرارت اور مجھ کو فرحت معلوم ہونے لگی۔

اصغر صاحب صبح کو غسل کرنے کے عادی ہیں اور میں سردیوں میں اس چیز کو غیر ضروری ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی سمجھتا ہوں۔ اصغر صاحب ہر صبح کو نہانے کے دلدادہ ہیں میں کم سے کم تیسرے دن اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں۔ پہلی ہی صبح کو اصغر صاحب نے مجھ سے بڑے فیصلہ کن لہجے میں فرمایا کہ تم کو نہانا بھی ہوگا اور خط بنانا بھی ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔ علی گڑھ نباشد۔ نینی تال ہے۔ میں نے کہا دیکھیے اصول کے ماتحت بحث ہونی چاہیے میں بغیر ضرورت کسی کام کا کرنا حماقت سمجھتا ہوں۔ غسل کیوں کروں اور آپ کو کیوں کرنے دوں۔ غسل صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ جسم کی کثافت دور ہو یا تندرستی میں ترقی ہو۔ یعنی ضرورتاً یا تفریحاً۔ ماشاءاللہ مجھے اپنی طہارت اور پاکیزگی میں کوئی خلل نظر نہیں آتا۔ اور نہ محسوس ہوتا ہے۔ رہا تندرستی کا سوال، وہ بھی اس درجہ ہے کہ اس سے ترقی کرنا ممکن ہے نینی تال یا علی گڑھ کی رسوائی کا باعث ہو۔ خط بنانے کا اصول البتہ کچھ سمجھ میں آتا ہے یعنی خط بڑھا ہو یا نمایاں ہو تو عورتیں عاشق ہونا یا ان کے اعزا و احباب چائے پلانا بند کر دیں گے۔ عورتوں کی طرف سے مجھے اطمینان ہے جہاں تک میرا سوال ہے ان کو کبھی مجھ سے عشق کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ داڑھی جزو مناکحت قرار دی گئی ہے نہ وجہ طلاق۔ میں نے تو مرشد سے یہاں تک سنا ہے کہ داڑھی عورتوں کو پسند ہے!

یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ختنہ ہونا ایک معاشرتی فعل ہے۔ اس پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن غسل کرنا تو قطعاً ذاتی فعل ہے۔ اس معاملہ میں میں مولویوں کا اصول زیادہ بہتر سمجھتا ہوں یعنی صرف شرعاً طاہر ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں اس کا حتی الوسع لحاظ رکھتا ہوں۔ آپ حفظانِ صحت کے اصول کے پرستار ہیں اور میں شریعت کا پابند۔ مولوی کی تہبند اور مسٹر کی پتلون کا نظری جائزہ لیا جائے تو یقیناً تہبند کو نیچا دیکھنا پڑے گا لیکن خوردبین سے معائنہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ دیوبند اور نینی تال میں کیا فرق ہے۔ اگر آپ کو اس سے اختلاف ہے تو ڈاکٹر خان سے رجوع کیجیے۔ وہ قسمت میں مجھ سے بہتر ہیں، عقل میں آپ سے اور شکل و صورت میں مجھ سے آپ سے دونوں سے بہتر یہ کہ گورنمنٹ آدمی ہیں جب تک خود ان کا معاملہ درمیان نہ ہو، ہمیشہ انصاف سے کام لیں گے۔

چنانچہ مسئلہ پیش ہوا اور جیسا کہ ایسے معاملات میں گورنمنٹ کا رویہ رہتا ہے یعنی فریقین موجود ہوں تو کمزور کو گھڑکی اور قوی کو تھپکی اور ان میں سے ایک موجود ہو تو حاضر کو تھپکی اور غائب کو صلواتیں اور دونوں غائب ہوں تو دونوں کو احمق سمجھتی ہے۔ ڈاکٹر خان نے بھی اسی طریقۂ کار کو اختیار کیا اس ترمیم کے ساتھ، یعنی دونوں موجود تھے اور دونوں احمق قرار دیے گئے۔

جب سے نینی تال پہنچے تھے۔ بارش کا سلسلہ برابر قائم تھا۔ اکثر یہ ہوا کہ کئی کئی دن مکان سے باہر نہ نکل سکے۔ اس لیے برآمدہ یا کمرہ ہی میں بیٹھے ڈاکٹر خان کے ماحضر پر اکتفا کرتے رہے، اچھا مکان، اچھا کھانا، اچھا میزبان، اچھا موسم، کوئی کام نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے اور اصغر صاحب کے درمیان کشاکش شروع ہو گئی بات یہ تھی کہ ایک دن موسم کسی قدر اعتدال پر نظر آیا۔ ڈاکٹر صاحب کو نباتات کے بعض نوادر جمع کرنے تھے اور ڈاکٹر خان کو حجری نمونے۔ مجھ سے فرمایا تم بھی چلو۔ عرض کیا کہ مجھ کو جہاں کا تہاں چھوڑ دیجیے جس نمونے کی مجھے تلاش ہے، وہ جھیل کے کنارے ہی مل جاتا ہے، دونوں نے کہا کہ ساتھ چلے چلو تم بھی اپنی تلاش میں کامیاب ہو جاؤ گے اور یقیناً نہایت سستے داموں، غرض سب لوگ چلنے پر آمادہ ہوئے۔ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ موسم کا تیور بدلا۔ اصغر صاحب کو یہ شکایت کہ میں نے چلنے میں دیر کی مجھ

کو اس پر کوفت کہ اصغر صاحب نے ہمت چھوڑ دی۔ بہر حال ہم سب مکان کی سمت روانہ ہوئے اور راستے بھر ایک دوسرے کو اس قدر نیک و بد سمجھاتے رہے کہ کوئی دور سے دیکھتا تو خیال کرتا کہ بعض بدمذاق برج کھیل کر واپس آرہے ہیں، اور اب تک یہ سمجھ رہے ہیں کہ کھیل ہی رہے ہیں۔

مکان واپس آئے تو دیکھا میر مجنو جلوہ افروز ہیں۔ ڈھلے منجھے بالکل فرنچ کٹ، کرسی پر بیٹھے سگار اس طور پر پی رہے تھے، گویا ساری دنیا سے بیزار ہیں۔ میں نے کہا آداب بجا لاتا ہوں، میر صاحب تھے کہ اڑ گئے صفِ محشر لیے ہوئے۔

فرمایا کہاں ہیں ڈاکٹر عبادالرحمٰن۔ میں ہرگز یہاں نہیں رہوں گا۔ انھوں نے مجھ کو دھوکا دیا۔ یہ ان کی بد دیانتی ہے کہ تمھاری موجودگی میں مجھ کو بلایا۔ میں تمھارا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں نے کہا میر صاحب مجھ کو بھی نہیں معلوم تھا کہ عبادالرحمٰن خاں صاحب نے ہمارے آپ کے خلاف سازش کر رکھی ہے اور ہاں بالکل بھول گیا۔ یہ ڈاکٹر اصغر صاحب ہیں میرے بڑے کرم فرما اور آپ سے ملنے کے بے حد مشتاق۔

دونوں نے ایک دوسرے کو اس غور سے دیکھا کہ مجھ پر ہنسی اور غشی دونوں کا عالم طاری ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اتنے میں ڈاکٹر خاں بھی آ گئے اور ہم تینوں میں اس طور بیچ بچاؤ کر دیا کہ ہم سب نے ڈاکٹر خاں کے خلاف صف آرا ہونے کی ٹھان لی۔ میر مجنو نے چائے پینے اور ہنسنے دونوں سے انکار کر دیا۔ معاملات نازک ہو رہے تھے کہ میں نے دست بستہ میر صاحب سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ اگر کبھی میں ان سے مخاطب ہو کر ہنسوں، ہنساؤں یا ہنسنے والوں کا منہ بناؤں، تو ان کو اختیار ہوگا چاہے وہ مجھے جیل میں ڈھکیل دیں یا خود اس میں نزول اجلال فرمائیں۔ یا ہم دونوں اس قسم کی حرکت پر آمادہ ہوں۔ لیکن غصہ کا پارہ جس بلندی پر پہنچ چکا تھا وہاں سے اترنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے یہاں تک کہ ڈاکٹر اصغر اور ڈاکٹر خان دونوں اپنی اپنی چار پائیوں پر دراز ہو گئے۔ میں نے میر صاحب کو برآمدہ میں ایک کرسی پر بٹھایا۔ ایک انگریز لڑکی بے تحاشا گھوڑا دوڑائے چلی جا رہی تھی مشکل سے دس سال کی عمر ہوگی۔ اس کے پیچھے دو تین سیاہ کتے بھی بھاگے جا رہے تھے میر صاحب پر کچھ کیفیت طاری ہوئی۔

کہ میں نے للکارا

میر صاحب آپ ہیں کس مغالطہ میں بھلے مانسوں کے سامنے خواہ مخواہ ماش کے آٹے کی طرح اینٹھے جاتے ہیں. جتنی خوشامد کی جاتی ہے اتنا ہی آپ کا دماغ خراب ہوتا ہے کسی کو مہمان رکھنے کی توفیق تو آپ کو ہوئی نہیں اور مہمان بننے کی تمیز نہیں. نینی تال میں آکر فوج داری کرنے کا ارادہ ہو تو بتا دیجیے. دیکھتے نہیں ایک شریف شخص کے آپ مہمان ہوئے ہیں. گھر میں بزرگ، بیوی، بچے سبھی موجود ہیں - فرض کر لیجیے ڈاکٹر خان کی بیوی نے آپ کو بدتمیز اور بداخلاق سمجھ لیا اور انھوں نے تمام نینی تال کی عورتوں میں مشہور کر دیا کہ آپ کبھی بھلے مانسوں میں نہیں بیٹھے تو پھر کیا بات رہ جائے گی؛ اور تو جانے دیجیے یہ حسین لڑکی کو دیکھ کر آپ پر ذرا دھوپ چھاؤں کی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی، آپ کا حال سن کر آپ کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی.

میر صاحب سب کچھ سنتے رہے اور پھر مسکرا اٹھے. کہنے لگے خیر میں تو جیسا کچھ ہوں ظاہر ہے، لیکن ذرا اپنے نامۂ اعمال کے مسودے پر بھی غور کرو. حقیقت یہ ہے کہ تم ڈاکٹر اصغر سے ٹھیک رہتے ہو اور چونکہ وہ بھی موجود ہیں اس لیے مجھ کو اطمینان ہے کہ تم شریفانہ حدود سے متجاوز نہ ہو سکو گے، میر صاحب یہیں تک پہنچے تھے کہ اصغر صاحب کی آہٹ معلوم ہوئی. دیکھا تو پیچھے دروازے پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں اور چہرے پر آثارِ عتاب ہیں. دریافت کیا کیوں صاحب یہ میرے بارے میں کیا گفتگو ہو رہی ہے. میں نے کہا دیکھیے میر صاحب کیا فرما رہے ہیں. آپ نے اپنا نام تو سن ہی لیا ہوگا. کہنے لگے ہاں سنا ہے. میں نے کہا میر صاحب فرماتے تھے کہ اب ڈاکٹر اصغر شریفانہ حدود سے تجاوز نہ کریں گے. قریب تھا کہ شریفانہ حدود خطرے میں آجائیں کہ عبادالرحمٰن خاں صاحب نے نعرہ لگایا، خبردار قصور اسی شخص کا ہے جو غلط واقعات کا غلط راوی ہے. تم سب فوراً منتشر ہو جاؤ. ورنہ اس وقت کا کھانا اور دوسرے وقت کا سونا ضبط!

ایک دن میر منجھو اور موسم دونوں متبسم نظر آئے. تجویز یہ ہوئی کہ آج کہیں نہ کہیں ضرور چلا جائے. عجیب بات یہ تھی کہ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر خان کے ایماسے میں نے میر صاحب کو

خائف یا ناراض کرنے کی کوشش کی لیکن ان پر کچھ ایسی ۔ کروشن فیلنگ طاری تھی کہ ایک پیش نہ گئی ۔ میر مجھو کی آمادگی نے ڈاکٹر اصغر صاحب کو بھی چلنے پر اکسایا حالاں کہ یہ دونوں پیدل چلنے اور بلندی پر چڑھنے سے اتنا ہی بیزار تھے، جتنا مجھے کسی "بور" سے ملنے کے لیے اٹھنا تکلیف دہ ہوتا ہے بغرض ایک طرف چل نکلے ڈاکٹر اصغر اور ڈاکٹر خان تو اپنے اپنے فن کی چیزوں کی تلاش اور تعریف میں انسانیت سے گزرنے لگے ۔ جہاں سبزہ ہوتا تھا ڈاکٹر اصغر ایک ایک پتے اور اس کے رگ و ریشہ پر راگ اور رقص کو دخل دیتے تھے ۔ دوسری طرف عریاں چٹانوں کو پاکر ڈاکٹر خان اس کی ہیئت اور ماہیت پر سر دھنتے!

میں نے کہا میر صاحب یہ دونوں تو ہاتھ سے گئے آئیے ہم دونوں بھی اپنی اپنی فکر کریں ۔ ایک پان کھلائیے اور اس پل پر بیٹھ جائیے ۔ دیکھیے نیچے کتنا تاریک اور گہرا غار ہے ۔ اور غار کی تہ میں کیا کچھ نہ ہوگا ۔ آپ کچھ بتا سکتے ہیں کہ اگر ہم دونوں اس میں کود پڑیں تو پہلے کون شخص زمین پر پہنچے گا ۔ میر صاحب نے فرمایا اور کون مسخرا اس میں کودے گا ۔ میں نے کہا کودنے میں کیا لگتا ہے ۔ فرض کیجیے آپ ہی کو کودنا پڑے ۔ میر صاحب نے کچھ غصہ اور کچھ تحیر میں آکر جواب دیا کودنا پڑے! فرمایا میں کب آمادہ ہوں، میں نے کہا آمادہ تو میں بھی نہیں ہوں لیکن یہ میرا ذمہ ہے کہ میں آپ کو کودنے پر مجبور کردوں گا ۔ میر صاحب پل پر سے نیچے اتر آئے اور فرمایا، اب کہو ۔ میں نے کہا جب میں ایک کہوں تو آپ توبہ استغفار کر لیجیے گا ۔ دو کہوں تو آنکھیں بند کر لیجیے گا اور تین کہوں تو کود پڑیے گا پھر جی چاہے تو آنکھیں بھی کھول لیجیے گا ۔ فرمایا یہ سب کیوں اور میں کیوں ماننے لگا ۔ میں نے کہا اور جو میں ہپناٹزم جانتا ہوں ۔ یہ میرا ہی تصرف تھا کہ آپ پل سے نیچے اتر آئے یہ تو میرا ادنیٰ تصرف تھا ۔ اگر پوری توجہ کرتا تو آپ پل کی دوسری طرف اترتے اور یہ تو معلوم ہو رہا ہے کہ آپ توبہ استغفار کی نیت کر رہے ہیں ۔ اچھا ایک ۔ میر صاحب چونک پڑے کیونکہ نیچے سے ڈاکٹر خان نے آکر ان کی آنکھوں پر اپنی انگلیاں جما دی تھیں ۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اب کوئی شخص ایسی حرکت نہ کرے گا ۔ جس سے فن کی مہارت

ؔ ایک صاحب نے "بور" کی کتنی اچھی اور جامع تعریف کی ہے ۔ "شخصے کہ بے ارادہ مکلف باشد!!"

اور علم کا ذوق ظاہر ہوتا ہو۔

ہم سب ایک طرف چل نکلے، راستہ تقریباً مسطح، موسم خوش گوار، اونچی اونچی سرسبز چوٹیاں، اچھلتے، بل کھاتے شفاف چشمے یا فرہاد کا خوابِ شیر و شیریں، راستے میں بہاءم سے بدتر قلی نظر آئے۔ کئی میل تک باتیں کرتے چلے گئے جن کی شادی ہوگئی تھی وہ بیویوں سے دور رہنے پر مطمئن جن کی نہیں ہوئی تھی وہ نہ کرنے پر پشیمان۔ کہیں بھٹکے کہیں ٹھٹکے۔ ایک طرف سے ابر اٹھنا شروع ہوا، دیکھتے دیکھتے ساری وادی دھندلی اور نم ہوگئی طے یہ ہوا کہ اب جلد واپس ہونا چاہیے۔ اصغر صاحب کو ایک گھوڑا مل گیا اور ہم لوگوں کو ایک چڑھائی کا راستہ جو مختصر تھا۔ اس لیے یہ طے پایا کہ زیادہ محنت اور مختصر راستہ قابلِ ترجیح ہے کچھ ہی دور گئے تھے کہ بارش شروع ہوئی۔ اصغر صاحب جا چکے تھے میں میر منجھو اور ڈاکٹر خان رہ گئے تھے۔ کسی کے پاس نہ چھتری تھی نہ برساتی، سب نے بھیگنا اور میر منجھو نے ہانپنا کوسنا شروع کیا۔ طے یہ پایا کہ اگر میر منجھو کے ہمدوش و ہمعنان رہے تو دو قدم بھی چلنا دشوار ہوگا۔ اس لیے میر منجھو چھوڑ دیے گئے۔ ڈاکٹر خان بڑھتے چلے گئے۔ میں نے سوچا کہ اگر میر منجھو چھوڑ دیے گئے تو ممکن ہے کہیں کسی ایسی حرکت پر نہ آمادہ ہو جائیں جو "نقصانِ ہمسایہ و شماتتِ مایہ" کا موجب ہو اس لیے میں کچھ آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ تھوڑی دیر میں میر منجھو بھی آکر مل گئے۔ کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش چلتے رہے میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ جب تک میر منجھو خود سلسلۂ گفتگو کا آغاز نہ کریں گے میں بھی خاموش رہوں گا۔ بالآخر ایک طویل سانس لے کر میر منجھو نے فرمایا۔ بھئی برے پھنسے، اب کیا کیا جائے تم سے کہہ رہا تھا کہ چھتری لے لو۔ تمھارے ہی کہنے سے برساتی نہیں خریدی اب بتاؤ کیا کیا جائے اور دیکھو ڈاکٹر خان نے کیسا چرکہ دیا ہے۔ چڑھائی تو دیکھو، اللہ کی پناہ، لیکن ایک بات البتہ میں نے دریافت کی ہے اور وہ یہ ہے کہ چڑھائی میں سانس ناک سے لینا چاہیے۔ منہ سے لینے سے تو بڑی تکلیف اور تکان ہوتی ہے۔

عرض کیا میر صاحب غلطی تو ہوئی۔ اسی طور پر قیامت کے دن لوگ کہیں گے کہ فلاں کام کیوں نہیں کیا اور فلاں کے کہنے میں کیوں آگئے اور دیکھیے تو قیامت اور آج کے دن میں فرق ہی کیا ہے۔ سورج سوا نیزے پر نہیں تو معلوم نہیں کتنے ہزار نیزے اس کے قریب آہی گئے

ہیں. فرق گرمی اور سردی کا ہے. لیکن آپ کو یہ معلوم ہی ہے کہ سردی جب بڑھ جاتی ہے تو گرمی کا کام کرنے لگتی ہے. یہ بھی معلوم ہے کہ قیامت کے دن ماں، باپ، بیوی، بچے، دوست اعزا کام نہ آئیں گے صرف اعمالِ صالح کام آئیں گے. سو یہ چیزیں لکھنؤ ہی میں آپ کے پاس کب تھیں کہ آج ان کی سرد مہری یا بیوفائی کا شکوہ کیا جائے. ڈاکٹر خان اور اصغر صاحب پر آپ کو بڑا اعتماد تھا. انھوں نے رفاقت چھوڑ دی. آپ نہ اعمالِ صالح کے قائل تھے اور نہ میرے با ایں ہمہ اعمالِ صالح کے بجائے میں ظاہر ہوں. میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بے تکلف فرمائیے. پھر قیامت میں کیا تکلف. جل کر فرمایا اور تم کسی آشوبِ قیامت سے کم ہو.

عرض کیا میر صاحب اگر آپ کے جذبات اب تک وہی ہیں جو لکھنؤ میں تھے تو مبارک ہو کہ ابھی قیامت نہیں آئی ہے اور ہم ایک دوسرے کے بیوی بچوں سے مل سکیں گے. ہنس پڑے فرمایا بھئی کہیں ٹھہر جاؤ. میں نے کہا میر صاحب اس میں خطرہ ہے. بھیگ تو آپ کافی گئے ہیں. چلنے سے حرارت پیدا ہوتی رہتی ہے جس سے سردی کا سدِّباب ہوتا رہتا ہے. ٹھہرے تو صرف نمونیا کا اندیشہ ہے. نینی تال کا پہاڑ کچا پہاڑ بتایا جاتا ہے. اگر کوئی حصہ لڑھکتا آرہا تو کیسی رہے گی. فرمایا سچ کہتے ہو. لیکن چلا بھی تو نہیں جاتا. میں نے کہا چلنے کا ارادہ نہ کیجیے ارادہ کمزوری پیدا کرتا ہے. بس مجھ سے باتیں کرتے رہیے اور سمجھیے کہ چلنا بھی باتوں کا ایک جزو ہے. کہنے لگے یہ بھی تو ممکن ہے کہ ڈاکٹر خان کسی دوسرے راستے سے نکل گئے ہوں اور ہم تم دونوں راستہ بھول گئے ہوں. میں نے کہا یہ نہیں ہو سکتا. جس راستے پر چل رہے ہیں وہ نہایت کشادہ اور ہموار ہے. کہیں نہ کہیں کوئی معقول آبادی اور مکانات ضرور ملیں گے. فرمایا اچھا یہ بتاؤ کس سمت چل رہے ہیں. میں نے کہا سمت کا سوال ہی بے کار ہے. بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہم سب بلندی کی طرف جارہے ہیں. کہنے لگے آخر بلندی کی بھی کوئی حد ہے. کب تک بلندی کی طرف چلو گے. میں نے کہا جب تک اللہ میاں یا ڈاکٹر خان نہ ملیں. میر صاحب اس پر کچھ آمادۂ نقضِ امن ہونے والے تھے کہ سامنے ایک طرف ڈاکٹر خان سگریٹ پیتے نظر آئے.

فلیٹ پر آئے تو میر صاحب کو خیال ہوا کہ ڈگ دیکھ کر کیا کہیں گے. میں نے کہا میر صاحب

یہ نینی تال ہے اس قسم کے حادثات آئے دن یہاں لوگوں کو پیش آتے ہوں گے۔ مردوں سے تو کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آخر ہم آپ یہاں کے کس مرد سے کم خوبصورت، توانا یا آبرو باختہ ہیں آ رہیں لیڈیاں تو وہ ایک دفعہ آپ کو دیکھ کر ہنس تو ضرور پڑیں گی۔ لیکن بعد میں ضرور خیال کریں گی کہ ہم کتنے جری اور جفاکش ہیں کہ اس ابتلا و مصیبت میں بھی بشاش چلے جا رہے ہیں اور رہاں وہ قصہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا۔ شیریں فرہاد.....

گھر پہنچے تو بچوں نے تالیاں بجائیں نوکروں نے انگیٹھیاں سلگائیں۔ کپڑے تبدیل کیے گئے۔ کھانا کھایا گیا۔ اپنی اپنی چارپائی پر دراز ہوئے۔ میر منجھو کو نیند نے جھیل میں اور اصغر صاحب کو برلن پہنچا دیا۔ بیداری میں ڈاکٹر خان "اندرونِ خانہ" پہنچے۔ میں نے خطوط کی طرف رخ کیا معلوم ہوا کہ بیوی ہسپتال میں بچے مکان پر ہیں۔ اور بچوں کے نانا زیرِ آپریشن۔ سب کو جواب لکھے۔ بیوی کو لکھا میں دوسری شادی ہرگز نہ کروں گا اور نہ یہاں اس نیت سے آیا ہوں۔ بچوں کو لکھا تم لوگ اماں بی کو پریشان نہ کرو گے تو پڑھنے لکھنے سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیے جاؤ گے۔ ان کے نانا میاں کو لکھا۔ مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ۔ یہاں تبدیلِ آب و ہوا کی غرض سے آیا تھا لیکن آب و ہوا کی کچھ ایسی کثرت ہو گئی ہے کہ بیوی بچوں تک پہنچنا دشوار ہو رہا ہے۔

کچھ دیر بعد کمرے سے نکل کر برآمدہ میں بیٹھ گیا۔ جھیل میں بادبانی کشتیاں آبی تیتلیوں کی مانند رقص کر رہی تھیں۔ دور سے آبشاروں کی اور نزدیک سے ان خوبصورت چڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں جو ایک طرف لٹکتے ہوئے پنجرے میں پھدک رہی تھیں۔ کبھی خیال آتا کہ ان کو آزاد کر دیا جائے تو کیسی مسرور ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ یہاں بہت آرام سے ہیں۔ موسم اور فضا کی بے اعتدالیوں سے بھی محفوظ ہیں۔ لیکن آزادی بھی کیا چیز ہے کہ ہر راحت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ سامنے سڑک پر سے قلی گزر رہے تھے۔ ایک تندرست آدمی کو چار کمزور آدمی ڈانڈی میں لیے جا رہے تھے۔ ڈانڈی کا منظر بھی کس درجہ عافیت سوز ہوتا ہے۔ اس میں تو صرف عورتوں کو بیٹھنا چاہیے وہ بھی تفریحاً نہیں انتقاماً۔ مردوں کو اس سواری میں دیکھ کر اکثر جی میں آیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کے درمیان سے ایک ڈنڈا نکال دیا جائے جس کے دونوں سروں کو قلی اٹھا لیں اور ان سے کہہ دیا جائے کہ اس زندہ لاش کو نینی تال کی سب سے بلند چوٹی پر لے جا کر

اس طور پر پھینکیں کہ یہ جھیل کے عمیق ترین حصہ میں جا گرے۔

معاشرت اور معیشت کے بھی کیا کرشمے ہیں جن کے سامنے آج یورپ کی بازیگری بھی ماہر، سرمایہ اور مزدور کی کشاکش، حسن وعشق کی کشاکش سے کچھ زیادہ پر آشوب نظر آ رہی ہے، لیکن یہ وہ مسائل ہیں جن کو مجنوں اور مسولینی بھی حل نہیں کر سکے ہیں۔ شاید یہ حل ہونے کے لیے بنائے بھی نہیں گئے ہیں۔ ان کے حل ہونے پر ممکن ہے بہت سے حل شدہ مسائل لا ینحل ہو جائیں۔

سردی اور بڑھی۔ اندر سے ایک کمبل لایا۔ اوڑھ کر اس طور پر بیٹھا کہ دوسرے کو صرف کمبل اور عینک نظر آئے اور مجھ کو سارا نینی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور کچھ نہیں!!

کچھ کا کچھ!

عشّاق اور انگریز دو قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیراتِ ہند سے ڈرتی ہیں نہ میونسپلٹی سے۔ انگریز تو ممکن ہے اس لیے نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیراتِ ہند اور میونسپلٹی دونوں ان کی آوردہ ہیں عشّاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے بے نیاز ہیں۔ انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا عشّاق کو شعراء نے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعراء اور آئی سی ایس کے اثر سے آزاد کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے سوراج مل جائے یعنی انگریزوں میں عشّاق اور عشّاق میں انگریز بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

عشّاق کی تاریخ کا پتہ لگانا دشوار ہے۔ ان کی تفتیش یا ان کا تدارک نہ سائنس سے ممکن ہے نہ میونسپلٹی سے۔ کسی چیز کا پتہ تین ہستیاں لگا سکتی ہیں۔ پولیس، پروفیسر، مولوی، لیکن دقّت یہ آن پڑی کہ پولیس نے تفتیش کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ عشّاق کا مسئلہ پولیس سے نہیں بلکہ محکمۂ حفظانِ صحت سے تعلّق رکھتا ہے پروفیسر ہر بات کی ابتدا آکسفورڈ اور کیمبرج سے کرتا ہے۔ مولوی آدم اور جنّت سے۔ رفعِ شر کی خاطر چاہا تھا کہ مولوی اور پروفیسر

دونوں کے باباآدم کو مشرک قرار دے دوں، لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ آکسفورڈ اور کیمبرج میں باباآدم اور جنت نہیں ملتے، دوسری طرف باباآدم اور ان کی جنت میں آکسفورڈ اور کیمبرج کا پتہ نہیں۔

اس تحقیق و تفتیش کے دوران میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے میں آپ کے باباآدم سے واقف ہوں۔ ہم دونوں ہم وطن اور ہم مکتب تھے اور آپس میں نہایت دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ بعض جی حضوریوں نے ہم میں اختلاف پیدا کرادیا، اور اب اس اختلاف نے یہاں تک طوالت کھینچی ہے کہ ایک طرف یونیورسٹیاں قائم کی جانے لگی ہیں، دوسری طرف ہم کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ مولوی اور پروفیسر دونوں کے باوا آدم کا ایک ثابت کرنا اتنا مفید یا دلچسپ نہیں ہے جتنا مجھے ان دونوں کا چچا قرار دینا۔ اخی آدم میرے بڑے بھائی تھے۔ لیکن نہایت سادہ لوح، ضدی اور جاہل، ذرا یہ کرشمہ ملاحظہ فرمایئے گا۔ نہ بندوق اپنی نہ نشانہ اپنا نہ ارادہ اپنا نہ مقصد اپنا صرف اپنے کندھے پر رکھ کر چھوڑ دالی۔ ان کی اس حرکت سے کتنا بڑا ہنگامہ بپا ہوگیا۔ اب جو کہتا ہوں کہ میاں یہ کیا کیا، تو کہتے ہیں کہ ہم خلاصۂ کائنات ہیں۔ میں نے کہا اور یہ خاکسار؟" لال پیلے ہوکر فرمایا، شیطان۔ میں نے کہا، خوب جنت نباشد، یہ دنیا ہے جہاں مولوی، اور پروفیسر اور تعزیرات ہند اور ملیریا اور بیوی بچوں سے پالا پڑے گا۔ یونیورسٹی میں تعلیم دی جائے گی۔ اسپتال میں ولادت ہوگی، اپالو اور چوپاٹی پر بیویاں ملیں گی۔ دفعہ ۴۴ میں چالان ہوگا۔ سری گنیش آنمہ؛ جھلاکر بولے تو کافر ہے، جہنم کا ایندھن بنے گا۔ میں نے کہا، ایسی بات منہ سے نہ نکالو، شاخِ طوبیٰ پر لٹکنے والوں کو حق نہیں حاصل کہ وہ جہنم کے ایندھن کا مضحکہ اڑائیں۔ میں تو خیر جہنم بردوش ہوں آپ بھی تو آکسفورڈ بدامال ہیں۔ میں جہنم میں چلا جاوٗں گا، آپ بھی کیمبرج سے کبھی نکل سکیں گے یا نہیں؛ فرمایا استغفراللہ میں نے کڑک کر کہا بس بس یہی منہ سے نہ نکالنا، نرے مولوی ہی معلوم ہوتے ہو۔ نہ سمجھتے ہو، نہ سمجھنے دیتے ہو۔ اور کوئی سمجھاتا ہے تو الٹ ہوتے ہو۔ میاں استغفراللہ کہنے کا تو وقت تھا جب اپنوں سے سجدہ کرانے کی فرمائش کی گئی تھی، ایک اپنی خاطر ساری جماعت کی جگ ہنسائی کرائی۔ خلاصہ کائنات؛ کیا یہ بھی کوئی تعلیمی ڈگری تھی، کہ جب تک کوئی دے یا نہ دے قابلیت

کا معیار ہی نہ متیقن ہو سکے. کیا خلاصۂ کائنات ہونے سے پہلے کچھ اور تھے، تمھارے اس بے اختیارانہ اور بے کسانہ استغفراللہ پر ان کو بھی ندامت ہوتی ہے، جن کی پناہ پکڑنے پہ استے دلیر ہو!

اپنے کو جو جی چاہے کہتے رہیے لیکن مسئلہ کی نوعیت "کھیل کھلاڑی کا پیڈاری کا" سے آگے نہیں بڑھتی. کھیل کھیلنے پر آپ مجبور ہیں. کمالِ فن پر داد ملتی ہے خوش ہیں کہ کمال آپ کا ہے. لیکن یہ آپ کی صریح لیکن مقتدر گمراہی ہے. کمال آپ کا ہوتا تو اپنے کمال کے اظہار پر اتنے مستعد نہ ہوتے، جتنا دوسروں کے کمال کا اعتراف کرنے پر آمادہ. کچھ ترش رو ہو کے فرمایا تو پھر گویا تمھارے کمال کی داد دوں. میں نے کہا تمھارے داد نہ دینے سے میری اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا. تمھارا خلاصۂ کائنات ہونا دوزخ کے اندیشے اور جنت کی ہوس پر منحصر ہے. دوزخ اور جنت نہ رہے تو تمھارا اشرف المخلوقات ہونا مہمل تر ہو جائے یہ تو بالکل ایسا ہے جیسا ہندوستان کا امن برطانوی اقتدار پر ہے. انسان ایک مقدس گمراہی میں مبتلا ہے جس کو وہ مذہب قرار دیتا ہے اور جس چیز کو وہ نہ سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے اس کو مذہب کے حوالے کر دیتا ہے. مذہب کو تم اپنے اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ قرار دیتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے اور خدا کے درمیان زیادہ سے زیادہ صرف ایک مفاہمہ ہے اور مفاہمہ کے لیے فریقین کا ہم سطح ہونا ضروری نہیں ہے. تم نے خدا کی جو حیثیتیں تسلیم کرلی ہیں اس کے اعتبار سے تم کو فریق بننے کا اختیار بھی حاصل ہونا چاہیے اس اعتبار سے معاہدہ اور مفاہمہ دونوں بے معنی الفاظ ہو جاتے ہیں. مذہب کی ابتدا انسان کے اولین اعترافِ شکست سے ہوئی تھی اور یہ گندم چشی اس کا اظہارِ معذرت تھا.

تھوڑی دیر تک تو ہمارے سادہ لوح برادرِ مکرم پیچ و تاب کھاتے رہے لیکن چونکہ ان کو اس کا یقین تھا کہ میرے لیے ان کی خوشی اور ناخوشی دونوں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں، کچھ سنجیدہ بنے اور اس متفکرانہ لیکن بر خود غلط طریقہ سے آمادۂ گفتگو ہوئے گویا کہ جو کچھ کہہ رہے تھے اس سے کہیں زیادہ علم کا ذخیرہ ان کے ذہن و دماغ میں محفوظ تھا۔ فرمایا انسان کا کسی چیز کا نہ سمجھنا اس کی کمزوری کیوں ہو. کسی واقعہ کا سمجھنا یا نہ سمجھنا

یہ سب اپنی اپنی جگہ پر ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان کسی چیز کو نہ بھی سمجھے پھر بھی وہ انسان ہے اس کا پیغمبر، جنرل، مصنف، یا اس قبیل کی کوئی اور چیز ہونا اس کے انسان بننے کے لیے ضروری نہیں ہے انسان بجائے خود محض انسان ہونے کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ استغنا کے ساتھ جواب دیا اور اس طور پر گویا وہ میری بات کو مہمل سمجھ کر بھی اس کو مہمل ثابت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے کہا آپ کی دلیل تو ایسی ہی ہے جیسے سی آئی ڈی ہر حال میں سی آئی ڈی ہے خواہ وہ جرم یا مجرم کا پتہ لگا سکے یا نہیں فرمایا اور نہیں تو کیا، میں نے عرض کیا گویا انسان ہونا آپ کا پیشہ ہے کارنامہ نہیں! یہ جملہ یا جُرعہ ان کے ظرف کی ساری وسعت پر محیط ہو کر چھلک گیا۔ سنتے ہی اصلیت پر اتر آئے۔ کہنے لگے بدمعاش اب ذاتیات پر اتر آیا۔ ابھی تو سی آئی ڈی پر دانت لگائے ہوئے تھا۔ اب شاید تیرا دوسرا وار آئی سی ایس پر ہوگا غدار کہیں کا۔ میں نے کہا سی آئی ڈی کے جواز میں کوئی دلیل نہیں پیش کر سکتے تو آئی سی ایس کی کب تک خیر مناسکو گے۔ جس سے معاشرت کا بار نہ اٹھایا جاسکے، مذہب کا جوا کیوں گلے میں ڈالے۔ غدار اسے کہتے ہیں جس نے غدار ہونے یا نہ ہونے کی ذمہ داری لی ہو۔ میں غدار نہ ہوتا تو تم خلاصہ کائنات کیسے ہوتے، لیکن انصاف شرط ہے۔ اس کائنات کا جس کے تم خلاصہ قرار دیے گئے ہو، اولیں غدار کون ہے تم یا میں؟ تم مسجود بنائے گئے اور میں مردود۔ لیکن کس بنا پر۔ کہو گے مشیت ہی یہی تھی۔ میں کہتا ہوں مشیت الٰہی کو تم سمجھے نہیں اور یہی نہیں بلکہ تم میں اس کے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں تھی اس لیے کہ خود غرض بھی تھے اور احمق بھی۔ خود غرض یوں کہ تم نے غور تو کیا ہوتا تم میں مسجود ہونے کی کون سی بات تھی۔ کسی کے کہہ دینے سے تم اس منصب کے اہل کب ہو گئے اور احمق یوں کہ سمجھتے تھے کہ دوسرے بھی احمق ہیں۔ بہر حال تم نے خود غرضی اور حماقت سے خان بہادری حاصل کر لی۔ میں نے تم کو سجدہ کرنا تمھارے پیدا کرنے والے کی توہین سمجھی لیکن تم اس کے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔ تمھاری تخلیق کا بنیادی اصول ہی کمزور تھا۔ آستانہ پہلے سے موجود تھا پھر آخر جبیں کہاں سے لائی جاتی، وہ تم نے پیش کر دی۔ کرنے کو تو فرشتوں نے بھی سجدہ کیا اور تم کو کیا، لیکن ایسے آستانہ کی محرومی بھی قابلِ رحم ہے جو جبینوں کا محتاج ہو۔ میں نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

تم اس حقیقت کو کبھی نہ سمجھ سکو گے کہ میرے انکار نے تمھارے خدا کی بہترین صفت اور پوشیدہ ترین راز کو برافگندہ نقاب کر دیا۔ میلادِ آدم نے توار الٰہیہ کو مضمحل کر دیا تھا انکارِ ابلیس نے ان کو شگفتہ بنا دیا۔ انکارِ ابلیس ایک آئینہ تھا جس میں حقیقت نے پہلی بار حقیقت کو پہچانا۔ لیکن آپ تو ظالم اور جاہل قرار دیے گئے ہیں۔ یہ باتیں کب ذہن میں آئیں گی۔ اچھا یہ سب جانے دیجیے آخر یہ کیوں لازم آتا ہے کہ جب تک کوئی سجدہ نہ کرے اس وقت تک کوئی معقول نہ ہو اور جب تک کوئی مسجود نہ ہو لے اس وقت تک وہ معتقد نہ ہو سکے۔ میرے سجدہ نہ کرنے سے آپ اشرف المخلوقات کیوں کر ہو گئے؟ اگر آپ کا اشرف المخلوقات ہونا محض اس بنا پر ہے کہ میں مردود ہوں تو آپ کی حالت یقینی قابلِ رحم ہے اور میرا سجدہ نہ کرنا میرے لیے انتہائی فخر۔ آپ کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ آپ نے اپنا برا یا بھلا ہونا دوسروں کے برے یا بھلے ہونے پر منحصر رکھا ہے۔

اخی آدم اب گھبرائے، کہنے لگے۔ بھائی ان کو نہیں پکڑتا جن کا یہ سب کھیل ہے آخر اتنی دیر سے مجھی سے کیوں الجھا ہوا ہے۔ اخی آدم کی یہ معقول اور ناگزیر پسپائی مجھے پسند آئی۔ میں نے کہا ذرا قریب آؤ کان میں کہنے کی بات ہے۔ کوئی مولوی نہ سن لے ورنہ میری اور تمھاری دونوں کی خیر نہیں۔ مجھے تعلیم یافتہ اور تمھیں شیطان قرار دے گا۔ اخی آدم کے کچھ تیور بدلنے لگے تھے کہ میں نے فوراً کہا بھائی جان اچھی بات ہے، میں نہیں آپ ہی تعلیم یافتہ سہی، اتنا سن کر اس طور پر مسکرائے اور ساتھ ہی ساتھ اظہارِ انکار فرمایا جیسے کوئی پیشہ ور شاعر اپنے کلام کی داد پر اظہارِ فروتنی کرتا ہوا ور داد دینے والے کو اس حرکت پر خجالت بھی آئے اور غصہ بھی۔ بہر حال اب آدم انتہائی خلوص اور اعتقاد کے ساتھ میری بات سننے کے لیے آمادہ ہوئے۔ مجھے خیال آیا کہ ہندوستان میں سوراج اور تعلیم یافتہ بیویوں کے ہنگامہ سے کسے کب فرصت ہو، آؤ جو کچھ کہنا ہے ان سے کہہ دو مردِ معقول معلوم ہوتے ہیں۔ مریض و مفلس ہیں۔ متعدد بچے اور ایک ہی بیوی ہے۔ ممکن ہے راہِ راست پر آجائیں۔ ورنہ بقول شخصے ممکن ہے کسی ایسے سے سابقہ پڑتا جو خود جاہل ہوتا بیوی پردہ نہ کرتی ہوتی۔ میں نے کہنا شروع کیا۔

"سنو حقیقت یہ ہے انسانیت مکمل نہیں ہے اور نہ مکمل ہو سکتی ہے یہ تمام کائنات عالم منشائے الٰہی اور قدرتِ الٰہی کی باہمی اور مسلسل کشمکشِ تفوق کا نتیجہ ہے. خدا سب سے بڑا "آئیڈیلیسٹ" ہے اور تم جانتے ہو آئیڈیلیسٹ کی سب سے بڑی تحریک....."

"اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر" پاس کی ایک شکستہ مسجد سے تکبیرِ اذان بلند ہوئی اور پھر کچھ نہ سنائی دیا کہ اخی آدم اور ابلیس کے مکالمہ یا مجادلہ کا کیا انجام ہوا۔

"سلام ہو نجد پر[1]"

یونیورسٹی کا نیا سیشن شروع ہوتا ہے تو اربابِ یونین ایک خاص صحبت "یونین ڈے" یا "یونین ویک" کی منعقد کرتے ہیں اور اس تلاش میں نکلتے ہیں کہ کسی پرانے گنہگار کو پکڑیں جو ان کو "قصۂ سکندر و دارا" یا "حکایتِ مہر و وفا" سنائے۔ اس سعی و تلاش میں ان کو کبھی کبھی پرانے زمانے کے عجیب الخلقت جانوروں کے ڈھانچے جہاں تہاں مدفون مل جاتے ہیں، اس سے وہ کسی ماہرِ حجریات کی طرح اندازہ لگاتے ہیں کہ اس سرزمین پر کیسے کیسے جانور بستے تھے اور گردشِ لیل و نہار و فشارِ روزگار سے کیا ہو گئے۔ اپنا شمار اب انھیں حجری آثار میں کرنے لگا ہوں۔

میرا تو یقیناً اب یہی مصرف رہ گیا ہے کہ اس دانش گاہ کے رستم و اسفندیار اور

---

[1] "سلام علی نجد ومن حل بالنجد فانهم حلوا بقلبی علی البعد (ابن الذبیہ)

(سلام ہو نجد پر اور نجد میں رہنے والوں پر باوجود دوریِ مکان وہ میرے دل میں جاگزیں ہیں)

قیس و فرہاد کی رزم و بزم کی داستانیں سنایا کروں لیکن اس خیال سے ڈرتا بھی رہتا ہوں کہ ایسا تو نہیں کہ اس یونین اور اربابِ یونین کا بھی یہی وظیفہ رہ گیا ہو کہ وہ داستانیں سنایا کریں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ آج اپنی ہی داستان سنانے کے لیے اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ کسے معلوم انقلاب روزگار یا شامت اعمال سے کل کس طرح کے افسانے سننے سنانے کی نوبت آئے لیکن کچھ ہو یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جو قوم صرف افسانے کہنے سننے پر اتر آتی ہے وہ جلد ہی خود افسانہ بن جاتی ہے۔ افسانوں سے زندگی نہیں بنتی زندگی سے افسانوں میں جان آتی ہے۔

یوم، ہفتہ، جوبلی منانے، جلوس نکالنے اور نعرہ لگانے کی تقریبیں بہت عام و مقبول ہیں۔ خاکم بدہن ان کو برا کہہ کر دوسروں کی اور اچھا بتا کر اپنی نظروں سے گرنا نہیں چاہتا۔ سلطانیِ جمہور کے زمانے میں حق کو ناحق، ناحق کو حق، خوب کو زشت اور زشت کو خوب منوانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے آج یونین ڈے ہے۔ کل سرسید ڈے تھا۔ آئندہ یوم مریخ آئے گا۔ یہاں تک کہ ایک دن روزِ جزا آجائے گا۔

حضرتِ اکبر کے عہد میں مرنے کے بعد فاتحہ ہوتا تھا اور احباب پلاؤ کھاتے تھے اکبر سرسید کے ہم عصر بھی تھے۔ نکتہ چین بھی۔ ممکن ہے اسی بنا پر سرسید نے موت اور اکبر دونوں کے علی الرغم پلاؤ کھانے کے لیے مرنے اور فاتحہ دونوں کی شرط ختم کر دی ہو اور اس کے لیے کالج کے بورڈنگ ہاؤسوں میں صرف دوشنبہ کا دن مقرر کر دیا ہو جو مدتوں اور شاید اب بھی "یوم بریانی" کے نام سے معروف ہے۔ آج کل کے طلبہ کا معلوم نہیں بریانی کے معاملہ میں کیا رویہ ہے میرے زمانے میں تو اس سے لوگ اتنے سیر یا بیزار اور اکبر کی بشارت سے اتنے خائف ہو گئے تھے کہ ورثا کو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کے مرنے کے بعد فاتحہ ضرور ہو لیکن بریانی بالکل نہ ہو۔

سرسید ڈے پہلے کبھی اس دھوم سے نہیں منایا جاتا تھا جیسا کہ اب منایا جاتا ہے دن میں تقریریں، شام کو چراغاں، رات میں کھانا۔ اس پروگرام کی آخری مد سب سے زیادہ خلوص اور سب سے جلدی پوری کر لی جاتی ہے۔ اکثر اس اندیشے سے کہ کہیں کھانے کی مقدار اور ناخوانده

مہانوں کی تعداد کا حساب لگانے میں منتظمین سے چوک نہ ہوگئی ہو۔ اس طرح کی دعوتوں میں شرکت کرنے والے بجا طور پر اس طرح سوچتے ہیں کہ اگر انسان کو جیسے کبھی کبھی میزبان کے فرائض بھی انجام دینے پڑتے ہیں خطا و نسیان سے مرکب ہوتا ہے تو مہمان بھوک پیاس سے مغلوب ہی نہیں مشتعل بھی ہو سکتا ہے۔

خیال ہے کہ کھانے والوں کو اتنی اور ایسی بندھی ٹکی تقریریں سننی نہ پڑا کریں تو کھانے کے ساتھ وہ ایسا سلوک نہ کریں جیسا کہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ہر سال اور سالہا سال صرف سرسید پر تقریر ہونے کے بجائے اگر "سرسید میموریل لکچرز" ہوا کریں جس کے لیے باہر سے اکابرِ علم و فن معقول معاوضے پر مدعو کیے جائیں، جیسا کہ بڑے بڑے علمی اور تہذیبی اداروں میں عام طور پر ہوا کرتا ہے تو یہ تقریب زیادہ مفید و معقول ہونے کے علاوہ یونیورسٹی کی مستند مطبوعات اور قابلِ قدر روایات میں معتدبہ اضافہ کا موجب ہوگی۔

اس کے علاوہ، لیکن اس ضمن میں تقریب سے کافی دنوں پہلے سرسید اور علی گڑھ کی گوناگوں تاریخی خدمات یا نامور اولڈ بوائز کے کارناموں پر اپنے طالب علموں کو مقالہ یا لیکچر وغیرہ لکھنے کی دعوت دی جائے۔ اس کا معاوضہ اچھا اور معیار بلند ہو۔ جن طالب علموں نے اپنی علمی استعداد اور اخلاقی کردار سے اس ادارے کی نیک نامی اور اس کے بنیادی مقاصد کے حصول میں سب سے زیادہ اور نمایاں خدمات انجام دی ہوں ان کو سرسید کے نامِ نامی سے منسوب معقول انعام دیے جائیں اور تقسیم انعامات کی تقریب اس مہمانِ محترم کے ہاتھوں انجام پائے جو اس سال سرسید میموریل لیکچرز کی تقریب کے لیے مدعو اور موجود ہوں۔

اس طرح سے یونیورسٹی کے پروگرام کا علمی و تہذیبی ارتباط باہر کے مشاہیرِ علم و فن سے بڑھے گا، طلبہ میں لکھنے اور سوچنے کا ملکہ پیدا ہوگا، اپنے ادارے سے عقیدت بڑھے گی اور ایک بہت اچھی روایت کا آغاز ہوگا۔ اس میں دو چار ہزار روپے سالانہ سے زیادہ صرف نہ ہوگا جو ہم بادنیٰ اشتعال یوں بھی کر دیا کرتے ہیں۔

"یومیات و طعامیات" کے پروگرام سے کہیں سابقہ ہوتا ہے تو اکثر مولوی نذیر احمد کی

توبۃ النصوح کا وہ حصہ ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے جہاں خواب میں نصوح نے مرحوم باپ کو خدا کی عدالت میں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے موجود سراسیمہ پایا۔ بیٹے نے حیرت میں آکر پوچھا حضور نے تو دنیا میں اتنے اور ایسے ایسے کارِ خیر انجام دیے تھے پھر یہاں جوابدہی کے لیے کیسے حاضر ہونا پڑا؟ باپ نے جواب دیا کہ وہ اعمال کچھ اور طرح کے ثابت ہوئے لیکن یہ تو بتاؤ تم لوگوں نے میری مغفرت کی دعا بھی مانگی یا اس طرح کا کوئی اہتمام کیا؟

نصوح کا جواب سنیے :

"جناب آپ کے انتقال کے بعد رونا پیٹنا تو بہت کچھ ہوا۔ اب تک اس شدّ و مد کے ساتھ ہوتا ہے کہ گویا آپ نے ابھی انتقال فرمایا ہے اور یہ رونا تو ہم لوگوں کے دم کے ساتھ ہے۔ آپ کی عنایتیں، آپ کی شفقتیں جب تک جییں گے، یاد کریں گے۔ رسمِ دنیا کے مطابق آپ کا کھانا بھی برادری میں تقسیم کر دیا ہے۔ لوگ میرے منہ پر شاید خوشامد سے کہتے ہوں مگر کہتے تھے کہ اس مہنگے سے میں باپ کا کھانا اچھا کیا۔ دعا کے بارے میں غلط بات کیوں کر عرض کروں اہتمام نہیں ہوا۔ آپ کے بعد ترکے اور میراث کے ایسے جھگڑے پڑ گئے کہ آج تک نہ سلجھے۔"

زندگی کے المیہ کو طربیہ کی فضا میں جس ماہرانہ اور معروضی انداز سے یہاں نذیر احمد نے پیش کیا ہے یہ انھیں کا حصہ ہے۔ نذیر احمد اس زمانے کے ہیں جب المیہ، رزمیہ، طربیہ، اور تنقید وغیرہ کے اسرار و رموز سے نہ وہ واقف تھے نہ ان کے قارئین۔

عربی شعر کا مشہور مصرعہ جس کا پہلا ٹکڑا اس مضمون کا عنوان ہے، بہت سے ان لوگوں کی زبان پر بھی آتا ہوگا جو میری طرح نہ عربی سے واقف ہوں گے، نہ بعض دوسروں کی مانند عربوں سے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ شاعر کس طرح زندگی و زمانے کے ایک آنی و فانی لمحے کو گرفت میں لے کر اس کو ثبات و دوام بخش دیتا ہے۔

قصہ صرف اتنا ہے کہ نجد سے گزرتے ہوئے ایک "بے برگ و سامان" قافلہ کو بیتے ہوئے وہ دن اور وہ یارانِ باصفا یاد آتے ہیں جن کے ساتھ کبھی اس نے وہاں کچھ وقت گزارا تھا اور رزم و بزم کے وہ واقعات تازہ ہو گئے جو شاہراہِ حیات کے ہر راہ رو کے لیے مقدر ہیں خواہ وہ متمدّن ہوں یا غیر متمدّن، اسود ہو یا احمر، دور ہو یا نزدیک

مفلس ہو یا تونگر، ماضی میں رہا ہو، یا حال میں ہے، یا آئندہ آئے گا اسی آغاز و انجام کے ساتھ جو قیسِ عامری اور دوسرے "عاشقانِ پاک طینت" کو پیش آئے اور آتے رہیں گے اتنی سی بات کو شاعر نے کیا بنا دیا اور کہاں کہاں پہنچا دیا!

عرب کے یہ جاوداں مبہم دواں ہر دم جواں "صحرانشین و صحرا گرد" بھی کیسی مخلوق تھے شاید اب بھی ہوں جو زمانے کے شب و روز کو خاطر میں لاتے، زندگی کے "گزشتنی و گزاشتنی" ہونے کو، مجادلہ ہو یا معاشقہ، ان سے اس طرح ساز و ستیز کرتے جیسے "اب نہیں تو کبھی نہیں" جو حال کو ماضی اور مستقبل دونوں کا حاصل سمجھتے، وہ حال جو ماضی اور مستقبل دونوں سے زیادہ ناپائیدار گریزپا ہوتا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اسی طرح کے حال سے ماضی کو توانائی اور مستقبل کو تازگی ملتی ہو اور یہ مان لیا گیا ہو کہ بدوی اقوام کبھی مٹ نہیں سکیں اور کیا معلوم

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

میں اسی کی بشارت دی گئی ہو۔

کالج کی گزرگاہوں سے جب کبھی گزرتا ہوں تو بے اختیار "نجد" اور "یارانِ نجد" یاد آتے ہیں اور اس نجد کا کون سا قیس ایسا ہوگا جو یہاں سے "سلام علی نجد و من حل بالنجدہ" کہے بغیر گزر جاتا ہوگا۔

کبھی کبھی جب ہوا میں "شراب کی تاثیر" نہیں ہوتی یا برائے نام ہوتی ہے تو سرسید ہاؤس کی طرف نکل جاتا ہوں۔ یہ سارا علاقہ سالہا سال سے کسٹوڈین کے قبضے اور گھوسیوں اور مویشیوں کے تصرف میں رہا ہے۔ سرکاروں، درباروں میں ہماری کتنی "سعیٔ صفا و مروہ" کے بعد جہاں فریقین کبھی کبھی "رجم نجار" پر بھی اتر آتے تھے۔ یہ قضیہ روبراہ ہوا اور سرسید ہاؤس، متعلقہ اراضی اور مکان کی واگزاشت کے لیے مطلوبہ رقم خطیر (۱۶۲۴۸۲ روپے) یونیورسٹی نے سرکاری خزانے میں جمع کردی۔ قبضہ مل جائے تو اسکیم یہ ہے کہ سرسید کی عظیم شخصیت اور تاریخ آفریں خدمات کے شایانِ شان ایک یادگار تعمیر کی جائے۔ خدا وہ مبارک دن جلد لائے۔

لیکن اس وقت یونیورسٹی میں اتنی کس مپرس، شکستہ، ویران اور غلیظ جگہ کہیں نظر نہ آئے گی

یہ کھنڈر نہیں سلم (SLUM) ہے۔ کھنڈر ہوتی تو اس کی بڑائی کرتا۔ ویرانے ہم سب نے دیکھے ہیں یہ تاریخ کے بڑے خاموش پائندہ اور مستند دستاویز ہوتے ہیں۔ بقول اقبال ان میں عبرت عظمت اور دل آویزی ملتی ہے۔ کبھی کبھی یہ اپنی اصل سے زیادہ اہمیت حاصل کر لیتے ہیں سلم کی بڑائی کیسے بیان کی جائے جہاں نجاست، غلاظت، جہالت اپنا اپنا ڈیرہ ڈالے ہوں اور طرح طرح کے جرائم، زمائم اور بیماریوں کے امکانات پیدا ہوتے اور پنپتے ہوں۔

سرسید ہاؤس کے اسٹیج پر کیسی کیسی نیک نہاد اور نامور ہستیاں نمودار ہوئیں اور کیا کر گئیں، ان کے نام اور ان کے کارنامے کون سنائے۔ کب تک سنائے اور کہاں تک سنائے۔ یہاں سرسید اور ان کے رفقاء کرام نے اپنی جدوجہد، حسن خیال اور حسن عمل کے کیسے کیسے قطب مینار، لال قلعے، جامع مسجد، تاج محل سوچے اور بنائے جن کو ہم علی گڑھ تحریک، مسلم یونیورسٹی، اصلاح اخلاق و معاشرت اور جدید اردو میں دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں اور جنہیں ہم آج ہی نہیں ہمیشہ قوم اور ملک میں دور دور تک ارجمند سمجھے گئے اور سمجھے جائیں گے۔

صدر دروازے کے داہنی پہلو پر سپید سنگ مرمر کی لوح پر یہ عبارت کندہ ہے۔

This House was Occupied
by
Sir Syad Ahmad, Khan Bahadur LL.D., K.C.S.I.
Founder of
Mohammadan Anglo-oriental College

Born, 1817 Died 1898

جو ایسی شگفتہ اور شستہ نظر آتی ہے جیسے ابھی ابھی نصب یا تصنیف کی گئی ہو لیکن اس فضا میں یہ کتبہ اور لوح دونوں بڑی تکلیف دہ اور تمسخر انگیز معلوم ہوتی ہیں اور زندگی کے بے بود ہونے کا ایک ناقابل بیان احساس ہونے لگتا ہے۔ زندگی کتنی ہی آنی و فانی اور اس کے ناپائدار ہونے کا احساس کتنا ہی فطری کیوں نہ ہو، ان نیک و برگزیدہ ہستیوں کی خدمات کے مقابلے میں ان کی کوئی اہمیت نہیں جنھوں نے قوم کو سدھارنے سنوارنے اور سربلند کرنے

میں اپنی زندگی قربان کردی ہو۔

خاقانی نے خرابۂ مدائن کو دیکھ کر اپنا پورا قصیدہ اس ایک مصرعہ میں سمو دیا۔

ما بارگہِ دادیم این رفت ستم برما!

کاش یہی مصرعہ سرسید ہاؤس کے دروازے کے بائیں پہلو پر نقش کر دیا جاتا لیکن اس کی ایسی ضرورت بھی نہیں جب یہاں کا چپہ چپہ زبانِ حال سے پیہم یہ مصرعہ اٹھا رہا ہو۔ اس قصیدے اور اس مصرعے کے بقائے دوام میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے جب اس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہو جیسے اس نظم سے خاقانی نے دنیا کے ہر خرابے کا خواہ وہ ماضی کے آغوش میں ہو یا مستقبل کے بطن میں، اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے منادِ محافظ اور ماتم گسار بنا دیا ہو۔ شاعر کسی آبادی یا ویرانے میں اجنبی نہیں ہوتا اس کی ہر عمر ہر ویرانے اور آبادی سے زیادہ طویل پائدار اور لائقِ احترام ہوتی ہے۔

سرسید ہاؤس کی زبونی کا احساس شاید اس لیے اور بڑھ گیا ہے کہ حافظے میں ۱۹۱۹ء کا بھی سرسید ہاؤس ہے جس سے زیادہ آباد دلکش، پر وقار تاریخی یادوں اور کارناموں سے لبریز نادر طوفان آزمودہ سایہ دار درختوں اور ان سے ڈھکی ہوئی ستھری ہموار کشادہ سڑکوں اور راستوں سے مزین جگہ علی گڑھ میں دوسری کوئی نہ تھی۔

مولوی عبدالحق صاحب (بابائے اردو) نے سرسید کو ایک بڑے معرکے کے جلسے میں اسٹریچی ہال کے صدر دروازے سے داخل ہو کر ڈائس کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا جہاز چلا آ رہا ہو کتنی جامع اور شاندار تشبیہہ ہے سرسید ہر تحریک، ہر محفل اور ہر معرکے میں اسی طرح نمودار ہوتے اور چھا جاتے تھے۔

میں نے سرسید کو نہیں دیکھا۔ ان کی روغنی تصویر اسٹریچی ہال میں مدتوں دیکھتا رہا ہوں۔ کتابوں میں بھی جابجا عام طور پر نظر آ جاتی ہے۔ سرسید ہاؤس کے یہ کہن سال گمبھیر گھنیرے درخت، جن میں سے بعض پر اتنی ہی پرانی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں، دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتے جیسے کسی بوڑھے عرب سردار نے سر کو عقال سے اور کمر کو چادر سے کس رکھا ہو مختلف زاویوں، دھوپ چھاؤں اور ہوا کے تند یا نرم جھونکوں میں یہ درخت ایسے معلوم ہوتے جیسے

سرسید مختلف موڑ میں جہاں تہاں کارفرما ہوں۔ بڑے رنج اور شرم کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ایک زمانے میں جلانے کی لکڑی کے دام بڑھے تو سرسید ہی کے نام لیواؤں نے ان تمام درختوں کو کٹوا کر روپے کما لیے!

اُس زمانے میں اچھے اچھوں کی مشکل سے ہمت پڑتی تھی کہ سرسید ہاؤس کے حدود سے سانس روکے یا اِدھر اُدھر دیکھے اور ہچکچائے بغیر گذر جائیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود سرسید اور ان کے رفقائے کرام کے عہد میں اس خطّے کا کیا عالم رہا ہوگا۔ آواز دیتا ہوں،

کہاں بیٹھے ہو تم اے خانۂ ویراں کے دربانو

تو کوئی جواب نہیں ملتا۔

میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مجلسِ اتحاد کا قیام علی گڑھ یونین کی تقلید میں ہوا۔ بالفرض ایسا نہ بھی ہو تو یہ ماننا پڑے گا کہ ابتدا سے یونین کو جو اہمیت یہاں دی گئی اور اس نے یہاں کے طلبا میں جو اعلیٰ صفات پیدا کیں وہ کسی اور ادارے کی یونین کے حصّے میں نہیں آئیں۔ یہاں کی اور دوسرے اداروں کی مجلسِ اتحاد میں ایک فرق یہ بھی ہے، گو یہ فرق روز بروز کم ہوتا جارہا ہے کہ وہاں ان کو ایسے مقاصد کے لیے کام میں لایا گیا جن کا تعلّق علمی، تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیوں سے اتنا اساسی نہ تھا جتنا ثانوی۔ یہاں ہمیشہ اساسی رہا ضمنی شاذ و نادر۔ باہر کی تقریباً تمام یونینیں سیاسی لیڈروں کے چشم و ابرو کے اشارے پر چلتی ہیں اور طلبا کی حیثیت ایجنٹ اور آلۂ کار کی رہ گئی ہے۔ علی گڑھ کے طلبا اور ان کی یونین کسی سیاسی یا بیرونی جماعت کی آلۂ کار نہیں ہے۔ طلبا اپنے اختلافات اپنے ہی طور پر بغیر کسی بیرونی مداخلت کے طے کر لیا کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑا فرق اور امتیاز یہاں اور باہر کے طلبا، اور ان کی مجلسِ اتحاد (یونین کلب) میں ہے جسے میں یہاں کے طلبا کی ذہنی بلوغت اور اس ادارے کے بہترین مقاصد سے ان کی شفقت کی دلیل سمجھتا ہوں یہی سبب ہے کہ علی گڑھ کا طالب علم بحیثیت مجموعی دوسرے اداروں کے طلبا سے آج بھی زیادہ معتبر و ممتاز ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ اس امر کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں خام و نامعتبر جنس کے بے روک ٹوک راہ پاتے رہنے سے اور بعض مصالح کی بنا پر ان عوامل و عناصر کو یونیورسٹی کا انگیز کرنے پر مجبور ہونا ایسی باتیں ہیں جن سے اس ادارے کی نیک نامی، کارکردگی اور اس کی تاریخی امتیازی روایات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ باتیں دوسری یونیورسٹیوں میں راہ پا جائیں تو ان کی شہرت میں ایسا کوئی خلل نہ پڑے گا اس لیے کہ ان کا کبھی وہ حال نہیں رہا جو اس ادارے کا روزِ اوّل سے رہا ہے، جس کی بنا پر یہ بعض مسلمہ اعلیٰ تاریخی و تہذیبی اقدار کا محافظ اور مبلغ رہا ہے۔ یہ ایک دلچسپ سانحہ ہے کہ ہماری خدمات اور خوبیوں سے دوسرے فائدہ اٹھائیں تو یہ ان کا آئینی حق قرار پائے اور ہم ایسا کریں تو گنہ گار ٹھہریں۔

تمام دنیا کی اقوام اور ممالک کا اعتبار بالعموم اور مسلمان قوم اور ممالک کی خوشنودی

لہ مسلمان حکومتیں کہاں کہاں ہیں اور ان کی آبادی کیا ہے:

۱. مراکش: بانوے لاکھ چالیس ہزار (۹۲ فی صدی مسلمان)

۲. الجیریا: پچانوے لاکھ (۸۹ فی صدی مسلمان)

۳. مصر: دو کروڑ پچیس لاکھ (۹۱ فی صدی مسلمان)

۴. سوڈان: نواسی لاکھ اکہتر ہزار (۸۴ فی صدی مسلمان)

۵. یمن: اڑتالیس لاکھ (۹۸ فی صدی مسلمان)

۶. شرقِ اردن: پندرہ لاکھ (۹۳ فی صدی مسلمان)

۷. سعودی عربیہ: ساٹھ لاکھ (۹۹ فی صدی مسلمان)

۸. انڈونیشیا: سات کروڑ اسی لاکھ (۹۴ فی صدی مسلمان)

۹. لبنان: چودہ لاکھ (۴۰ فی صدی مسلمان)

۱۰. ترکی: دو کروڑ ایک لاکھ (۹۰ فی صدی مسلمان)

۱۱. شام: چھتیس لاکھ (۸۶ فی صدی مسلمان) (باقی اگلے صفحے پر)

ذخیرہ اندوزی بالخصوص "آسان و ارزاں" حاصل کرنے کا زرِ مبادلہ یا امریکی ڈالر (علی گڑھ) ہمارے ملک کے سوا شاید ہی کسی اور ملک و قوم کو نصیب ہو لیکن اس سے جتنا نفع اٹھایا جاتا ہے اس تناسب سے نفع میں ہم کو شریک نہیں کیا جاتا۔ محنت کرنے والے اور نفع اٹھانے والے میں مرحمت نہیں تو منصفی کا رشتہ تو ہونا ہی چاہیے۔ ممکن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ہم جس صاف دلی سے اظہارِ وفا کرتے ہوں اس جرأت سے اظہارِ حق پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔ انگریزوں کی حکومت میں ایسا کرنا سمجھ میں آتا تھا، اپنے عہد میں حق طلبی یا حق تلفی کے معاملہ میں تکلف سے کام لینا نہ اپنے کو زیب دیتا ہے نہ اس سے حکومت کی بڑائی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔

سیاسی اعیان و اکابر نوجوان طلباء کی بے راہ روی کا ماتم تو ہمہ وقت اور ہر موقع

(بقیہ نوٹ)

۱۲۔ عراق: اڑتالیس لاکھ بیس ہزار (۹۶ فی صدی مسلمان)

۱۳۔ ایران: دو کروڑ (۹۰ فی صدی مسلمان)

۱۴۔ افغانستان: ایک کروڑ چالیس لاکھ (۹۸ فی صدی مسلمان)

۱۵۔ پاکستان: سات کروڑ اٹھاون لاکھ پچاس ہزار (۸۶ فی صدی مسلمان)

۱۶۔ ملایا: اٹھاون لاکھ (۶۰ فی صدی مسلمان)

مسلمانوں کی یہ تعداد مسلم حکومتوں میں ہے۔ ان میں ان مسلمانوں کو شمار نہیں کیا گیا ہے جو کسی اور حیثیت سے دوسرے خطوں میں آباد ہیں مثلاً ہندوستان، اشتراکی چین، اشتراکی روس وغیرہ۔ ان کو بھی شامل کر لیا جائے تو مجموعی تعداد بقدر پانسات کروڑ اور بڑھ جائے گی۔ اس طور پر کرۂ ارض کے تقریباً ۱/۴ حصے پر مسلمان آباد ملیں گے اور مراکش سے لے کر "تا بہ خاک کاشغر" ایک ایسا مسلم بلاک نظر آئے گا جو بجا طور پر "براعظم اندرونِ براعظم" کہا جاتا ہے۔ محولہ بالا شمار و اعداد رائٹرس ایمپوریم بمبئی کے ایک مطبوعہ کارڈ سے لیے گئے ہیں۔

پرکرتے رہتے ہیں لیکن ان عوامل کو جو اس بے راہ روی کا باعث ہوتے ہیں، روکنے اور قابو میں رکھنے کے بجائے مہمیز بھی کرتے رہتے ہیں اور یقیناً یہ نوجوانوں کے بہترین مقاصد کے پیشِ نظر اتنا نہیں ہوتا جتنا ان اکابر کے مشکوک مقاصد کی خاطر۔ کم سے کم مجھے اس کا علم نہیں ہے کہ نوجوان طلبہ وطالبات کو زندگی کے تمام بھلے یا بُرے تقاضوں سے آشنا کرانے کی قابلِ فخر ذمہ داری تعلیم گاہوں پر عائد ہوتی ہے۔

اس ادارے کو حکومت سے کتنی ہی زیادہ مالی مدد کیوں نہ ملتی ہو اور اس سبب سے وہ حکومت کی کیسی ہی گرفت میں کیوں نہ ہو، مسلم یونیورسٹی ہونے کی بنا پر دینی اور اخلاقی امور میں وہ مسلمان قوم کے مطالبے اور محاسبے سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اور مسلمانوں کے دینی اور اخلاقی امور وہ ہیں جو ان کی مستند دینی کتابوں اور معتبر مسلمانوں کی سیرت وسوانح میں ملتے ہیں، وہ نہیں ہیں جن کو ہم اپنے مخصوص مفاد ومقاصد کے پیشِ نظر حسبِ ضرورت اختراع کرتے رہتے ہیں۔ مسلمان معاشرے میں کچھ ممنوعات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ ہوں یا سیاسیات، سماجیات یا حیوانیات کے تقاضے اور طور طریقے، تاوقتیکہ سخت مجبوری کا سامنا نہ ہو، کوئی ایسا اقدام گوارا نہیں کیا جا سکتا جو ایسی ترغیبات کا محرک ہو جن کو ہمارے مذہب واخلاق نے مسلّمہ طور پر قابلِ اجتناب قرار دیا ہو۔ ممنوع کو مستحب نہ منطق سے قرار دیا جا سکتا ہے نہ جمالیات اور اقتصادیات کے نکات بیدل سے۔

نوجوان نہ سو فی صدی معصوم ہوتے ہیں نہ ان کو معصوم رکھا جا سکتا ہے۔ انھیں پر نہیں یہ بات ان کے بہت سے بزرگوں پر بھی صادق آتی ہے۔ میں یونیورسٹی کے طالب علموں کو نہ بھکشو دیکھنا چاہتا ہوں نہ رکھنا چاہتا ہوں۔ رکھا بھی نہیں جا سکتا۔ میں خود بھکشو نہیں رہا ہوں، نہ آج ہوں۔ بھکشو قسم کے طالب علم اور تعلیم گاہیں ختم ہو چکی ہیں۔ ان کی بازیافت نہ ممکن نہ مقصود۔ بایں ہمہ اس کا بھی قائل نہیں کہ ہماری یونیورسٹی کے طلبا، وہی شیوہ اختیار کریں جو آج کل کی پولٹیکل پارٹیوں کے زیرِ اثر نوجوان لڑکے لڑکیوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ کیسے مان لوں کہ ہمارے نوجوانوں میں اتنی استعداد پیدا نہیں ہوئی یا باقی نہیں رہی کہ وہ اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان فرق کر سکتے ہوں

یا اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں۔ محکومی میں غلامی کو بدنصیبی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں لیکن آزادی میں مطلق العنانی تو لعنتِ محض ہے۔

خدا کرے یہ صورتِ حال بدل جائے ورنہ ظاہر ہے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین اس کے عہدہ داروں، امیدواروں اور رائے دینے والوں کے بارے میں ہمارے بدخواہ کیسی کیسی نامبارک توقعات قائم کریں گے اور خوش ہوں گے، مانا کہ یہیں نہیں سارے جہان میں (جن میں بلادِ اسلامیہ بھی شامل ہیں) ایسا ہو رہا ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وباؤں کا عالم گیر ہو جانا وباؤں کے لیے کوئی سندِ جواز نہیں۔ اس سے حفظانِ صحت کی تدابیر ترک نہیں کر دی جاتیں بلکہ ان کو اور زیادہ عالمگیر، موثر اور طاقت ور بناتے ہیں۔ یہ بھی نہ سہی۔ ہمارا ایک علمی تہذیبی اور قومی ادارہ ہے جس نے ہم کو اور ہمارے ملک کو فائدہ پہنچایا اور ناموری بخشی ہے اس لیے ہم اس کے تاریخی رول کو نہ صرف برقرار رکھنا چاہتے ہیں بلکہ اور زیادہ ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ریگستان میں نخلستان یا سمندر میں جزیرے کی قدر و قیمت سے کسی اور کو انکار ہو تو ہو ہم کو نہیں ہے۔

زمانہ کتنا ہی ترقی یا تنزل کرے۔ زندگی کے نظریات جو چاہے جس طرح چاہے بدل ڈالے مسلمانوں کا یہ موقف غیر متبدل اور غیر متزلزل رہے گا کہ ان کا دین، آئین اور معاشرہ عیش و طرب کا نہیں، ضبطِ نفس اور رفاہ و ریاضت بالفاظِ دیگر فوجی ڈسپلن کا ہے۔ ظاہر ہے جس ملت نے اس ڈسپلن کے ساتھ نوعِ انسان کے فوز و فلاح کی اتنی بڑی ذمہ داری قبول کی ہو وہ طرب و تفنن کی زندگی نہ بسر کر سکتی ہے، نہ کرنا چاہیے۔ فنونِ لطیفہ اور اس کے عوارض و عواقب کو اگر اسلامی شریعت نے زندگی میں وہ اہمیت یا وقعت نہیں دی ہے جو آج کی دنیا دے رہی ہے تو نہ شرمانے کی ہی ضرورت ہے نہ معذرت خواہ ہونے کی۔ مسلمان جن وظائف مہمہ اور عزائمِ حسنہ کے تقاضوں میں جکڑا ہوا ہے وہاں۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے، ذوقِ نظارۂ جمال کہاں!

مشینی و صنعتی تہذیب کے محرکات اور حربی سیاست کے سرد و گرم تقاضوں نے دنیا کی تمام ترقی یافتہ اقوام اور ممالک کو جس معاشی و اجتماعی بحران اور اخلاقی شکست و ریخت

میں مبتلا کر دیا ہے وہ کوئی راز نہیں ہے اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ جو ملک اور قوم کبھی انسانی واخلاقی مکارم کے اعتبار سے اونچی سطح پر تھی وہ موجودہ حالات وحوادث کی زد میں نسبتاً زیادہ نیچی سطح پر آگئی ہے۔ مسلمان اور ممالکِ اسلامیہ اس کی مثال ہیں۔ ممکن ہے اس کا احساس اس لیے زیادہ ہوتا ہو کہ مسلمانوں کا صحیفۂ مذہب واخلاق دوسروں کے صحیفۂ مذہب واخلاق سے زیادہ ہمہ گیر ہی نہیں سخت گیر بھی ہے۔ یہ کوئی ایسا نکتہ نہیں ہے جس کا میں نے آج انکشاف یا اعلان کیا ہو۔ لیکن اتنا ضرور محسوس کرتا ہوں کہ جہاں تک مذہبی اور اخلاقی اعتبار سے مسلمان ہونے کا تعلق ہے، ہندوستان کے مسلمان ممالکِ اسلامیہ کے مسلمانوں سے زیادہ معتبر اور قابلِ تقلید ہیں، نہ کہ اس کا عکس۔ اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ بحیثیتِ مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے معتبر نمائندگی علی گڑھ کرتا ہے۔ کچھ اور نہیں تو اس شعر کی منطق کی رو سے۔

نمی گویم دریں گلشن گل و باغ و بہار از من
بہار از یار و باغ از یار و گل از یار و یار از من

اس میں شک نہیں پہلی اور آج کی دنیا میں بڑا فرق راہ پا گیا ہے۔ کہنے جا رہا تھا "زمین و آسمان کا فرق"، لیکن جب سے یہ دیکھا ہے کہ زمین و آسمان کا فرق یا فاصلہ مسافت کے اعتبار سے روز بروز کم ہونے لگا۔ اس محاورے کو استعمال کرنے میں تامل کرتا ہوں۔ اب تک اردو فارسی شاعروں کا عقیدہ رہا ہے کہ بلاؤں کا نزول آسمان سے ہوتا ہے لیکن کچھ دنوں سے آسمان کو یہ ماتم کرتے سنا گیا ہے کہ زمین کی بلائیں اس پر نازل ہونے لگی ہیں اس "فلکِ ستم شعار دیر رفتار" کو اپنے مظالم کا مزا اس وقت آئے گا جب ہم خود اس پر نازل ہونے لگیں گے۔[1]

اب تک اور یہاں تک جو داستان سنائی گئی ہے اس سے یہ ظاہر یا ثابت کرنا مقصو

---

[1] یہ سطور پریس میں تھیں کہ خبر آئی کہ یہ معرکہ سر ہو گیا۔ مشرق کے شاعر نے جس کارنامے کی پیشین گوئی آج سے مدتوں پہلے کر دی تھی کہ "عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں" روس کے سائنسٹسٹ نے آج پوری کر دکھائی۔

نہیں ہے کہ یونین اور یونیورسٹی کا ماضی اتنا مبارک وہتم بالشان رہا ہے کہ آئندہ ان کو ایسے دن دیکھنا نصیب نہ ہوں گے۔ دنیا میں اگر اپنے گزشتہ سے بہتر بننے کی استعداد نہ ہوتی تو یہ پورا کارخانہ کب کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ جب تک انسان اس عالم آب و گل میں آباد ہے بحیثیت مجموعی زندگی ترقی اور بہتری کی طرف بڑھتی رہے گی۔ یہ محض بوڑھوں کی فطرت ہے جو اپنے ماضی کو مبارک اور نوجوانوں کے حال اور مستقبل کو مایوس کن بتا کر اپنے دل بہلاتے رہتے ہیں۔

گزشتہ زندگی اور زمانہ دونوں اس کرہ ارض پر ختم ہو چکے ہیں جن کو اب کسی طرح واپس نہیں لایا جا سکتا چاہے یہ دنیا ترقی کرے یا تباہ ہو جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ دنیا نہ تباہ ہوگی نہ ترقی کرنے سے باز آئے گی۔ ہم اپنی حرکتوں سے باز آئیں یا نہیں۔ پھر یہ بات بھی بھلانے کی نہیں ہے کہ اگر جتنے دن اچھے تھے تو ان سے پہلے کے دن اور اچھے تھے اس طرح گزرے ہوئے زمانے میں جتنا سفر کرتے جائیں ابتدائے عہد تہذیب و تمدن تک جب "دستِ مشاطہ نہ تھا محرمِ زلفِ دوراں" ایک سے ایک خیالی خوش گوار منزلیں سامنے آتی رہیں گی بوڑھوں کے لیے خاص طور پر۔

بوڑھوں کا حال ہی کون سا امید افزا ہوتا ہے کہ وہ مستقبل سے بھی کچھ امید رکھیں جہاں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی طویل قطار بندی (کیو) میں کیوں نہ کھڑے رہیں۔ یہ دنیا جس طرح صرف بوڑھوں سے آباد نہیں رکھی جا سکتی اسی طرح بوڑھوں کے خیالات و عقائد سے بھی زیادہ دنوں تک اس کا کام نہیں چل سکتا اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ نوجوانوں کو سہنا تو پڑے اپنی دنیا لیکن رہنا پڑے بوڑھوں کی دنیا میں۔ بوڑھوں نے اپنی جوانی میں بوڑھا رہنا نہیں پسند کیا تو نوجوانوں سے کیوں ایسی توقع رکھتے ہیں۔ بوڑھے ہی جو ٹھہرے۔

آج کل زمانہ جس بے امان تیزی سے گزر نہیں بلکہ منقلب ہو رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ ساٹھ سال کا زمانہ کئی سو سال پیچھے کا زمانہ بن چکا ہے اور تیزی و ترقی کی رفتار کا یہی عالم رہا تو آئندہ ساٹھ سال کی دنیا موجودہ دنیا سے ہزار سال آگے کی دنیا معلوم ہونے لگے تو کوئی تعجب نہیں۔ اب تک ہوتا یہ آ رہا تھا کہ نیا آدم نئی دنیا پیدا

کرتا تھا اور بجا طور پر اس پر اپنا حکم چلاتا تھا اب بھی یہی ہوتا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ آج کا آدم اپنی بنائی ہوئی دنیا کو دیر تک قابو میں نہیں رکھ پاتا۔ ظاہر ہے نئے آدم کے بغیر نئی دنیا چل نہیں سکتی اس لیے کبھی کبھی وہ نئے آدم کے ظہور کا انتظار کرنے کے بجائے اپنا نیا آدم خود بنا لیتی ہے۔ یہ آدم زائیدۂ آدم نہیں ہوتا بلکہ زائیدۂ زمن یا اہرمن ہوتا ہے اس لیے بڑا سفاک ہوتا ہے اور زندگی اس کی لائی ہوئی تیرگی اور تباہی کی زد میں آجاتی ہے۔ ایک وقت تک انسانیت اس عذاب و آزمائش میں مبتلا رہتی ہے اس کے بعد رحمتِ حق سے کوئی رحمتِ عالم ظہور میں آتا ہے، مایوس و مجروح انسانیت کو تشفی دیتا ہے اور ترقی کی طرف لے جاتا ہے غالب نے اسی صورتِ حال کی ترجمانی کی ہے ؎

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمت اللعالمینے ہم بود!

لیکن نوجوانوں کا یہ زعم کہ وہ "سوارِ اشہبِ دوراں" ہیں اور دوسرے یعنی بوڑھے اور کم نوجوان صرف گردِ راہ، ایک ایسا مغالطہ ہے جس میں بعض امراض کی طرح بچے اور نوجوان ہی زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ زمانہ جس تیز رفتاری سے جوان اور جوان تر ہونے لگا ہے اس رفتار سے خود نئی نسل ذہنی طور پر جوان نہیں رہ پاتی۔ نتیجہ یہ کہ نوجوان ہی نہیں ان سے کم عمر لڑکے بھی بہت جلد بوڑھے (آؤٹ آف ڈیٹ) ہونے لگے ہیں۔ بوڑھوں کا تو ذکر ہی کیا نوجوان سے زیادہ نوجوان بھی اس وقت 'اشہبِ دوراں' پر نہیں صرف غالب کے "رخشِ عمر" کی پشت پر ہیں جہاں "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں" بوڑھے ایک حد تک بہترین پوزیشن میں ہیں اس لیے کہ انھوں نے اپنے سہارے کے لیے بچی کھچی نیم جان قدریں سینے سے لگا رکھی ہیں اور اقدارِ اعلیٰ کا احساس اور ان کی پیروی ہی وہ سہارا ہے جو انسان کا اس وقت خاص طور پر ساتھ دیتا ہے جب تمام دوسرے سہارے ساتھ چھوڑ چکے ہوتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ اعلیٰ قدریں کہاں سے آئیں کس نے دیں مطلق ہیں یا اضافی اور ان کی سائنسی یا تاریخی توجیہہ ہو سکتی ہے یا نہیں "بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی" کا انداز زندگی کے انجھن لمحات میں ہوتا ہے۔

یونین کی اہمیت اور اس کی اصلاح و ارتفاع پر اس لیے زور دینا چاہتا ہوں کہ علی گڑھ

کی نئی نسلیں یہاں جن گہواروں میں پلتی اسنورتی ہیں ان میں یونین کا درجہ بہت ممتاز ہے یہاں نوجوانوں کو دوسروں پر نہیں خود اپنے پر حکمرانی کرنے کی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے. یعنی کس طرح وہ اپنے کو قابو میں رکھ کر دوسروں پر قابو حاصل کر سکتے ہیں. ذرا سی غفلت یا عجلت سے کس طرح فتح شکست میں تبدیل ہو جاتی ہے اور تھوڑے سے تدبّر و تحمّل سے شکست فتح پر بھاری پڑتی ہے. یہیں سے نکل کر تو وہ جہل کو علم میں، دشمنی کو دوستی میں افلاس کو آسودگی میں، سرنگونی کو سربلندی میں بدلیں گے اور خدمت لینے کے بجائے خدمت کرنے کی لذّت و منزلت حاصل کریں گے. یہ مولویانہ باتیں اس لیے کہنی پڑیں کہ طلباء نے، یہاں کے ہوں یا کہیں اور کے، یونین کی وقعت اور اہمیت کا احترام کر کے بڑا نقصان اٹھایا اور پہنچایا ہے.

طلبا کو سر سید اپنی سب سے بڑی متاع، قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ اور تاریخ کا بڑا گراں قدر ورثہ سمجھتے تھے. ان کی سود و بہبود کے لیے ہر طرح کا خطرہ ہر قسم کی بدنامی اور ہر نوع کی تکلیف کا سامنا کرنے پر تیار رہتے اور اٹھایا کرتے تھے. اس کا صحیح اندازہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ آج کل کے لیڈر طلبہ کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور سر سیّد کی قد و قامت کا کوئی بھی ایسا شخص گزرا ہے جس نے ان نوجوانوں کو صحیح راستہ پر رکھنے کے لیے اپنے آپ کو خطرہ یا مصیبت میں ڈالا اور اس فریضہ کو اپنی زندگی کا مشن بنایا ہو. لیکن یہاں میں اس حقیقت کو بھولتا ہوں کہ غدر اور مابعد کے مظالم و مصائب سر سیّد اور ان کی قوم سے زیادہ اور کس کو جھیلنے پڑے کہ وہ ایسا کرتا. آج طلبہ لیڈروں کے نہیں خود لیڈر طلبہ کے دست نگر ہیں. اس کی داد کس کو دی جائے طلبہ کو یا لیڈروں کو؟

اس سلسلے میں اس "برادر ہڈ" (انجمن الاخوان) کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو ۱۸۹۲ء میں قائم کی گئی تھی اور اب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے نام سے موسوم ہے. اس کا مقصد نئے پرانے طلبہ میں رشتۂ اخوت قائم کرنا اور رکھنا تھا. اس کے ارکین اپنی آمدنی کا ایک فی صدی کالج فنڈ میں دیا کرتے تھے. ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الفرض) اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی اسی طرح کے دو بڑے اہم ادارے سر سیّد ہی کے عہد سے قائم چلے آتے ہیں. ایک زمانہ تک ان تینوں نے اس ادارے کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں اور اس کی شہرت میں اضافہ

کیا تقسیم ملک کے بعد سے ان کی کارکردگی اور اہمیت میں روز بروز کمی ہوتی گئی۔ اب برائے نام رہ گئی ہے معلوم نہیں ان کی ضروریات باقی نہیں رہیں یا ان کو فعال بنانے کا حوصلہ ہی جاتا رہا۔

برادر ہڈ سے سر سید کو کتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مراسلت سے کیا جاسکتا ہے۔ جو مجلس کے سکریٹری مسٹر تھیوڈور ماریسن سے ہوئی تھی۔ سر سید نے مسٹر ماریسن کو لکھا:

جنابِ من! اگر آپ کے کالج کے پرنسپل یا اسکول کے ہیڈ ماسٹر مجھے کالج یا برادر ہڈ میں داخل کرلیں تو میں اپنی پنشن میں سے ایک فی صدی دوں گا۔ میں آپ کی سوسائٹی میں اجنبی بن کر داخل ہونا نہیں چاہتا جیسا کہ آپ کے کالج میگزین کے آرٹیکل میں مذکور تھا۔ یعنی اس انجمن میں شرکت کا استحقاق حسبِ ذیل اشخاص کو ہوگا۔

(الف) موجودہ طالب علم مدرسۃ العلوم (ب) مدرسۃ العلوم کے کالج یا اسکول کے پرانے طلبا (ج) مدرسۃ العلوم کے اسکول یا کالج کے استاد۔ کیونکہ میں ایسا بے وقوف نہیں ہوں کہ ایک فی صدی تو دیتا رہوں اور برادری سے (یعنی اسٹوڈنٹ برادر ہڈ) سے خارج رہوں۔ میرا خط برادر ہڈ کے جلسے میں پیش کریں اور جواب سے مطلع فرمائیں۔

آپ کا خیر خواہ سید احمد

۸ جون ۱۸۹۲ء

جواب یہ آیا:

بخدمت آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ال ال ڈی آنریبل قبلہ۔

آپ کے برادر ہڈ میں داخل ہونے کی خواہش سے ہم کو نہایت خوشی اور شکر گزاری ہوئی۔ آپ کے کالج یا اسکول کے طالب علم ہونے کے متعلق ہیڈ ماسٹر صاحب اور پرنسپل صاحب سے دریافت کرنے پر نہایت دلچسپ بحث پیدا ہوگئی۔ پرنسپل صاحب فرماتے ہیں" آنریبل سر سید یقیناً طالب علم ہیں کیونکہ تمام عالم کے آدمی حقیقت میں طالب علم ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ ان معنوں میں۔۔ ایم اے او کالج کے نہایت لائق طالب علم ہیں اور کوئی کالج کا پروفیسر

اس نام کا ان سے زیادہ مستحق نہیں ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب پرنسپل صاحب کے دعوی کی تردید کرتے ہیں اور آپ کو نہایت زبردست دلائل سے اسکول میں شامل کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "پرنسپل صاحب کا بیان ہے کہ سر سیدؔ اس کالج کے طالب علم ہیں۔ یہاں تک کہ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن چونکہ سر سیدؔ نے ابھی تک اس خوفناک دریا کو عبور نہیں کیا جسے انٹرنس اگزامینیشن کہتے ہیں، اس سے صاف ظاہر کہ وہ کسی کالج میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسکول کے طالب علم بنیں۔"

ہم جناب پرنسپل اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے نہایت مشکور ہیں کہ انھوں نے برادرہُڈ کے فائدے کی غرض سے آپ کو طالب علم بنالیا ہے۔ یعنی پرنسپل صاحب نے آپ کی اعلیٰ علمیت کے ذریعہ سے اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے خوفناک دریا کے زور سے۔ لیکن ہمارے خیال میں ان پیچیدہ دسائل کی ضرورت نہیں جبکہ ہم ایک قریب اسکول کی کسی کلاس کا طالب علم تسلیم کریں تو میں آپ کے ایم۔ اے۔ او کالج اسٹوڈنٹس کے رشتے سے اب تک پہنچ سکتے ہیں ہم ایسے بے وقوف نہیں کہ بے باپ کے برادرہُڈ قائم کرلیں جب ہم نے برادرہُڈ قائم کی یا یوں کہیں کہ اپنا برادرہُڈ قائم کیا یا یوں کہیں کہ اپنی برادرہُڈ ہمیں سمجھ پڑی اس وقت ہم اپنے والا قدر باپ سے بے خبر نہ تھے۔ اس لیے اگر بھائیوں کی سوسائٹی میں اگر باپ داخل ہو سکتا ہے تو آپ کو برادری سے خارج ہونے کا اندیشہ نہ کرنا چاہیے ...

آپ کے بقائے حیات کے دعا گو

آپ کے خاکسار بچے۔ ممبر آف دی برادرہُڈ

سر سیدؔ کا جواب

بجناب آنریری سکریٹری مجلس الاخوان مدرستہ العلوم

ڈیر سر۔ آپ کی چٹھی معہ ریمارکس پرنسپل و ہورسٹ صاحب میرے پاس پہنچی۔ میں مسٹر بک اور ہورسٹ اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں ان ریمارکس کی نسبت جو آپ نے لکھے ہیں لیکن جو اصل بات لکھی ہے وہ مسٹر ہورسٹ نے لکھی ہے اپنی چٹھی کے آخری فقرے میں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنی نہایت عزت سمجھوں گا اگر آپ مسٹر - - -

ہورسٹ سے سفارش کرکے میرا نام اسکول کی نویں کلاس میں داخل کرادیں اور میں آپ کی مجلس لااخوان میں شریک ہوں گا۔

صرف مسٹر ہورسٹ کی اتنی مہربانی چاہتا ہوں کہ حاضری سے مجھ کو معاف رکھیں مگر میں برابر اس کلاس کی ٹیوشن فیس دیتا رہوں گا اور میں دو روپے اس کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ ایک روپیہ فیس داخلہ اور ایک روپیہ جون کی ٹیوشن فیس۔ اگر ہورسٹ صاحب اس کو منظور کرلیں تو آپ میرا نام بھی مجلس الاخوان میں داخل کرلیجیے۔ کاغذات جو آپ نے بھیجے تھے وہ واپس کرتا ہوں۔

آپ کا خادم سید احمد از علی گڑھ

۱۱ جون ۱۸۹۲ء

آنریری سکریٹری کا جواب:

بخدمت آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ ال ال ڈی۔

ڈیر سر!

جس عمدہ طریقہ سے آپ نے پرنسپل صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے درمیان فیصلہ کیا ہے اس کا شکریہ ادا کرنے میں آپ کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اخوان فیس داخلہ اور فیس تعلیم ہیڈ ماسٹر صاحب کو دے دیں جو آپ نے بھیجی ہے تو ممکن ہے آپ کو بہت دقت پیش آئے اگر ہیڈ ماسٹر صاحب آپ کی حاضری پر اصرار کریں۔ آپ کو اس تکلیف سے بچانے کے لیے میں نے اس روپے کو سوسائٹی کے خزانے میں داخل کردیا ہے۔ جب آپ نویں جماعت میں حاضر ہوا کریں گے تو وہ روپیہ میں خوشی سے واپس دوں گا۔ اخوان ایک فی صدی اپنی آمدنی میں پہلی جولائی سے دیں گے۔ اور سال میں دو بار روپیہ جمع کریں گے۔ اس لیے اوّل ادائیگی پہلی جولائی سے ہوگی۔

آپ کا خادم۔ تھیوڈر ماریسن

سکریٹری مجلس الاخوان مدرسۃ العلوم

حال میں ایک بحث اُٹھ کھڑی ہوئی تھی کہ علی گڑھ کیا ہے۔ کیوں ہے اور کس رُخ پر ہے۔ تفصیل میں اس وقت کون جائے۔ فی الحال ناظرین کی توجہ ان عربی اشعار کی طرف مائل کی جاتی ہے

جو یونیورسٹی کے صدر دروازہ (وکٹوریہ گیٹ) پر نقش ہیں ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"قوم کے بزرگوں اور عزیزوں نے جو غفلت کے اندھیرے کے لیے مثل چراغوں کے ہیں، ایک عالیشان مکان بنایا ہے جس کی بنیاد تقویٰ الٰہی پر ہے تاکہ اس میں علوم دینی اور دنیوی سکھائے جائیں اور عالم کے اخلاق مہذب اور شائستہ بنائے جائیں۔ ان لوگوں نے اللہ کی راہ میں کماحقہٗ کوشش کی ہے اور اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالےٰ ان کو اس نیک کوشش کی جزا دے اور اجرِ عظیم عطا کرے"